شریمان

مہادیو گوبند راناڈے

اور

اُن کا کام

مرتّبہ

مادھو رام بی-اے

وکیل انبالہ

سنہ ۱۹۰۹ء

ایف بی رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں چھپا

باہتمام سید حسین شاہ پرنٹر

تعداد جلد ... ایک ہزار قیمت ۱۲/

بار دوم

M. G. Ranade.

चित्रशाळा प्रेस, पुणें.

...رک دوست

...دھر وکیل انبالہ

میں

اس چھوٹی سی کتاب

کو

اپنے فراخ دل - مہربان اور بزرگ دوست

رائے صاحب لالہ مُرلی دھر وکیل انبالہ

کی

خدمت میں بڑے ادب سے پیش کرتا ہوں

مادھو رام

فہرستِ مضامین

دیباچہ

پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر کی سوانح عمری پبلک کی خدمت میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ جو قدردانی اُس کتاب کی ہوئی وہ حوصلہ بڑھانیوالی ہے۔ اب پنجاب اور صوبہ آگرہ و اودھ میں ہزاروں نوجوان اُس مہاپُرش کے کارناموں سے واقف ہیں اور اپنی زندگی کے لئے اُن سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ مگر ودیا ساگر کی مثال پر عمل کرنا معمولی آدمیوں کے لئے ذرا مشکل ہے۔ انہوں نے جو کچھ کیا اپنے زور بازو سے کیا۔ وہ لوگوں کی بزدلی اور تنگدلی سے تنگ آئے ہوئے تھے۔ بہت سے شخص اُن کو مدد کا وعدہ دیتے تھے۔ مگر جب کام کرنے کا وقت آتا تھا تو پیچھے رہ جاتے تھے۔ ودیا ساگر کو ان باتوں سے سخت مایوسی ہوئی مگر وہ دوسروں کی مدد پر بھروسہ کم کرتے تھے اور اپنے نیک ارادوں کی کامیابی کے لئے اپنے مال و دولت کو دل کھول کر خرچ کرتے تھے۔ ان کو اس بات کی پرواہ نہ تھی کہ اس فیاضی سے اُن کی مالی حالت پر کیا

اثر ہوگا۔ لوگوں نے ان کی مدد کی مگر بہت تھوڑی + تعلیم۔ بدھوا بواہ اور
خیرات کے کام کا بہت سا خرچ ودیا ساگر کی جیب خاص سے ہوتا تھا
اور پرماتما نے ان کو توفیق دی تھی کہ وہ اس خرچ کو برداشت کرسکیں۔ دوسرے
لوگوں کی بے پرواہی اور بے ہمتی کی وجہ سے ودیا ساگر کے دل میں سبھاؤں
اور کمیٹیوں کی وقعت کم ہوگئی تھی۔ کسی منصوبے کی کامیابی کے لئے وہ
ضروری نہ سمجھتے تھے کہ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کریں۔ ان کی فیاضی انکی
ہمت اور بے خوفی ایسی غیر معمولی تھی کہ لوگ ان کو نہایت ادب سے دیکھتے
تھے۔ مگر کسی کا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ ان کے ساتھ مل کر کام کرے۔ ساتھ ہی
بزدلوں اور ننگ دلوں کو وہ ایسی کڑی باتیں سناتے تھے کہ شرم کے مارے
ان کی گردن نیچی ہو جاتی تھی۔ ودیا ساگر درحقیقت ایک (man of action)
تھے۔ کاش کہ ان جیسے چند مہاپرش ہندوستان میں اور پیدا ہوتے۔ پلیگ
کے موسم میں بھائی بھائی سے بھاگتا ہے۔ رشتہ دار ایک دوسرے سے
پرہیز کرتے ہیں۔ لاکھوں آدمی مکھیوں کی طرح مرجاتے ہیں۔ اور کوئی
اُن کی خبر نہیں لیتا۔ جس بزدلی سے ہم ہندوؤں نے پلیگ کے موقع پر
عمل کیا ہے اُس سے تمام قوم کا مونہہ کالا ہوگیا ہے۔ کسی کسی مقام پر بہادر
لوگوں نے جان ہتھیلی پر رکھکر پلیگ کے بیماروں کی خدمت کی ہے۔
اور بعض اوقات اس کوشش میں اپنی جان بھی دی ہے۔ مگر امیر آدمیوں
نے بالخصوص اور دوسروں نے بالعموم ایسی خدمت سے پرہیز کیا ہے
ایسی عظیم الشان مصیبت کے مقابلہ کے لئے ودیا ساگر جیسے مہاپرشوں کی
ضرورت ہے جو اپنی دولت ہمت اور محبت کو غریبوں کی مدد میں صرف کریں

مگر ودیا ساگر کی شان کے آدمی ہر ملک میں کم پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ عوام الناس میں ایسے خیالات پھیلائے جائیں جن سے قوم کا ہر فرد اپنی تعلیمی۔ سوشل۔ مذہبی اور پولٹیکل حالت کو بہتر کر کے اعلےٰ درجہ کی زندگی حاصل کرے۔ ہر فرد کے لئے ودیا ساگر بننا مشکل ہے مگر جوں جوں ہماری زندگی کے مختلف پہلو بہتر شکل اختیار کریں گے لوگوں کی عملی طاقت بڑھیگی اور بیس پچاس یا زیادہ آدمی مل کر وہی کام کر سکیں گے جو ودیا ساگر اکیلے کرتے تھے۔ لوگ مل کر سکول اور کالج کھول سکتے ہیں۔ جاتی سدھا کر سکتے ہیں۔ نئے طریقوں سے تجارت کو ترقی دے سکتے ہیں اور پولٹیکل کوشش کو باقاعدہ بنا سکتے ہیں۔ ایسے متفقہ عمل کا نتیجہ غالباً زیادہ مفید اور دیرپا ہوگا۔ کیونکہ اول تو وہ کسی خاص شخص کی زندگی پر منحصر نہ ہوگا دوئم مختلف لیاقتوں کے لوگ کام کرنا سیکھیں گے اور رفتہ رفتہ قوم کی ترقی کا راستہ صاف ہو جائیگا۔ ہمارے ہموطنوں کے خیالات میں ایسی تبدیلی پیدا کرنے کا کام جن بزرگوں نے کیا ہے اُن میں مہادیو گوبند راناڈے کا نام نامی بڑی عزت کا مستحق ہے۔ اسی وجہ سے میں نے کوشش کی ہے کہ اُن کی زندگی کے واقعات اور اُن کے بیش بہا خیالات اس کتاب کے ذریعہ سے پبلک کے سامنے پیش کروں۔ وہ اُن مہاتماؤں میں سے نہ تھے جنکو (man of action) کا خطاب ٹھیک طور سے دیا جا سکتا ہے اُن کے لئے مشکل تھا کہ راجہ رام موہن رائے اور سوامی دیانند سرسوتی کی طرح کسی خیال کی دھن میں ماں باپ کو ناراض کرتے گھر بار چھوڑ کر اپنے خیالات کے پرچار میں گمراہ خلقت کو اپنا دشمن بناتے اور اپنے

مشن کی کامیابی کے لئے اپنی جان قربان کرنے کو تیار رہتے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ بہ حیثیت (teacher) اور (thinker) مسٹر راناڈے کا رتبہ اپنے ہمعصروں میں بلند تھا۔ اپنے سربرآوردہ ہمعصروں پر اُن کو یہ بھی فوقیت تھی کہ اپنی شیریں زبان اور سنجیدہ طبیعت کے زور سے وہ مختلف مزاج کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکتے تھے اور اپنے خیالات کو اس خوبصورتی سے بیان کرتے تھے کہ سب لوگ واہ واہ کرتے تھے۔ اُن کی طبیعت میں نہ جوش خروش تھا نہ غصہ تھا۔ سقراط کی طرح بڑی سنجیدگی سے انہوں نے کل معاملات ملکی پر اپنے غور و فکر کے نتائج ظاہر کئے۔ جن کی آنکھیں تھیں وہ تاڑ گئے جن کے دماغ تھے وہ سمجھ گئے کہ یہ بلا کا آدمی ہے۔ گورنمنٹ کا ذکر ادب سے کرتا ہے۔ سرب جنک سبھا کے ذریعہ سے مہاراشٹر کے لوگوں کو اتفاق کی لڑی میں پروتا ہے اور پونا میں وہ وہ تعلیمی اور تجارتی۔ صنعتی اور ساماجک تحریکیں جاری کرتا ہے کہ جن سے تعلیم یافتہ جماعت کی طاقت پہلے سے سوگنا ہو گئی۔ ایک طرف ویدک زمانہ کی بزرگی ہندوؤں کے ذہن نشین کرتا ہے دوسری طرف زمانہ حال کی ضرورتوں سے اُن کو آگاہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انگریزوں کے عہد میں یورپ اور امریکہ سے جو کچھ سیکھنا ہے سیکھ لو ورنہ موجودہ جد و جہد میں کامیابی مشکل۔ محب قوم ہو تو ایسا ہو +

قریباً تیس سال مسٹر راناڈے نے اپنی غیر معمولی لیاقت سے

ملک کی خدمت کی۔ اور اپنے ہموطنوں کے معراج کو اونچا کیا۔ کون کہ سکتا ہے کہ آج کل ہم کو مسٹر راناڈے کی ضرورت نہ تھی۔ برسوں کی بندش سے قوم کروٹیں لے کر جاگ رہی ہے۔ لوگوں کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں۔ نئی روشنی نئے راستے دکھا رہی ہے۔ چاروں طرف شور ہو رہا ہے۔ گورنمنٹ بھی حیران ہے۔ لوگ بھی حیران ہیں۔ ایسے نازک وقت میں ہم کو مسٹر راناڈے کی دانائی دوربینی اور پاک حب الوطنی کی بڑی ضرورت تھی۔ مسٹر راناڈے ہماری نظروں سے غائب ہیں مگر اُن کی زندگی کا پیغام۔ ملک کے لئے کوشش اور قربانی۔ ہم ہر روز سن سکتے ہیں۔ قوم کے بچوں تک یہ مبارک پیغام پہنچانے کے لئے میں نے یہ چھوٹی سی کتاب لکھی ہے۔ اس کی تیاری کے لئے میں نے مسٹر راناڈے کی سوانح عمری مصنفہ مسٹر مانکر۔ مسٹر راناڈے کی تصنیفات اور تقریریں مسٹر چنتامنی کی کتاب موسومہ سوشل ریفارم۔ مسٹر راناڈے کے متعلق مسٹر گوکھلے کی تقریریں۔ اور مرہٹہ نامی اخبار و دیگر اخبارات میں جو آرٹیکل مسٹر راناڈے کے متعلق شایع ہوئے ہیں پڑھے ہیں۔ اور کئی معاملات پر مسٹر دیودھر ایم اے سے جو سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی پونا کے معزز ممبر ہیں خط وکتابت کی ہے۔ مسٹر دیودھر کی مدد کا میں تہ دل سے مشکور ہوں۔ مجھے نہ انشاپردازی میں دخل ہے نہ انشاپردازوں میں شمار ہونے کی خواہش ہے۔ اسلئے اپنے طرز تحریر کی نسبت سٹائل کے استادوں سے معافی کا خواستگار

ہوں۔ اصل مطلب اس کتاب کے لکھنے سے یہ ہے کہ مسٹر راناڈے کے خیالات اپنے ہموطنوں پر ظاہر کروں تاکہ اُن سے بہرہ ور ہوکر ہم زمانہ حال کی جد و جہد میں کامیاب ہونا سیکھیں اور اپنے ملک کی حالت بہتر کریں ÷

۱۷ مارچ ۱۹۰۸ء

مادھورام

انبالہ شہر

بچپن اور طالب علمی کا زمانہ

۱۸ جنوری ۱۸۴۲ء کو احاطہ بمبئی کے ضلع ناسک کی پاک سرزمین
میں قصبہ پنہاد کو یہ فخر حاصل ہوا کہ وہاں کے ایک برہمن خاندان میں
گوبند مہادیو راناڈے پیدا ہوئے۔ اگرچہ اُن کے باپ دادا کی
بڑائی کو ان کی سوانح عمری سے کچھ تعلق نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات
غریب گھروں میں پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر جیسے وہ موتی پیدا
ہوتے ہیں کہ جن کی چمک دیکھ کر دنیا حیران ہو جاتی ہے۔ مگر یہ کہدینا ضروری
ہے کہ اُن کے باپ گوبند راؤ قصبہ پنہاد میں فدنویس دفردنویس، یعنی محکمہ
مال کے معزز کارکن تھے۔ ان کے دادا امرت اپاجی ضلع پونا میں عرصہ
تک معاملات دار یعنی افسر مال رہ چکے تھے۔ امرت اپاجی کے باپ
بھاسکر راؤ جن کو اپاجی بھگونت بھی کہتے تھے۔ ایک وقت میں ریاست
سنگلی کی طرف سے پونا میں پیشوا کے دربار کے وکیل تھے۔ اس معزز
خاندان کو گوبند مہادیو کی آئندہ بزرگی کا خیال تک بھی نہ تھا۔ کیونکہ بچپن
میں ان کی شکل وشباہت سے ہوشیاری وچالاکی بالکل ظاہر نہ ہوتی تھی
چھ سال کی عمر تک وہ اپنی مادری زبان مرہٹی کے الفاظ بھی اچھی طرح
نہیں بول سکتے تھے۔ اس لئے اُن کی ماں گوپیکا بائی ہمیشہ گنپتی مہادیو
سے دعا مانگتی رہتی تھی کہ اس لڑکے کی زبان صاف ہو جائے۔ شروع
میں انہوں نے مرہٹی زبان میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بعد ازاں وہ

کولھاپور کے انگریزی مدرسہ میں داخل ہوئے۔ کیونکہ اُس وقت ان کے باپ ریاست کولھاپور میں ملازم تھے۔ اس مدرسہ میں ان کی ذہانت اچھی طرح ثابت ہوگئی اور وہاں انہوں نے ہر ایک امتحان بہت عمدگی سے پاس کیا۔ مگر چونکہ وہ کم گو اور شرمیلے تھے ان کے باپ انکو ہمیشہ کند ذہن اور غبی سمجھتے رہے اور اس وجہ سے باپ اور بیٹا آپس میں بات چیت کم کرتے تھے۔ افسوس کہ ۱۸۵۳ء میں جبکہ ان کی عمر ۱۱ سال کی تھی ان کی پیاری ماں اس جہان فانی سے کوچ کر گئی اور ان کی آئندہ شان و شوکت دیکھنے سے محروم رہی۔ اوپر کے بیان سے ظاہر ہے کہ ماں باپ کا انکی طبیعت پر بہت کم اثر پڑا۔ آئندہ زندگی میں جو رنگ اُنکے دل و دماغ نے پکڑا۔ وہ ان کا خاص اپنا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں وہ کولھاپور کے مدرسہ کی تعلیم ختم کرچکے اور اپنے ہم جماعت دنایک جنار دھن کرتا نے کے ساتھ (جو بعد میں راؤ بہادر ونایک جنار دھن کرتا نے کے نام سے ریاست اندور میں دیوان ہوئے) بمبئی میں اعلےٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے گئے۔ اُن کے باپ ان کو کم سخن اور شرمیلے ہونے کی وجہ سے اتنی دور بھیجنا نہیں چاہتے تھے مگر انہوں نے ونایک کے باپ سے اور ونایک نے ان کے باپ سے ایسے زور سے بمبئی جانے کے لئے درخواست کی کہ دونوں نے خوشی سے اجازت دیدی۔ بمبئی میں وہ ایلفنسٹن ہائی سکول کی دوسری جماعت میں داخل ہوئے۔ وہاں ان کا استاد خان بہادر کیخسرو ہرمزجی الپا والا جو بعد میں ضلع سورت کی عدالت خفیفہ کا جج ہوگیا مہادیو کی ذہانت اور ہوشیاری سے ایسا خوش

ہوا کہ اُس نے تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُن کو ترقی دے کر جماعت اول
میں داخل کر دیا۔ ۱۸۵۸ء میں مہادیو ایلفنسٹن کالج میں داخل ہوئے
وہاں انہوں نے درجہ بدرجہ دس پندرہ۔ بیس روپیہ ماہوار کا وظیفہ
حاصل کیا۔ ۱۸۵۹ء میں یونیورسٹی کا امتحان انٹرنس اول مرتبہ ہوا اور اسمیں
مہادیو بڑی خوبی سے کامیاب ہوئے۔ اب ان کو جونیر (ادنے) دکشنی
فیلو کا رتبہ حاصل ہوا۔ اور ۶۰ روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ اس کے
عوض وہ چھوٹی جماعتوں کو پڑھاتے تھے اور خود اپنے امتحان کے
لئے بھی تیاری کرتے تھے۔ تین سال کے بعد ان کو سینیر (اعلےٰ) دکشنی
فیلو بنایا گیا اور ایک سو بیس ۱۲۰ روپیہ ماہوار وظیفہ ملنے لگا۔ ۱۸۶۱ء میں
انہوں نے (ایف۔ اے) کا امتحان پاس کیا۔ ۱۸۶۲ء میں بی۔ اے
کا امتحان اول درجہ میں اور مضمون تاریخ اور پولیٹیکل ایکانمی میں
انرز کا امتحان پاس کیا اور ایک طلائی تمغہ اور دو سو روپیہ کی کتابیں
انعام میں حاصل کیں۔ ۱۸۶۴ء میں ان کو ایم۔ اے کی ڈگری عطا ہوئی
۱۸۶۵ء میں وہ یونیورسٹی کے فیلو بنائے گئے۔ مسٹر رانا ڈے بمبئی یونیورسٹی
کے پہلے ڈگری یافتہ تھے جن کو اول اول یہ عزت حاصل ہوئی۔ اس وقت
اُن کی لیاقت نے چھوٹے بڑے سب کو حیران کر رکھا تھا۔ یونیورسٹی
کانووکیشن کے موقع پر سر بارٹل فریر گورنر بمبئی نے ان کی لیاقت کی بڑی
تعریف کی۔ ۱۸۶۶ء میں انہوں نے امتحان ایل ایل بی کا حصہ اول اگلے
سال اس کا حصہ دوئم اول درجہ میں اور ۱۸۷۱ء میں قانونی ایڈووکیٹ کا
امتحان عمدہ طرح سے پاس کیا۔ یہ قابل قدر کامیابی ظاہر کرتی ہے کہ

مہادیو کا دماغ اعلٰے درجہ کا تھا - مگر اس کامیابی کے لئے ان کو سخت محنت کرنی پڑی تھی - جو کتابیں انہوں نے بہ حیثیت دکشنی فیلو پڑھی تھیں - ان کی فہرست اس رپورٹ میں جو انہوں نے اپنے کالج کے پرنسپل کی خدمت میں پیش کی تھی درج ہے اس فہرست میں اتنی کتابیں ہیں - اور بعض ایسی مشکل اور بڑی ہیں کہ ہر ایک شخص اس فہرست کو پڑھ کر حیران ہو جائے ؎

مہادیو کو بھی معلوم تھا کہ انہوں نے بہت سی عمدہ عمدہ کتابوں کا مطالعہ کیا ہے مگر اس غرض سے کہ لوگ اس فہرست کا لکھنا نامناسب نہ سمجھیں - انہوں نے یوں تحریر فرمایا کہ "میں نے یہ فہرست اپنی تعریف کے لئے یا شیخی کے خیال سے نہیں لکھی - میں نے اور میرے دوست منگیش واگلے نے یہ کتابیں آپس میں مل کر پڑھی ہیں - یہ فہرست میں نے اس غرض سے لکھی ہے کہ جو لوگ ہمارے کام میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں ان کو معلوم ہو کہ ہم نے بحیثیت جونیر دکشنی فیلو اپنے وقت کو ضایع نہیں کیا" اگرچہ مہادیو اپنے کام کو قابل تعریف نہیں سمجھتے تھے - ان کے کالج کے پرنسپل نے اور محکمہ تعلیم کے ڈایرکٹر نے اپنی جداگانہ سالانہ رپورٹ میں ان کی محنت اور لیاقت کی خوب داد دی - پرنسپل گرانٹ صاحب نے ۱۸۶۳ء میں گورنمنٹ

کو تحریر کرتے ہیں۔ کہ میں مہادیو گوبند کی رپورٹ کی
طرف آپ کی خاص توجہ دلاتا ہوں۔ اس رپورٹ سے
ایک اعلےٰ درجہ کے ہندو طالب علم کی کوشش ظاہر
ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی اس رپورٹ سے اس کو دکشنی فیلو
بنانے کا فایدہ بھی معلوم ہوتا ہے جن نوجوانوں کو فیلو بنایا
جاتا ہے وہ دیانت دار اور مہذب شخص بن جاتے ہیں
اور اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ ان کو اعلےٰ عہدے
دیئے جائیں۔ جہانتک میرا تجربہ ہے یہ خیال بالکل غلط
ہے کہ اعلےٰ تعلیم سے ہندوستانیوں کے اخلاق خراب ہو
جاتے ہیں۔ برعکس اس کے کالج میں مجھ کو یہ ثابت ہوا ہے۔
کہ جوں جوں کسی شخص کی تعلیم بہتر ہوتی جاتی ہے اس کی لیاقت
اور ایمانداری میں بھی ترقی ہوتی ہے"

مگر طالب علمی کے زمانے میں مسٹر راناڈے صرف کتاب
کے کیڑے ہی نہ تھے۔ بلکہ اس وقت بھی وہ سوشل اور پولیٹیکل
ریفارم کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کرنے کی کوشش کرتے
تھے۔ ۱۸۶۲ء میں اخبار اندو پرکاش چھپنے لگا۔ یہ اخبار
انگریزی اور مرہٹی زبان میں نکلتا تھا۔ اس کی خوش قسمتی سے
انگریزی حصے کے اڈیٹر مسٹر راناڈے مقرر ہوئے۔ اس
زمانہ میں مرہٹی اخباروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اور ملکی
معاملات پر مناسب رائے دینے کی تو ان کو بالکل تمیز نہ تھی۔

اس لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ ایک ایسا اخبار جاری کیا جاوے کہ جو ہندوستانی رعایا کے خیالات کو لیاقت آزادی اور ادب سے گورمنٹ پر ظاہر کرے - اور جس میں وزن دار مضمون ملکی معاملات پر شایع ہوا کریں - مسٹر رانادے نے چار سال تک اس اخبار کی اڈیٹری کا کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا - ان کی تحریر پر مغز ہوتی تھی - اور انگریز لوگ بھی اسے غور سے پڑھتے تھے - طالب علمی کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے - اور اس اخبار سے ان کا قطع تعلق ہو گیا - یہ اخبار اب تک ملک کی خدمت کر رہا ہے - اگرچہ مسٹر رانادے جیسا اڈیٹر اس اخبار کو پھر کبھی نصیب نہیں ہوا مگر اس کے سب اڈیٹر یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ رہے ہیں اور انہوں نے اخبار کو اسی اعلےٰ درجہ پر رکھنے کی کوشش کی ہے جس پر کہ اس کے بانی شروع سے رکھنا چاہتے تھے ؞

سرکاری ملازمت اور شہر پونا سے تعلق

قانون کا آخری امتحان پاس کرنے کے بعد مسٹر راناڈے کو ہائیکورٹ بمبئی میں بطور وکیل مقدمات کی پیروی کرنے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ مگر انہوں نے پیشہ وکالت کی کثیر مگر غیر مستقل آمدنی کے مقابلے میں سرکاری ملازمت کی قلیل مگر مستقل آمدنی کو پسند کیا۔ ممکن ہے کہ ان کی کم گوئی۔ منکسر المزاجی اور صلح پسند طبیعت نے پیشہ وکالت کے اختیار کرنے میں رکاوٹ ڈالی ہو تاہم چونکہ ان کا دماغ روشن تھا ان کی تقریر صاف تھی اور زبان انگریزی پر ان کو بڑی دسترس تھی۔ اور وہ ہر ایک معاملے پر بہت عمدہ دلایل پیش کر سکتے تھے اگر وہ پیشہ وکالت اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ وہ اس کام میں مسٹر تیلنگ کی طرح بہت جلد کامیاب ہوتے اور تھوڑے عرصہ میں جج ہائیکورٹ بن جاتے۔ میری رائے میں یہ بہتر ہوا کہ انہوں نے وکالت کا پیشہ اختیار نہ کیا۔ اس پیشہ کا بڑا نقص یہ ہے کہ وکیلوں کو عدالتوں میں بڑا وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹی عدالتوں میں اور بڑی عدالتوں میں مقدمات کے پیش کرنیکا وقت جج کی مرضی پر منحصر ہے۔ کوئی دس بجے کام شروع کرتا ہے کوئی بارہ بجے۔ ایک بجے کچہری میں آتا ہے۔ کوئی شام اور رات کو کام کرتا ہے۔ وکیلوں کو ان سب کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور اکثر گھنٹے آدھ گھنٹے کے کام کے واسطے تمام دن ضائع کرنا پڑتا ہے۔ مسٹر راناڈے کے لئے وکیل بن کر اس تضیع اوقات سے بچنا مشکل ہوتا۔ بہ حیثیت سرکاری

افسر اُن کے کام کا وقت مقرر رکھتا - افسران سرکاری اگر چاہیں تو ہر ایک دن کا کام اس طرح مقرر کر سکتے ہیں کہ کچہری میں دس بجے آکر بلا کسی تکلیف کے چار بجے تک اپنے فرض منصبی سے فارغ ہو جائیں۔ علاوہ ازیں اُن کو اختیار ہے کہ جب چاہیں آئیں - جب چاہیں جائیں۔ ان کی طبیعت پر کسی خاص وقت کی حاضری کا کبھی فکر نہیں ہوتا - حکام بالا دست کئی دفعہ سرکلر اور روبکاریں جاری کرتے ہیں کہ عدالتوں کا کام دس بجے شروع ہونا چاہیئے مگر چونکہ وہ حکام خود وقت کی پابندی نہیں کرتے اور رعایا ڈر کے مارے حکام کی شکایت نہیں کرتی ماتحت افسران جس طرح چاہتے ہیں کام کرتے ہیں - علاوہ ازیں ہر ایک وکیل چاہے وہ کتنا ہی آزاد منش کیوں نہ ہو اس بات کی کوشش یا کم سے کم خواہش کرتا ہے کہ افسر اُس سے ناراض نہ ہوں - کیونکہ اگر لوگوں میں یہ بات مشہور ہو جائے کہ فلاں وکیل سے فلاں افسر ناراض ہے تو وہ اُس وکیل کو اپنے مقدمات نہ دینگے - اس لئے اچھے سے اچھے وکیل بھی جہاں تک ہو سکتا ہے حکام کو ناراض نہیں کرتے - وہ جانتے ہیں کہ فلاں افسر رشوت خور یا بدزبان ہے - لوگوں کی سفارش سن کر مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے یا قانون سے ناواقف ہے - مگر وہ اس کارروائی پر کچھ اعتراض نہیں کرتے بلکہ افسروں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ گورنمنٹ اپنے افسروں کی مدد کرتی ہے اور انکے خلاف وکیلوں کی شکایت نہیں سنتی - ساتھ ہی روزی کمانے کی جدوجہد وکیل کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ اچھے یا بُرے مقدمے

میں تمیز نہ کرے - مقدمہ جیتنے کے قابل ہو - یا کمزور رہو - سچا ہو یا جھوٹا ہو
وکیل کو اپنی فیس سے غرض ہے - وہ مقدمہ لینے سے انکار نہیں کرتا
اُس کی لیاقت - طاقت گویائی - اور قانونی واقفیت سب اس شخص کے
حوالہ ہوتی ہے جو اس کو فیس دے سکے - وہ بھی کیا کرے - مقدمات
میں شکست و فتح اکثر اوقات اُن کے اچھے یا خراب ہونے پر منحصر نہیں
بلکہ عدالتوں کی لیاقت یا نالائقی پر منحصر ہے - اگر عدالتیں قانون سے اچھی
طرح واقف ہوں اور ہر ایک مقدمے کے فیصلے میں پوری کوشش اور
غور کریں تو وکیل آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ فلاں مقدمہ جیتنے کے قابل
ہے یا نہیں - مگر چونکہ عدالتیں عموماً بے پرواہی سے کام کرتی ہیں وکیل
اچھے بُرے مقدمے کی تمیز نہیں کرتا - یہ جد و جہد اکثر اوقات وکیل کی
طبیعت پر خراب اثر ڈالتی ہے - اگرچہ اس وقت جبکہ مسٹر رانا ڈے نے
امتحان وکالت پاس کیا وکیلوں کی تعداد بہت کم تھی اور وکالت میں
کامیابی حاصل کرنے کے لئے آجکل جیسی سخت کوشش کی ضرورت نہ تھی
تاہم مذکورہ بالا واقعات کو مد نظر رکھکر ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ مسٹر رانا ڈے
جیسے نیک شخص کے لئے یہ بہتر ہوا کہ وہ وکیل نہ بنے - انہوں نے
سرکاری ملازمت میں اپنا بہت سا بیش قیمت وقت بچایا اور اُس کو اپنے
اعلےٰ درجہ کے مطالعہ اور دیگر مفید کاموں میں صرف کیا - میں اس بات
کو ماننے کے لئے تیار ہوں کہ سرکاری ملازمت بھی نقص سے بری
نہیں - چونکہ ہندوستان کی گورنمنٹ ایک غیر قوم کے ہاتھ میں ہے وہ
اکثر ہندوستانیوں کے حقوق کی مناسب حفاظت نہیں کرتی - اور

آزاد منش ہندوستانی افسر ان کی قدر نہیں کرتی۔ کبھی کبھی ہندوستانی افسر
ایسے تنگ ہوتے ہیں کہ سرکاری ملازمت کو سو سو گالیاں سناتے ہیں۔
سرکاری ملازمت کا خراب اثر یہ بھی ہے۔ کہ سرکاری
ملازم رعایا کے حقوق کی کم پرواہ کرتے ہیں۔ شروع
شروع میں آزاد طبیعت والے ہندوستانی افسر گورنمنٹ کی پالیسی کو دل
سے ناپسند کرتے ہیں اور مجبوراً اس کی پیروی کرتے ہیں مگر رفتہ رفتہ
ان کی طبیعت اس پالیسی سے مانوس ہو جاتی ہے اور کچھ عرصہ کے بعد
ان کو اپنی کارروائی میں کوئی غیر معمولی بات معلوم نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں
وہ ہر روز دیکھتے ہیں کہ انگریزی حاکم ہندوستانی رعایا کے آرام کی کچھ پروا
نہیں کرتے۔ اس لئے وہ بھی ہندوستانیوں سے انگریز افسروں کی طرح
سلوک کرتے ہیں۔ اگر کوئی انگریز اُن کے سامنے آجائے تو وہ سب کام
چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں مگر اپنے ہم وطنوں کی عزت و آرام
کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ ممکن ہے کہ سرکاری ملازمت کی ہوا نے مسٹر
راناڈے کی طبیعت پر کچھ خراب اثر ڈالا ہو اور اس وجہ سے ہم کبھی کبھی
یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازم نہ ہوتے تو قوم کے لئے
بہتر ہوتا۔ مگر مسٹر راناڈے ایسے آزاد منش اور اپنی قوم پر ایسے دلدادہ
تھے کہ گورنمنٹ کی ملازمت اُن تعلقات پر جو اُن کو اپنی قوم کے ساتھ
تھے کوئی خراب اثر نہ ڈال سکی۔ بلکہ اس کے برعکس گورنمنٹ کو غلطی سے
کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا تھا کہ مسٹر راناڈے گورنمنٹ کے مخالف ہیں۔ اس سے
ظاہر ہے کہ ان کا ملازمت میں داخل ہونا ان کے لئے یا ان کی قوم کیلئے

مضر نہ تھا +

نصف ۱۸۶۶ء سے اخیر ۱۸۶۷ء تک وہ دو سو روپیہ ماہوار پر محکمہ تعلیم
میں مرہٹی زبان کے مترجم رہے۔ اسی اثنا میں وہ ریاست اکال کوٹ
میں کارباری کا کام بھی کرتے تھے۔ کالج سے نکل کر ایک بڑی ریاست
کے انتظام میں شریک ہونا ایک ۲۴ سالہ نوجوان کے لئے فخر کی بات
تھی۔ اس ریاست میں مسٹر راناڈے نے اپنے فرض منصبی کو اس
خوبی سے ادا کیا کہ ان کو اس کے بعد چار سو روپیہ ماہوار پر ریاست
کولھاپور کا جج مقرر کیا گیا۔ مگر چونکہ انہوں نے قانون میں سب سے بڑا
امتحان ابھی پاس نہیں کیا تھا اسلئے انہوں نے اس عہدہ سے استعفا دیدیا
اور ایلفنسٹن کالج بمبئی میں انگریزی زبان کے قایم مقام پروفیسر کا عہدہ
قبول کر لیا۔ ۱۸۶۸ء سے ۱۸۷۱ء تک وہ اسی عہدہ پر مقرر رہے۔ شروع
۱۸۷۱ء میں انہوں نے قانونی ایڈوکیٹ کا امتحان بڑی عزت کے ساتھ
پاس کیا اور اب وہ جوڈیشل افسر بنائے گئے۔ مارچ ۱۸۷۱ء سے جولائی تک
وہ بمبئی میں مجسٹریٹ رہے۔ اور جولائی سے ستمبر تک جج عدالت خفیفہ رہے
نومبر ۱۸۷۱ء میں وہ درجہ اول کے سارڈی نیٹ جج مقرر ہو کر پونا میں
تعینات ہوئے۔ اور اس وقت ان کا پونا سے وہ تعلق شروع ہوا
جس نے پونا کی کایا پلٹ دی۔ اور اس کو پولٹیکل اور تعلیمی معاملات
میں احاطہ بمبئی کا ایک مشہور مرکز بنا دیا۔ اس وقت ان کی عمر قریباً تیس
سال کی تھی مگر گورنمنٹ نے ان کو سات سو روپیہ ماہوار تنخواہ اور اول
درجہ کے اختیارات دیکر ثابت کر دیا کہ وہ مسٹر راناڈے کی لیاقت کی

بڑی قدر کرتی تھی - اس وقت وہ جوڈیشل کام میں ناتجربہ کار تھے مگر
گورنمنٹ نے ان کو وہ تنخواہ اور اختیارات دیئے جو آجکل تمام عمر ضایع
کرنے کے بعد چند ہندوستانی افسروں کو نصیب ہوتے ہیں - یہ ان کی
غیرمعمولی لیاقت کا صلہ تھا - شہر پونا اپنے صوبہ میں بمبئی کے بعد سب
سے بڑا شہر ہے - وہاں کی آبادی بہت زیادہ ہے وہاں کے لوگ
بڑے ہوشیار اور کاروبار والے ہیں - اس لئے وہاں
اول درجہ کے سبارڈی نیٹ جج کا کام بڑا مشکل تھا - مگر مسٹر
راناڈے ایسے معاملہ فہم محنتی اور متحمل مزاج افسر تھے
کہ وہ ہر ایک مقدمہ میں بڑی چھان بین کرتے تھے -
شہادت پر بڑا غور کرتے تھے - اور اپنے فیصلوں کی تائید میں ایسی
زبردست دلایل دیتے تھے کہ ہر ایک شخص لاجواب ہو جاتا تھا اسلئے
باوجود ناتجربہ کاری کے انہوں نے اس عہدہ کا کام بڑی عمدگی سے کیا
اور سب لوگ اُن سے خوش تھے - ان کے اعلےٰ افسر بھی ان کی لیاقت
سے دنگ ہو گئے - سر مائیکل ویسٹراپ صاحب چیف جسٹس بمبئی نے ایک
دفعہ ان کے فیصلہ کے برخلاف اپیل سنتے وقت فرمایا کہ مسٹر راناڈے
ہائیکورٹ کے جج ہونے کے لایق ہیں - سر مائیکل نے کئی دفعہ فرمایا
کہ مسٹر راناڈے کے فیصلوں سے وہ لیاقت اور قانونی واقفیت ظاہر
ہوتی ہے - جو اور کسی سبارڈی نیٹ جج کو نصیب نہیں - اور ان کو اپنا فرض
منصبی ادا کرنے میں بڑی خوشی ہوتی ہے لہٰذا ان کی لیاقت کی وجہ سے
اُن کو دویم درجہ کے سب ججوں کے فیصلوں سے اپیل سننے کا اختیار

دیا گیا اور یہ کام بھی انہوں نے سب لوگوں کے اطمینان کے لایق
کیا۔ ۱۸۷۸ء تک وہ پونا میں رہے۔ مگر چونکہ یہاں ان کا لوگوں سے
میل جول بہت تھا اور ان کی بدولت پونا کے لوگوں میں دماغی ہل چل
بہت ہو رہی تھی۔ گورنمنٹ اُن سے قدرے بدگمان ہو گئی۔ ۱۸۷۸ء
میں ایک کم عقل برہمن کلرک واسدیو بلونت نے اپنے دل میں یہ ارادہ
کر لیا کہ میں سیواجی کی طرح مرہٹوں کا راج پھر قایم کروں۔ اور اس منصوبہ
کو پورا کرنے کے لئے اس نے چند ڈاکو اور آوارہ آدمی اپنے ساتھ لیکر
چھوٹے چھوٹے دیہات میں لوٹ مار شروع کر دی۔ سرکاری فوج نے
اس کو معہ اس کے ہمراہیوں کے گرفتار کر لیا اور وہ سرکار کے حکم سے
عدن بھیجا گیا اور وہاں جا کر مر گیا۔ گورنمنٹ کا خیال تھا کہ انگریزی راج
کو دور کرنے کی تجویز پونا کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں نے کی ہے
اس سے پہلے کچھ سرکاری مکانات بھی آگ سے جل گئے تھے۔ اس
وجہ سے بھی گورنمنٹ پونا کے برہمنوں سے بدظن تھی۔ خوش قسمتی سے
واسدیو بلونت اپنی کارروائی کا روزنامچہ لکھا کرتا تھا۔ جو اس کی گرفتاری
کے بعد سرکار کے ہاتھ میں آ گیا۔ اُس سے ظاہر ہو گیا کہ پونا کے برہمنوں
نے اس کی کچھ بھی مدد نہیں کی تھی۔ اور نہ کسی کو اس کی کارروائی سے
ہمدردی تھی۔ اس روزنامچہ نے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ بلونت نے
سرکاری مکانات نہیں جلائے تھے بلکہ آگ لگانے والا اصل میں
ایک سرکاری ملازم تھا جس نے اپنی بددیانتی کا ثبوت ضایع کرنے کی
نیت سے آگ لگا دی تھی۔ یہ شخص مسٹر راناڈے کی کوشش سے گرفتار

ہوا اور بعد میں اس کو مناسب سزا دی گئی۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے
سر رچرڈ ٹمپل گورنر بمبئی کو مسٹر راناڈے کی طرف سے یہ بدگمانی ہوئی
کہ انہیں بلوونت سے ہمدردی تھی اور وہ خفیہ طور پر اس کے مددگار
تھے۔ اس بدگمانی کی وجہ سے گورنر مذکور نے جس کو محب قوم ہندوستانیوں
سے بالکل ہمدردی نہ تھی مسٹر راناڈے کو ہائی کورٹ کی رائے کے
خلاف پونا سے تبدیل کر کے ناسک بھیجدیا اور ڈیڑھ سال کے بعد
ناسک سے بمقام دھولیا تعینات کر دیا کیونکہ دھولیا سے پونا بہت
دور ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد سر رچرڈ ٹمپل ہندوستان سے رخصت ہوئے
اور چونکہ واسدیو بلوونت کے روزنامچے سے یہ امر بخوبی ثابت ہو گیا تھا کہ کسی
معزز اور ذی عقل شخص کو اس کی بغاوت سے کچھ تعلق نہ تھا۔ سر جیمس
فرگسن نے گورنر نے شروع ۱۸۸۱ء میں مسٹر راناڈے کو بمبئی کا پریزیڈنسی
مجسٹریٹ مقرر کر دیا۔ اس عہدہ پر مسٹر راناڈے نے فوجداری کام سے
بھی ویسی ہی اعلےٰ واقفیت ظاہر کی جیسی کہ دیوانی کام سے وہ پہلے ظاہر
کر چکے تھے۔ ایک دفعہ بہ حیثیت پریزیڈنسی مجسٹریٹ انہوں نے ایک
انگریز کو پچاس روپیہ کی مالیت کی چوری کے عوض چھ ماہ کی قید کی۔ اور
ایک ہندوستانی کوچوان کو اپنے آقا کے سو روپیہ کے نوٹ کی نسبت خیانت
مجرمانہ کرنے کے بدلہ ایک مہینہ کی قید کی۔ ان دونوں سزاؤں کا فرق
دیکھ کر انگریزوں نے واویلا مچایا کہ مسٹر راناڈے ہندوستانیوں کی رعایت
کرتے ہیں اور انگریزوں کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اس معاملہ کے
متعلق ایک انگریزی افسر نے اخبار ٹائمس آف انڈیا کو ایک خط لکھا

جس میں اس نے یہ واقعات ظاہر کئے کہ انگریز مجرم بھرا ہوا پستول ہاتھ
میں لے کر ایک ریلوے سٹیشن پر گارڈ کے کمرہ میں گیا اور اس کی غیر
حاضری میں اس کے صندوق کو کھول کر اس میں سے پچاس روپیہ کی مالیت
کے کپڑے چرا لئے۔ اگر کوئی شخص اس مجرم کو چوری کرنے سے روکتا تو
وہ ضرور اس شخص کو پستول سے زخمی کرتا۔ بمقابلہ اس کے ہندوستانی
کوچوان اپنے آقا کا بہت پرانا ملازم تھا۔ اور اس کے آقا نے عدالت
میں جا کر اس کی سابقہ ایمانداری کی شہادت دی اور عدالت سے
درخواست کی کہ ملازم کو سخت سزا نہ دیجائے۔ ان حالات میں انگریز
اور ہندوستانی مجرموں کو جو سزا مسٹر راناڈے نے دی وہ نامناسب نہ تھی
پریزیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدہ پر دو اڑھائی ماہ کام کر کے وہ ۳۰ مارچ
سنہ ۱۸۸۱ء کو پونا میں پھر اول درجہ کے سب جج ہو کر گئے۔ اور چونکہ ان کی
لیاقت مشہور تھی اگست سنہ ۱۸۸۱ء میں ایکٹ سنہ ۱۸۷۹ء (جو ملک دکن کے
زراعت پیشہ لوگوں کی مدد کے لئے بنایا گیا تھا) کے متعلق وہ ڈاکٹر پالن
کے ماتحت اول درجہ کے سب جج بنائے گئے۔ تاکہ ضلع پونا اور ستارا
میں عدالت ہا ماتحت کی جو ایکٹ مذکور کی منشا کے مطابق فیصلجات
کرتی تھیں نگرانی کریں۔ مسٹر راناڈے کو اس ایکٹ کے مدعا سے پوری
ہمدردی تھی وہ جانتے تھے کہ زراعت پیشہ لوگ معاملہ فہم نہیں اور
ساہوکار لوگ ان کو ایسا ستاتے ہیں کہ زمین کی پیداوار میں سے
ان کے بال بچوں کے کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑتے۔ اور
اس وجہ سے ان کی حالت بہت خراب ہو جاتی ہے۔ مسٹر راناڈے

نے اس عہدہ پر بھی اپنا فرض منصبی بڑی عمدگی سے ادا کیا اور مسٹر پالن نے سالانہ رپورٹ میں ان کی لیاقت درعالی دماغی کی بڑی تعریف کی۔ فروری ۱۸۸۴ء میں وہ بارہ سو روپیہ ماہوار پر پونا کی عدالت خفیفہ کے جج مقرر کئے گئے۔ یہ سب سے بڑا عہدہ تھا جو کسی سب جج کو مل سکتا تھا۔ اس عہدہ پر مسٹر راناڈے کو قانون کی زیادہ پابندی سے بچکر خالص انصاف کرنے کا بہت عمدہ موقع ملا۔ لوگوں کی عام شکایت ہے کہ عدالتوں میں قانون اور قاعدوں کی بڑی پابندی ہوتی ہے مگر انصاف کا خون کیا جاتا ہے۔ اور کسی کو انصاف نہیں ملتا۔ مسٹر راناڈے خوب جانتے تھے کہ قانونی منڈی کی چندی کی بدولت بسا اوقات بے انصافی ہو جاتی ہے۔ اس لئے عدالت خفیفہ میں وہ انصاف کو بمقابلہ قانون کے زیادہ مدنظر رکھنا چاہتے تھے۔ مگر وہ اس عہدہ پر دو برس سے کم رہے۔ نومبر ۸۵ء میں ڈاکٹر پالن رخصت پر ولایت گئے۔ اور چونکہ وہ مسٹر راناڈے کے کام سے بخوبی واقف تھے انہوں نے سفارش کی کہ ایکٹ ۷۹ء کی کارروائی کے لئے اُن کی جگہ مسٹر راناڈے کو مقرر کیا جاوے۔ اس لئے وہ ڈاکٹر پالن کے جانشین مقرر ہوئے اور دسمبر ۸۵ء سے نومبر ۹۳ء تک ہائی کورٹ کے جج ہونے سے پیشتر ایکٹ ۷۹ء کے متعلق سپیشل جج رہے۔ اپریل ۸۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کو ایک مالی کمیٹی کا ممبر بنایا۔ یہ کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا اور اس کے ماتحت صوبجات کے خرچ کی جانچ پڑتال کرے۔ اور جو کفایت

اس میں ہو سکتی ہو اس کی نسبت اپنی تجویز پیش کرے۔ مگر اس کمیٹی کی محنت کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کیونکہ جب بہت سے لوگ موجودہ خرچ کو قائم رکھنے کی خواہش رکھیں اور ایسی کمیٹیوں کی تجویزوں کو ناکامیاب کرنے کے درپے ہوں تو اور کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ مسٹر رانادے نے جو لیاقت اور محنت اس کمیٹی کے کام میں ظاہر کی اُس سے گورنمنٹ بہت خوش ہوئی اور اس کے صلہ میں انہیں سی آئی ای کا اعلےٰ خطاب عطا ہوا ÷

بطور سپیشل جج کے مسٹر رانادے کو اختیار تھا کہ وہ عدالت ہا ماتحت کی جو ایکٹ ۷۹ء کے متعلق مقدمات کرتی تھیں غلطیوں کو درست کریں خواہ وہ غلطیاں قانون کی ہوں یا واقعات کی۔ اگر کسی مقدمہ میں پوری تحقیقات نہ ہوئی ہو یا کوئی اور بے انصافی ہوئی ہو تو مسٹر رانادے کا فرض تھا کہ وہ عدالت ماتحت کے فیصلہ کو منسوخ کریں وہ ہر ایک معاملہ میں خوب غور کرتے تھے اور اس وجہ سے ان کے فیصلے اُن کے ماتحتوں کے فیصلوں سے زیادہ صحیح ہوتے تھے۔ اور سب لوگ ان سے خوش تھے۔ جب یہ ایکٹ ۷۹ء میں جاری ہوا تھا عوام الناس میں اُس کی نسبت بڑا اختلاف رائے تھا۔ جو لوگ اسکے برخلاف تھے وہ کہتے تھے کہ یہ ایکٹ زمینداروں سے آزادانہ معاہدہ کرنے کا اختیار چھینتا ہے۔ ان کے اعتبار کو کم کرتا ہے۔ اور ان کی بیجا رعایت کر کے ان کے قرضخواہوں کو جایز فایدے سے محروم کرتا ہے۔ جو لوگ اس ایکٹ کے حامی تھے وہ کہتے تھے کہ زمینداروں

میں آزادانہ معاہدہ کرنے کی طاقت نہیں اور جبکہ فریقین میں سے ایک
ہوشیار۔ معاملہ فہم اور ناجایز فایدہ اٹھانے والا ہو اور دوسرا ان پڑھ بیعقل
اور کوتہ اندیش ہو تو اُن میں آزادانہ معاملہ ہونا ناممکن ہے۔ مسٹر رانادے
نے بہ حیثیت سپشل جج اپنے طریق عمل سے ثابت کر دیا کہ ایکٹ مذکورہ
سے زمینداروں اور ساہوکاروں کا بہت فایدہ ہے۔ فریقین مقدمہ کا
خرچ کم ہوتا ہے۔ وقت کم ضایع ہوتا ہے اور آپس میں عداوت نہیں بڑھتی
ایکٹ مذکور میں جو انتظام مقدمات کو پنچایت کے سپرد کرنے کا ہے
اس کی نسبت بھی سخت اختلاف رائے تھا۔ اس کے مخالف کہتے
تھے کہ پنچایت کرنے کے لیئے لایق اور ایماندار آدمی ملنے مشکل ہیں۔ مسٹر
رانادے کی رائے تھی کہ گو ناتجربہ کاری کی وجہ سے پنچ غلطی کر جائیں
یا بعض اوقات بے ایمانی بھی کریں مگر پنچایت کا سلسلہ آخرکار اچھا
ہے۔ اور پنچ لوگ اکثر معقول فیصلہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ پنچایت
کے ذریعہ سے لوگ اپنے مقدموں کا خود فیصلہ کرنا سیکھتے ہیں۔ اور عدالت
کے خرچ سے بچتے ہیں۔ چونکہ مسٹر رانادے اس ایکٹ کے ولی خیرخواہ
تھے اس لیئے کچھ تعجب نہیں کہ انہوں نے تہ دل سے اس ایکٹ کی کامیابی
کے لیئے کوشش کی۔ جب وہ ہائی کورٹ کے جج مقرر ہو گئے اور سپشل
جج کے عہدہ سے علیحدہ ہوئے تو اُن کے جانشین مسٹر جاب نے اپنی
رپورٹ میں ان کی بڑی تعریف کی۔ اور گورنمنٹ نے بھی ان کی لیاقت
اور کوشش کی داد دی۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں گورنمنٹ نے سالانہ رپورٹ
میں لکھا کہ مد ایکٹ سنہ ۷۹ء زمینداروں کی کل تکلیفوں کو دور نہیں کر سکتا

مگر اس میں شک نہیں کہ اس کی بدولت زمیندار لوگ کفایت شعار ہو گئے ہیں۔ گورنمنٹ امید کرتی ہے کہ اس ایکٹ کی مدد سے زمینداروں کے مقدمات مسٹر جاپ کی نگرانی میں بھی اُسی عمدگی سے فیصل ہوتے رہیں گے جیسے کہ مسٹر راناڈے کی نگرانی میں ہوتے تھے۔ مسٹر راناڈے کی مدد اور نگرانی سے وہ عمدہ نتیجے پیدا ہوئے جن کا ذکر ۱۸۹۳ء کی سالانہ رپورٹ میں ہے"۔

مسٹر راناڈے کی لیاقت اور حسن انتظام کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی۔ سر ٹی مادھوراؤ نے ریاست بروده کے چیف جسٹس کا عہدہ بمشاہرہ ۲۰۰۰ ماہوار قبول کرنے کے لئے اُن سے کہا۔ بعد میں مہاراجہ ہولکر کی طرف سے پیغام آیا کہ ریاست اندور کے دیوان کا عہدہ بہ مشاہرہ ۲۵۰۰ روپیہ ماہوار آپ کی نذر ہے۔ مگر اُن کے انگریز اور ہندوستانی دوستوں نے رائے دی کہ دیسی ریاست میں جانے سے آپ کی آزادی میں فرق آجائے گا اور آپ کی ملازمت ہمیشہ خطرہ میں رہے گی۔ بمقابلہ اس کے علاقہ انگریزی میں آپ کو اعلےٰ سے اعلےٰ عہدہ پر پہنچنے کی امید ہے۔ سر ولیم ویڈربرن نے ان کو لکھا کہ "جو کچھ پولیٹیکل سوشل اور مالی ترقی پونا کے لوگوں میں ہوئی ہے وہ سب آپ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اگر آپ نے اب پونا چھوڑ دیا تو پونا کا بہت بڑا نقصان ہوگا"۔ مسٹر راناڈے خود بھی ریاستوں کی دھوم دھام اور شان شوکت کو پسند نہ کرتے تھے اس لئے انہوں نے ریاستوں کے پیغام قبول نہ کئے۔ میرے خیال میں بہتر ہوتا کہ مسٹر راناڈے کچھ عرصہ کے لئے ریاست بروده یا اندور

ہیں کسی معزز عہدہ پر کام کرتے۔ ہماری اچھی سے اچھی دیسی ریاستیں اس بات کی محتاج ہیں کہ ان کے اعلےٰ عہدہ دار نیک چلن۔ ایماندار۔ لوگوں کے ہمدرد۔ قاعدہ کے پابند اور وسیع خیال والے ہوں اور رعایا کی ضرورتوں کو زمانہ حال کے مطابق محسوس کریں۔ ابتک وہاں یہ حال رہا ہے کہ اعلےٰ سے اعلےٰ عہدہ دار لوگوں کے آرام کی بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ ضابطہ کی پابندی کرنا عیب سمجھتے ہیں علم اور ہنر سے بے بہرہ ہوکر دقیانوسی خیالات میں پھنسے رہتے ہیں۔ آزادی اُن کے پاس تک نہیں پھٹکتی اور نہ وہ اس بات کو گوارا کر سکتے ہیں کہ کوئی اور شخص ان کے سامنے آزادی سے عمل کرے۔ آجکل چاروں طرف سودیشی کی پکار ہو رہی ہے۔ قحط کے مارے لوگ برباد ہو رہے ہیں اُن کی بے علمی اور افلاس کا کچھ ٹھکانہ نہیں۔ اگر ہماری ریاستوں کے امیروں کو عقل ہوتی تو وہ اپنے علاقوں میں چاروں طرف ایسے کارخانے کھولتے جہاں کپڑا۔ کھانڈ اور دیگر سامان تیار کیا جاتا۔ اور انگریزی چیزوں کی بھرمار سے رعایا محفوظ رہتی۔ مگر ہمارے راجے مہاراجے لاکھوں روپیہ ولایتی سامان خریدنے میں صرف کرتے ہیں ان کو دیکھکر اُن کے ماتحت اہلکار بھی انگریزی چیزوں کو پسند کرتے ہیں۔ اور ایسی نفیس اور قیمتی پوشاک پہنتے ہیں کہ عورتیں بھی کیا پہنیں گی۔ انکے دماغ میں یہ بات کبھی داخل نہیں ہوتی کہ ریاست میں کوئی کارخانہ کھولا جائے۔ جس میں وہاں کے غریب آدمی مزدوری کریں اور امیر آدمی فایدہ اٹھائیں اور جس کے ذریعہ سے ولایتی چیزوں کے استعمال

کی ضرورت نہ رہے ۔ انگریزی علاقہ میں سرکار اس بات کو پسند نہیں کرتی
کہ کوئی شخص دوسرے کو ہندوستان کی بنی ہوئی چیزوں کے استعمال
پر مجبور کرے ۔ مگر ریاستوں میں سودیشی تحریک کی ترقی کے لئے اس بات
کی بالکل ضرورت نہیں کہ کسی شخص پر کوئی جبر کیا جائے ۔ ماتحت لوگ یہاں
کے نوکر نہیں ہوتے ان کو صرف اپنے آقا اور افسروں کی خوشنودی منظور
ہوتی ہے ۔ اگر کوئی راجہ مہاراجہ اس بات کا عہد کرے کہ میں جہاں تک
ہو سکے گا دیسی ساخت کی چیزوں کو استعمال کروں گا اور وہ اپنے اس
عہد پر قایم رہے تو دیکھئے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام ریاست کے
لوگ اُس کی پیروی کرنے لگیں ۔ لارڈ کرزن نے چاہے اور کچھ نہ کیا ہو
مگر اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اس بات کی بڑی کوشش کی کہ ہندوستانی
رئیس انگریزی چیزوں کے استعمال سے بچیں ۔ مگر ہمارے رئیسوں کو
اتنی عقل کہاں کہ وہ لارڈ کرزن کی نصیحت سے فائدہ اٹھائیں ۔ زیادہ
بڑی ریاستوں میں رعایا کی تعلیم کے لئے بہت کم روپیہ خرچ کیا جاتا ہے
وہ اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ لوگوں میں خوب تعلیم پھیلائی
جائے ۔ ہم گورنمنٹ انگریزی سے روز درخواست کرتے ہیں کہ کم سے
کم پانچ پانچ کوس کے دایرہ میں ایک مدرسہ ہونا چاہئے ۔ تاکہ لوگ
کچھ لکھنا پڑھنا سیکھیں ۔ سرکار انگریزی فوج کی مضبوطی میں لاکھوں
روپیہ خرچ کرتی ہے مگر تعلیم پر کافی روپیہ خرچ نہیں کرتی ۔ ہماری ریاستوں
کو فوجوں پر بہت زیادہ روپیہ صرف کرنا نہیں پڑتا ۔ اگر صرف کرنا پڑتا
بھی ہو تو چونکہ رعایا اور رئیس ایک ہی قوم کے ہوتے ہیں رئیس کو

رعایا کی تعلیم کے لئے دل کھول کر سکول قایم کرنے چاہئیں۔ اگر لوگ
تعلیم یافتہ ہوں گے تو تاجر اچھی طرح تجارت کریں گے۔ زراعت پیشہ
لوگ زراعت کے بہتر طریقے اختیار کریں گے۔ اور اہلکار اپنا فرض منصبی
ایمانداری سے بجا لائیں گے۔ مگر ہماری ریاستوں نے انگریزی تعلیم
کی روشنی سے بہت کم فایدہ اٹھایا ہے۔ اُن کی دماغی حالت اب بھی
قریباً وہی ہے جو انگریزوں کے آنے سے پیشتر تھی۔ ورنہ یہ کب ممکن تھا؟
ریاستوں میں بیشمار سکول لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے جاری نہوتے۔
جہاں کہیں ریاستوں میں سکول یا کالج ہیں اُن کی حالت ردی ہے۔ جس قدر
روپیہ اُن کے سکول یا کالج پر صرف ہوتا ہے۔ اگر وہ کسی پرائیویٹ
آدمی کے ہاتھ میں ہوتا تو وہ بدرجہا بہتر انتظام تعلیم کا کرسکتا۔ ممکن ہے
کہ آجکل بمبئی یا مدراس احاطہ کی ریاستوں میں تعلیم کا انتظام کچھ عمدہ ہو مگر
جس وقت مسٹر راناڈے کو بڑودہ اور اندور کی طرف سے ملازمت کا پیغام
آیا۔ اُس وقت ان کی ایسی حالت تھی کہ وہاں مسٹر راناڈے کے جانے
سے بہت فایدہ ہوتا۔ وہ ایسے شیریں کلام شخص تھے کہ جس کسی سے
گفتگو کرتے تھے وہ اُن سے خوش ہوجاتا تھا اور ان کی رائے کو
قبول کرتا تھا۔ اگر اندور یا بڑودہ جیسی ریاست میں مسٹر راناڈے کے
خیالات کی پیروی ہوتی تو ریاست کی کایا پلٹ جاتی۔ جا بجا سکول جاری ہو
جاتے۔ شادی غمی کے متعلق نامناسب رسمیں اور فضول خرچی بند
ہوتی اور حکام اور رعایا اپنی حالت سدھارنے کی کوشش کرتے۔ مگر ان
ریاستوں کے نصیب میں یہ بات نہ تھی کہ مسٹر راناڈے جیسا ایماندار

اور بیدار مغز افسر اُن کو ملے - جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے - آخر ۹۳ء تک وہ زراعت پیشہ لوگوں کے مقدمات کے لئے سپیشل جج رہے ۸۵ء و ۹۰ء و ۹۲ء میں اُن کو گورنر بمبئی کی کونسل کا ممبر بنایا گیا اور جو عمدہ کام انہوں نے کونسل میں کیا اس کی بابت گورنمنٹ نے ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا *

اس وقت تک ہم نے مسٹر راناڈے کی ان خدمات کا جو انہوں نے پونا میں بطور سرکاری افسر کیں ذکر کیا ہے مگر منصبی خدمات سے بڑھکر وہ خدمات تھیں جو انہوں نے پرائیویٹ طور پر اپنے ہموطنوں کی ترقی کے لئے تن من دھن سے اُس زمانہ میں کیں جبکہ وہ پونا میں رہتے تھے - جیسے کہ انسان کا دماغ اُس کے ہاتھ پاؤں کی حرکت پر قابو رکھتا ہے اسی طرح مسٹر راناڈے شہر پونا کا دماغ تھے - اور وہ اپنے دوستوں اور دیگر شخصوں سے اسی طرح کام لیتے تھے جس طرح دماغ ہاتھوں سے کام لیتا ہے - انہوں نے جادوگر کی طرح پونا میں نئی روح پھونکدی سب سے بڑا کام وہاں پر انہوں نے سروجنک (معنی "سب لوگوں کی") سبھا کے متعلق کیا - اس سبھا کی بنیاد ۱۸۷۰ء میں شری مان گنیش واسدیو جوشی نے ڈالی تھی - اُن کے نام پر اس سبھا کا بڑا ہال (کمرہ) بنایا گیا - واسدیو جوشی اپنی قوم پر دلدادہ تھے اور سودیشی تحریک کے سب سے پہلے معاون تھے - اس سبھا میں بڑے بڑے لائق اور امیر آدمی شامل تھے - اس کی طرف سے مسٹر راناڈے کے مشورہ سے ملکی معاملات پر ایسی ایسی مدلل اور پر مغز عرضداشتیں گورنمنٹ کی خدمت میں

گئیں کہ گورنمنٹ کو مجبوراً اُن پر توجہ کرنی پڑی اور اُس نے سبھا کی خدمات کی علانیہ طور پر تعریف کی۔ اس سبھا کا مفصل حال آگے بیان ہوگا +

مسٹر راناڈے ملک کی ترقی کے لئے ضروری سمجھتے تھے کہ یہاں کی مالی حالت درست ہو اور یہاں کے لوگ صنعت اور حرفت میں کمال حاصل کریں۔ اس غرض سے انہوں نے پونا میں صنعت اور حرفت کی ترقی کے لئے ایک ایسوسی ایشن (مجلس) قایم کی جس کا کام ملک کی مالی حالت کے متعلق لوگوں میں واقفیت پھیلانا تھا۔ اسی غرض سے انہوں نے پونا میں صنعت و حرفت کی نمایش قایم کی اور ساتھ ہی ایک سالانہ جلسہ مقرر کیا جس میں انڈسٹریل مضامین پر بڑے بڑے نامور اور باخبر لوگ تقریریں کرتے تھے۔ اس جلسہ کا نام انڈسٹریل کانفرنس تھا۔ اسی طرح انہوں نے عام دلچسپی کی باتوں پر لایق آدمیوں سے لکچر دلانے شروع کئے۔ ان لکچروں میں بڑے مشہور شخص شریک ہوتے تھے اور اُنکی وجہ سے پونا میں خوب دماغی ہل چل ہوتی تھی۔ یہ موسم گرما کے لکچروں کا سلسلہ کہلاتا تھا۔ اور اب تک پونا میں جاری ہے۔ پونا کا کمیٹی گھر (ٹون حال) اور پرارتھنا سماج مندر بھی ان کی کوشش کی بدولت بنا۔ یہ مندر ایک ایسے حصہ شہر میں بنایا گیا جہاں سخت غلاظت تھی اور صفائی کا نام تک نہ تھا۔ لوگوں نے شکایت کی کہ ایسی جگہ مندر بنانے سے کیا فایدہ ہے۔ مسٹر راناڈے نے فرمایا کہ ہم اس دوزخ کو بہشت بنائیں گے +

ہندوستانیوں کی پونا جنرل لائبریری بھی ان کی توجہ کی مشکور ہے۔

اُن کی اور ان کے دوستوں کی کوشش سے گورمنٹ اور عام لوگوں نے اُس کے لئے چندہ دیا جس سے لائبریری کا موجودہ عالیشان مکان راؤ بہادر کنتکار انجنیر کی نگرانی میں بنایا گیا۔ اس کوشش کے شکریہ میں لائبریری کے منتظمان نے مسٹر راناڈے کی آدم قد تصویر جو ایک ہوشیار ہندو مصور نے بنائی تھی لائبریری میں رکھوائی +

قدیم زمانہ کی کتابوں کو مرہٹی زبان سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے ایک سوسائٹی پونا میں قریبًا پچاس سال سے موجود تھی۔ اس کی مدد کے لئے گورمنٹ ایک رقم سالانہ دیتی تھی مگر چونکہ یہ سوسائٹی عرصہ سے کچھ عمدہ کام نہ کرتی تھی اس لئے یہ رقم اکٹھی ہوتی چلی گئی۔ مسٹر راناڈے نے اس سوسائیٹی میں تازہ زندگی ڈالی اور اس کو گورمنٹ سے وہ روپیہ دلوایا جو عرصہ سے اکٹھا ہو رہا تھا۔ اس طرح اس سوسائٹی کو بڑی مدد مل گئی اور وہ مسٹر راناڈے کے مشورہ سے بہت عمدہ کام کرنے لگی +

لارڈ رے گورنر بمبئی کے نام پر پونا میں کاغذ کا کارخانہ قایم کیا گیا تھا۔ اس کا نام رے پیپر مل تھا۔ اور وہ مشہور خاندان پدم جی نامی کی ملکیت تھا۔ مسٹر راناڈے نے اس کارخانہ کی ترقی میں بڑی مدد دی۔ اُن کے مرنے پر سردار خاں بہادر پدم جی نے جو خط ہمدردی کا ان کے رشتہ داروں کو لکھا اس میں اُس نے اس بات کا بھی شکریہ ادا کیا کہ مسٹر راناڈے نے مذکورہ بالا کارخانے کی مدد کی تھی۔ اسی طرح ریشم اور روئی کاتنے اور بننے کا کارخانہ بھی ان کی

صلاح اور مدد کا مشکور تھا +

فرگسن کالج پونا کا نام نامی کس تعلیم یافتہ شخص نے نہیں سنا۔ یہ وہی کالج ہے جس کی خاطر مسٹر پارنج پے نے انگلستان میں امتحان ریاضی کا سب سے بڑا امتحان اول درجہ پہ پاس کر کے دنیاوی جاہ و حشمت پہ لات ماردی اور وہاں ۷۵ روپیہ ماہوار پر پروفیسرین کر اپنے ہموطنوں کو تعلیم دینا منظور کیا۔ یہ وہ کالج ہے جس میں مشہور مسٹر گوپال کرشن گوکھلے اور مسٹر بال گنگادھر تلک پروفیسر رہ چکے ہیں۔ یہ کالج جو آجکل ہندوستانی درسگاہوں میں ایک معزز رتبہ رکھتا ہے اور جس کے پروفیسروں کی حب الوطنی کی پیروی اور کالج کر رہے ہیں سنہ ۸۲ء میں مسٹر راناڈے اور دیگر خیر خواہان قوم کی صلاح مشورہ سے قایم ہوا تھا +

اس کے علاوہ زنانہ ہائی سکول۔ پنچایتی عدالت۔ کانفرنس سب ججان۔ تجارتی بنک۔ کپڑے رنگنے والی کمپنی۔ مرہٹی لٹریچر کو ترقی دینے والی سبھا لوگوں کو لیکچر دینا سکھانے والی سبھا اور گورنر لارڈ رے کے نام کا عجایب خانہ سب یکے بعد دیگرے مسٹر راناڈے کے دماغ کا نتیجہ تھے۔ مسٹر راناڈے کے لئے پونا اور پونا کے لئے مسٹر راناڈے قالب اور رجان ہو گئے تھے۔ جو رتبہ اُس زمانہ میں پونا کو حاصل ہوا وہ پبلک اور گورنمنٹ کی نظروں میں بڑے بڑے شہروں کو بھی کم نصیب ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا بیان سے کسی کو یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ مسٹر راناڈے کے سوا پونا میں اور کوئی محب

قوم - جفاکش اور بیدار مغز شخص نہ تھا - یہ میری مراد نہیں ہے - پونا کی خوش قسمتی سے وہاں اُس وقت کتنے ہی ایسے بہادر خیر خواہان قوم موجود تھے کہ اُن کے ثانی ہندوستان بھر میں مشکل سے ملتے ہیں - مسٹر راناڈے نے اُن سب کے خیالات حب الوطنی کی تار میں کھینچ دیئے - اور ان کے ساتھ مل کر وہ قومی خدمات کیں کہ جن سے پونا کی تاریخ میں اُن کے نام ہمیشہ روشن رہینگے - مسٹر ایم - بی نامجوشی کا کام صنعت و حرفت کی کانفرنس و نمایش و ایسوسی ایشن (سبھا) کے متعلق خصوصاً قابل عزت ہے - ان کے علاوہ مسٹر گنیش واسدیو جوشی جو سرب جنک سبھا کی بنیاد رکھنے والے تھے - سیتا رام ہری چپ لونکار - راؤ بہادر وشنو بال کرشن سوہنی - راؤ بہادر وشنو مورلیشور بھیدے - راؤ بہادر چنتامن نارائن بھاٹ - انریبل پروفیسر گوکھلے اور شو رام ہری ساٹھے مسٹر راناڈے کے ساتھ کام کرنے والے تھے اور ان سب نے ملکر پونا کو مغربی ہندوستان میں نئی روشنی کا منبع بنا دیا +

پونا سے رخصت

ستمبر سنہ ۹۳ء میں کاشی ناتھ ترمبک تیلنگ جج ہائی کورٹ بمبئی ۴۲ سال کی عمر میں مر گئے - اُن کی بے وقت موت پر اُن کے ہموطنوں نے بڑا افسوس کیا - وہ مسٹر راناڈے کے بڑے دوست تھے - نومبر سنہ ۹۳ء میں مسٹر راناڈے مسٹر تیلنگ کی جگہ بمبئی ہائی کورٹ کے

جج مقرر کئے گئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید ان کو یہ عہدہ نہ ملے مگر وہ ہندوستانی جوڈیشل افسروں میں سب سے لایق تھے۔ گورنر بمبئی اُن کو ہندوستانی ہونے کی وجہ سے جج ہائی کورٹ بنانا نہیں چاہتا تھا مگر وزیر ہند نے گورنر مذکور کی بات بالکل نہ مانی اور مسٹر رانا دے کو جج مقرر کر دیا۔ اگرچہ ان کی لیاقت اس پایہ کی تھی کہ نانا بھائی ہریداس کی جگہ ان کو مسٹر تیلنگ سے پیشتر جج ہائی کورٹ مقرر کرنا واجب تھا۔ مگر بمقابلہ اُن کے مسٹر تیلنگ کو یہ فوقیت حاصل تھی کہ مسٹر تیلنگ بمبئی میں رہتے تھے اور اُس عالیشان شہر کے بڑے بڑے معاملات ملکی اور مذہبی میں دلچسپی ظاہر کرتے تھے اپنا کاروبار وکالت بڑی لیاقت سے سرانجام دیتے تھے اور اعلےٰ درجہ کے فصیح البیان تھے۔ گو مسٹر رانا دے کی طرح وہ کسی امتحان میں اول نہیں رہے تھے۔ مگر لوگوں کی نظر میں ان کی قدر زیادہ تھی اور ہندوستان سے باہر بھی سنسکرت کی علمیت نے ان کا نام مشہور کر رکھا تھا۔ مسٹر رانا دے کی زندگی کا بہت سا حصہ اس وقت تک بمبئی سے باہر گذرا تھا۔ اور اگرچہ اُن کی گفتگو ہمیشہ بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ اور وہ اپنی علمیت اور غور کے زور سے ہر ایک مضمون پر ایسی روشنی ڈالتے تھے کہ سب لوگ ان کی تحریریں پڑھکر دنگ ہو جاتے تھے۔ لیکن بمبئی کی پبلک اور اخبارات اُن کی لیاقت اور خدمات سے کم واقف تھے اور چونکہ اِس وقت ان کے مداح سر ہانیکل ویسٹراپ صاحب چیف جسٹس کے عہدہ پر نہ تھے اس لئے کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مسٹر تیلنگ ان سے پیشتر ہائی کورٹ

کے جج مقرر ہوئے۔ افسوس کہ مسٹر تیلنگ کی عمر نے وفا نہ کی اور گورنمنٹ کو پھر ایک ہندوستانی جج مقرر کرنے کی ضرورت پڑی۔ اس وقت مسٹر رانا دے جج بنائے گئے اور اس وجہ سے نہ صرف بمبئی اور پونا میں بلکہ تمام ملک میں خوشی کے نعرے بلند ہوئے۔ سب طرف سے مبارکباد کے خط آنے لگے۔ ولایت سے ان انگریزی افسروں نے جو پنشن لیکر ہندوستان سے چلے گئے تھے ان کو مبارکباد کے خط لکھے۔ سر جیمس پیل نے ولایت سے لکھا کہ "میں آپ کی ترقی کی خبر سنکر بڑا خوش ہوا ہوں۔ مسٹر تیلنگ کی جگہ جج بنایا جانا بذاتہٖ بڑی عزت کی بات ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ آپ ہر طرح سے اس عزت کے مستحق سمجھے جائیں گے۔ میری رائے میں اُن خدمات کا جو آپ نے دکن کے زمینداروں کی مدد کے واسطے اور اس سے پیشتر انجام دی تھیں یہ ترقی ایک مناسب صلہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کئی سال اس معزز عہدہ پر کامیابی اور خوشحالی کے ساتھ کام کریں گے"۔

سر ریمنڈ ویسٹ نے جو شروع میں ہائی کورٹ بمبئی کے جج اور بعد میں گورنر کی کونسل کے ممبر تھے اپنے خط میں حسب ذیل الفاظ لکھے "میں آپ کو جج ہائی کورٹ بنائے جانے پر مبارکباد دیتا ہوں اگر میں اس وقت گورنر کی کونسل کا ممبر ہوتا تو ضرور آپ کی تقرری کی تجویز یا تائید کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ مسٹر تیلنگ کے لایق جانشین ہونگے اس عہدہ پر آپ اپنی گورنمنٹ اور لوگوں کی اچھی طرح سے خدمت کر سکتے ہیں۔ اگرچہ آپ پولیٹکل معاملات میں دخل نہیں دے سکتے لیکن یہ

اسے اعلےٰ عہدہ آپ کو اپنے ہموطنوں کی مذہبی۔ سوشل اور مالی حالت کے سدھارنے کا بڑا موقع دے گا۔ اور اس وجہ سے سرکار کی بھی بڑی عزت ہوگی۔ اس بات سے نوجوان طالب علموں اور چھوٹے درجہ کے جوڈیشل افسروں کو بڑی خوشی ہوگی کہ اعلےٰ لیاقت کی آخر کار ضرور قدر ہوتی ہے چاہے شروع میں اس کی بیقدری ہی کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ مسٹر تیلنگ کی اور آپ کی مثال سے یہ قطعی طور سے ثابت ہو جائے گا کہ ہائی کورٹ کے ہندوستانی جج بڑے لایق اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں"۔ امرت بازار پتر کا نے جو کلکتہ کا مشہور انگریزی اخبار ہے لکھا کہ یہ تعجب کی بات نہیں کہ سب فرقوں کے لوگ مسٹر رانا ڈے کی ترقی سے خوش ہوئے ہیں۔ مسٹر رانا ڈے کو نہ صرف بمبئی کے باشندے بلکہ تمام اہل ہند اپنا دوست سمجھتے ہیں +

انڈین مرر نے جو کلکتہ کا ایک معزز اور بارسوخ اخبار ہے لکھا کہ کہ مسٹر رانا ڈے کی لیاقت کا دوسرا آدمی تمام ہندوستان میں ملنا مشکل ہے۔ تمام ملک کے لوگ یک زبان ہو کر ان کی تعریف کرتے ہیں +

بمبئی کے انگریزی اور ہندوستانی اخباروں نے بھی بڑی خوشی ظاہر کی مگر پونا کی خوشی کا کچھ اندازہ نہ تھا۔ جو رونق۔ ملکی جوش اور دماغی تحریک آجکل پونا کو نصیب ہے اور جس کی وجہ سے پونا آجکل حب الوطنی کا مرکز مشہور ہے۔ اُسے پیدا کرنے میں مسٹر رانا ڈے نے معقول کام کیا تھا۔ وہ قریبًا ۲۲ سال پونا میں رہے۔ اور وہاں انہوں نے ایسا رسوخ حاصل کیا کہ اور کسی شخص کے لئے قطعی ناممکن ہے۔ اس

وجہ سے ان کی ترقی کا پونا کو بڑا فخر تھا۔ ان کی عزت کو پونا والے اپنی عزت سمجھتے تھے۔ اور جو خوشی صدق دل سے پونا نے مسٹر راناڈے کی اس ترقی پر منائی وہ کسی اور موقع پر دیکھنے میں نہیں آئی۔ اس خوشی کے اظہار میں جا بجا جلسے ہوئے۔ دعوتیں ہوئیں۔ اور آتشبازی چھوڑی گئی۔ پونا والوں کی دلی محبت سے مسٹر راناڈے کا دل بھر آیا۔ اور انہوں نے اس کے شکرانہ میں اپنی جیب سے ۲۵ ہزار روپیہ پونا کی مختلف تحریکوں کے لئے دان دیا۔

جج ہائی کورٹ

نومبر ۹۳ء میں مسٹر راناڈے ہائی کورٹ بمبئی کے جج بنائے گئے اور اس وقت سے آخری دم تک اس اعلےٰ عہدہ پر ممتاز رہے۔ وہ اپنی عادات کی درستی۔ وقت کی پابندی اور دماغی روشنی کی وجہ سے اپنا فرض منصبی پورا کرنے میں ایسے کامیاب ہوئے کہ انہوں نے نومبر ۹۳ء سے آخر ۱۹۰۰ء تک صرف ایک مہینہ کی رخصت لی۔ بطور جج ہائی کورٹ وہ بمبئی میں رہتے تھے اور جو روشنی اُن کی ذات پاک نے ۲۰-۲۲ سال تک پونا میں پھیلائی تھی وہی اب بمبئی پر پڑنے لگی۔ حیثیت جج وہ اپنا کام نہایت عمدگی سے کرتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی قانونی واقفیت بڑی وسیع تھی اُن کا مزاج متین اور دانشمندانہ تھا۔ وہ خود بڑے محنتی تھے۔ ہر یک سوال پر بلا رو رعایت غور کامل کرتے تھے اور ہر ایک مقدمہ کی شہادت اور معاملہ متنازعہ کے نشیب و فراز کا

خوب اندازہ کرتے تھے۔ وکالت پیشہ لوگ اُن کی خوش اخلاقی کی ہمیشہ تعریف کرتے تھے۔ یہ اُن لوگوں کی خوش قسمتی تھی۔ عموماً انگریزی اور ہندوستانی جج صاحبان خواہ وہ چھوٹے عہدے پہ ہوں یا بڑے پر۔ ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے۔ ہر ایک شخص سے خواہ وکیل ہو یا اہل مقدمہ بے پرواہی سے پیش آتے ہیں۔ قانون کی کتاب کا خریدنا تو درکنار وہ ان قانونی کتابوں کو جو سرکار کی طرف سے ان کے مطالعہ کے لئے دی جاتی ہیں کبھی اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ گو اُن کی قانونی واقفیت بہت کم ہوتی ہے مگر کیا مجال کہ کبھی اس بات کی خواہش یا کوشش کریں کہ ان کا علم زیادہ ہو جائے۔ وکیل بڑی محنت سے مقدمہ کی مسل دیکھتے ہیں اور بحث کے لئے تیار ہوتے ہیں مگر ہمارے عجوبہ روزگار جج صاحب دو چار منٹ میں ہی مقدمہ کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں اور اگر وکیل بحث کرتا رہے تو کہتے ہیں کہ وہ صرف اپنے موکل کو خوش کرنے کیلئے بن نزاعی کر رہا ہے۔ سرکار کی طرف سے حکم ہے کہ دس بجے سے ۴ بجے تک کام کرو مگر ہمارے منصف صاحب اور جج صاحب ۱۲ بجے آتے ہیں اور ۲ یا ۴ بجے بھاگ جاتے ہیں یا رات تک کچہری کرتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک ڈسٹرکٹ جج کو رات کے دس بجے تک اور ایک تحصیلدار کو رات کے بارہ بجے تک کچہری کرتے دیکھا ہے۔ مقدمات کرنے کے لئے سرکار اپنے افسروں کو کچہری کا مکان دیتی ہے مگر بعض افسر گھر پہ کچہری کرنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ باوجود ان بے قاعدگیوں کے ہمارے جوڈیشل افسران کی رعونت اور شیخی کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ مگر یہ رعونت

صرف ہندوستانی رعایا تک محدود ہے۔ انگریزوں کے ساتھ یہ سلوک
نہیں ہوتا۔ ان کے سامنے سب کی شیخی ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ خوش قسمتی
سے مسٹر راناڈے مختلف سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ وہ اپنے
فرض منصبی کو اس طرح بجا لاتے تھے کہ گویا خدا ان کے دائیں بائیں
بیٹھا ہوا اُن کے ہر ایک قول و فعل کو غور سے دیکھ رہا ہے۔ کسی اہل
مقدمہ کو گالی دینا یا وکیلوں کے سامنے اپنی لیاقت اور رسوخ کی شیخی
بگھارنا۔ قانون سے نفرت کرنا۔ وقت مقررہ کی پابندی نہ کرنا۔ اپنے
آرام اور نفع کو دوسروں کی آرام اور نفع پر ترجیح دینا ان کے لئے ناممکن
تھا۔ گورنمنٹ انگریزی کو بدنام کرنے والا اگر کوئی شخص ہے تو وہ ہے
کہ جو ایک بڑے عہدے پر ممتاز ہو کر رعایا کے ساتھ ناواجب سختی
کرتا ہے اور اپنی چند دن کی عزت کے گھمنڈ میں ان کی ہتک یا حق
تلفی روا رکھتا ہے۔ بمقابلہ ایسے افسروں کے مسٹر راناڈے کا طریق
عمل گورنمنٹ کو نیک نام کرنے والا تھا۔ جب ان کے سامنے کوئی
مقدمہ پیش ہوتا تھا تو ہر ایک شخص کو اس بات کی تسلی تھی کہ وہ امر متنازعہ
کا سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں گے۔ بہ حیثیت جج ہائی کورٹ انہوں نے
سیکڑوں مقدمات کا فیصلہ کیا اور اپنی لیاقت اور غور سے نکتہ چین
پبلک کو دنگ کیا مگر ان مقدمات کا ذکر کرنا یہاں ضروری نہیں۔ صرف
یہ کہہ دینا کافی ہے کہ اگر وہ دنیا میں اور کوئی کام نہ کرتے تو بہ حیثیت جج
ہائی کورٹ ہی وہ ایک معزز نام اپنے ملک کی تاریخ میں چھوڑ جاتے۔
مگر قدرت نے ان کے دماغ کو صرف قانونی نکتہ دانی کے لئے نہیں

بنایا تھا۔ جیسا کہ شہر پونا کے متعلق ذکر ہو چکا ہے۔ بمبئی میں بھی ان کی نیکنامی
صرف بہ حیثیت جج نہ تھی۔ بمقابلہ پونا کے یہاں ان کو زیادہ
فراخ دایرہ اپنی قوم کی خدمت کرنے کے لیئے ملا۔ یہاں حسب
معمول وہ اپنی قوم کی پولیٹیکل۔ مالی۔ تعلیمی۔ سوشل اور مذہبی ترقی کے لیئے
شب و روز کوشش کرتے تھے۔ اور خوش قسمتی سے پونا کی طرح بمبئی میں
بھی ان کو ایسے ایسے لایق مددگار ملے کہ جن کی بدولت بمبئی کا بول بالا
ہو گیا اور وہاں سب طرح کی ترقی نمایاں ہونے لگی؛

مسٹر راناڈے کی کل کوشش اس اصول پر مبنی تھی کہ جس طرح انسان
کی صحت کے لیئے اس بات کی ضرورت ہے کہ اس کا دل و دماغ ہاتھ پاؤں
ناک کان وغیرہ سب اعضا اچھی حالت میں ہوں اسی طرح قوم کی ترقی کیلیئے
یہ ضروری ہے کہ وہ پولیٹیکل۔ سوشل۔ دھارمک وغیرہ سب پہلوؤں
میں آگے بڑھے۔ معمولی طور پر جو لوگ دھارمک مضامین سے دلچسپی
رکھتے ہیں ان کا یہ مقولہ ہوتا ہے کہ بابا ہم کو دنیا کے جھگڑوں سے
کیا تعلق ہے ہم تو اپنے پرلوک کو سدھارینگے۔ جو لوگ سوشل ریفارم
چاہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم کو دھرم کے باریک مسایل سے کیا غرض ہے
ہم کو شادی غمی کے متعلق سیدھے سادے قاعدے بنا کر ان پر عمل
کرنا چاہیے۔ دھرم کے سوال نہ کبھی حل ہوئے ہیں نہ ہونگے اُن پر
تضیع اوقات سے کیا حاصل۔ پولیٹیکل ریفارمر اپنی دھن میں دھرم اور
سوشل ریفارم سے اپنے آپ کو دور رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔
ملک میں ٹیکس کم لگایا جاوے۔ یہاں کے لوگ اپنی ضروریات کے

لئے خود سب چیزیں بنائیں۔ اس ملک میں جو کوئلے اور لوہے کی کانیں ہیں ان کو اہل ملک کھولیں۔ اور ان سے فایدہ اٹھانا سیکھیں۔ ملک کی آمدنی و خرچ کا انتظام ہم لوگوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس طرح کے جھگڑے پولٹیکل ریفارمر کے دماغ میں سمائے رہتے ہیں جس سے کہ وہ دھرم کی باتوں کو بچپن کا کھیل سمجھنے لگتا ہے۔ اور ان کی طرف متوجہ ہونا تضییع اوقات خیال کرتا ہے۔ مسٹر رانا ڈے کو اس خیال سے بالکل اتفاق نہ تھا۔ ان کی رائے میں قوم کے لئے سب پہلوؤں میں ترقی کرنا ضروری تھا۔ اگر کسی انسان کا دماغ عمدہ ہو مگر اس کے ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں یا اس کو تپ دق ہو تو وہ اپنے دماغ سے بہت کم فایدہ اٹھا سکتا ہے۔ یا اگر اس کا جسم اچھا ہو مگر دماغ کمزور ہو تب بھی وہ کمال پر نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح قوم کے لئے دھارمک بننا سوشل برائیوں سے بچنا اور پولٹیکل تنزل سے اٹھنا یکساں ضروری ہے۔ اس لئے مسٹر رانا ڈے اپنی عقل اور ہمت ان سب پہلوؤں کو درست کرنے میں خرچ کرتے تھے +

سوشل ریفارم

مصیبت کے وقت میں کن باتوں نے ہندو جاتی کو بچایا

اس بات کو ہر ایک شخص جانتا ہے کہ ایک زمانہ سابق میں ہندوؤں

کی مالی۔ سوشل اور پولیٹیکل حالت بہت اچھی تھی۔ اور یہ اچھی حالت کئی صدیوں تک قایم رہی۔ اس تہذیب کا نشان اب بھی بالکل مٹا نہیں ہے مگر وہ اصول جن کی پیروی سے قوموں کو فتح اور ترقی حاصل ہوتی ہے۔ بودھ مت کے آغاز سے کچھ عرصہ پیشتر ہماری قوم کی نظروں سے غائب ہونے لگ گئے تھے۔ لوگ نفس پرست بیرحم۔ خودغرض اور بے علم ہو گئے اور اس وجہ سے ان کی سوشل اور دھارمک حالت بھی خراب ہو گئی۔ بودھ مت نے کچھ سدھار کیا مگر زوال کا بیج قوم کی بنیاد میں مضبوط جگہ پکڑ چکا تھا۔ آخر کار مسلمانوں نے آدبایا اور ان کے بعد ملک میں انگریزوں نے اپنا سکہ جما لیا۔ ہم حیران ہیں کہ بودھ مت کے زوال کے بعد انگریزوں کی حکومت قایم ہونے تک یعنے قریباً تیرہ سو سال تک اس ملک میں ہندو جاتی کا نشان کس طرح قایم رہا کیونکہ اس عرصہ میں ہماری قوم کا مددگار اور رہنما برا کوئی نہ تھا میری رائے میں ذات پات کی تمیز ہی نے ہندوؤں کو ہلاکت سے محفوظ رکھا۔ ذات کی تقسیم نے ہماری ترقی کو بہت کچھ روکا مگر اس میں بھی کچھ کلام نہیں کہ ایک ذات کی دوسری ذات سے کبھی مخالفت نہیں ہوئی۔ سب ذاتیں جدا جدا اپنا کام کرتی تھیں اور ایک دوسرے کے مقابلہ کا خیال ان کے دل میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنے اپنے کام میں سب لوگ مشغول رہتے تھے۔ اور اسی میں کمال حاصل کرتے تھے۔ گو ظاہرا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک ذات دوسری ذات سے علیحدہ ہونے کی

کی وجہ سے اس کو نفرت کرتی ہے مگر جو شخص تعصب سے بری ہے وہ جانتا ہے کہ ہندوؤں کی ذاتوں میں کوئی باہمی دشمنی نہیں تھی۔ برہمن کے دل میں یہ کبھی نہیں آتا تھا کہ میں کشتری بن جاؤں نہ ویش کشتری کو حسد کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ لوہار کے دل میں یہ خواہش پیدا نہیں ہوتی تھی کہ میں برہمن بن جاؤں۔ ممکن ہے کہ برہمن لوگ اپنی نخوت سے دوسروں کو ناراض کر دیتے ہوں۔ مگر جس حالت میں برہمنوں کا دماغ زیادہ نہ بگڑا تھا اُس وقت غالباً کوئی جگہ شکایت کی نہ تھی۔ ذات پات کے انتظام میں دولت کی تقسیم بہت ٹھیک تھی۔ کیونکہ اس کے سبب سے ایسی کوئی جماعت نہ تھی کہ جو بیکار ہو۔ ہر یک کے لئے کام موجود تھا۔ اِس لئے غریب لوگوں کی جو جدوجہد اور دہائی دوہائی آجکل مغربی ملکوں میں سنائی دیتی ہے وہ انگریزوں سے پہلے ہماری قوم میں کبھی موجود نہ تھی بیشک جدوجہد کی عدم موجودگی نے ہماری ترقی کو روکا مگر قوم کو موت سے بچالیا۔ سب ذاتیں ایک ہی شاستر کو مانتی تھیں اور ایک ہی دھارمک راستہ پر چلتی تھیں اس لئے غیروں کے مقابلہ میں وہ ہمیشہ آپس میں متفق رہیں۔ براہمن کشتری ویش شودر سب مسلمانوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے اور اپنی عزت اور دھرم کی رکشا کے واسطے ان کی مخالفت کرتے تھے مشترکہ ہندو خاندان نے ہندو جاتی کو قایم رکھنے میں بڑا کام کیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہر ایک خاندان کا رعب قایم رہتا تھا۔ کوئی آدمی بیکس اور اکیلا رہنے نہ پاتا تھا۔ اس کی مدد کے لئے اس کے سب رشتہ دار تیار رہتے تھے۔ کوئی شخص اپنے روپیہ کو اپنا نہیں سمجھتا تھا بلکہ کل خاندان

کا مال سمجھتا تھا - عورتیں بیوہ ہو جاتی تھیں بچے یتیم ہو جاتے تھے مگر چونکہ وہ مشترکہ خاندان کے جزو ہوتے تھے ان کو یتیم خانوں اور بیوہ آشرموں کی محبت اور دلچسپی سے خالی زندگی کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا - اور ساتھ ہی ہمارے بزرگوں کا طرز معاشرت سیدھا سادہ تھا - اُن کے خرچ اتنے نہ تھے کہ بیٹے پوتوں یا بھائی بہنوں کا اکٹھا رہنا کسی کو ناگوار گذرے. اس لئے قوم کے مرد اور عورت باوجود پولٹیکل غلامی کے بے عزتی اور بربادی سے بچے رہے - اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ ہوئی کہ ایک جگہ یا ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں جائیں - مذہبی قدامت پسندی نے ہندوؤں کو بزرگوں کے قاعدوں پر قایم رکھا - پولٹیکل تابعداری کے زمانہ میں رسم و رواج میں حسب ضرورت اور بسا اوقات نامناسب تبدیلی ہوئی مگر جہاں تک دھرم کا تعلق تھا غیر دھرم والوں سے ہندو دھرم والوں نے ہمیشہ پرہیز کیا - ہندو لوگ اپنی قدیمی تربیت کے مطابق دنیا کی ہر ایک چیز کو چھوڑنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے مگر اپنے دھرم پر وہ ایسے مضبوط تھے کہ کوئی طاقت ان کے خیالات کو بدل نہ سکتی تھی - دراصل ہمارے بزرگوں کو اپنے دھرم سے سچا پیار تھا دھرم ان کے لئے دکھاوے کی بات نہ تھی بلکہ دل کو صاف کرنے والا بھاؤ تھا - وہ اپنے سب مال کو پرماتما کا دان سمجھتے تھے اور پرماتما کو اپنا مددگار مان کر ہر ایک طرح کی تکلیف برداشت کرتے تھے. انہوں نے پولٹیکل غلامی کے زمانہ میں سب قسم کی سختیاں برداشت کیں مگر اپنے دھرم سے موںہ نہ موڑا + ذات کی تقسیم - خاندان مشترکہ اور مذہبی قدامت

پسندی کی نیک نیت انگریزی فارسی خواں نوجوان اس زمانہ میں بڑی
ہنسی اوڑاتے ہیں۔ یہ ایک فیشن ہوگیا ہے کہ جس قدر زیادہ نفرت
اُن سے کوئی شخص ظاہر کرے اسی قدر وہ زیادہ عقلمند اور آزاد
خیال سمجھا جاتا ہے۔ اُن کی رائے میں ذات کی تمیز نے ہندوؤں کو
برباد کر دیا۔ مشترکہ خانداں نے اُن کو کاہل اور غریب بنا دیا۔ قدامت
پسندی نے اُن کو تنگ دل اور توہمات کا غلام کر دیا۔ اُن کے
خیال میں اصلاح کا سب سے عمدہ اصول یہ ہے کہ ذات کی تقسیم کو
یک قلم دور کر دیا جائے۔ پولٹیکل اکانومی کے اصولوں کے مطابق خانداں
مشترکہ کا خاتمہ کر دیا جائے اور مذہبی قدامت پسندی کو چھوڑ کر جو کوئی کچھ
کہے بشرطیکہ وہ قدیم زمانہ کی تعلیم کے خلاف ہو اس پر عمل کیا جائے۔
سوال یہ ہے کہ اگر اُن کی یہ آرزو فوراً پوری ہو جائے تو کیا ہندو قوم
ابھی ترقی کے اعلےٰ معراج پر جا پہنچیگی اور کیا وہ قومیں جو ذات پات کی
پرواہ نہیں کرتیں لازمی طور پر ترقی یافتہ ہیں۔ مسلمان بھائیوں کیطرف
دیکھئے۔ ان کی مذہبی کتاب ذات پات کے تفریق کی اجازت نہیں
دیتی بلکہ سب انسانوں کو خدا کی نظر میں یکساں قرار دیتی ہے مگر کیا
کوئی منصف مزاج شخص کہہ سکتا ہے کہ سوشل معاملات میں مسلمانوں
کی حالت ہندوؤں سے بہتر ہے۔ اگر ذات پات کی تفریق ہندوؤں کے
تنزل کا باعث ہے تو کیا وجہ ہے کہ مسلمانوں نے بھی تنزل کا مُنہ
دیکھا۔ چھوٹی عمر کی شادی اُن میں رائج ہے۔ طرح طرح کے توہمات
مرد اور عورتوں کے دماغ پر سوار ہیں۔ ذاتیں نکالے جاتے ہیں۔

لڑکے لڑکیوں کو گنڈے تعویذ پہنائے جاتے ہیں۔ قبروں مزاروں اور خانقاہوں کی پرستش کی جاتی ہے۔ اور اسی قسم کی اور بہت سی رسوم قبیحہ اُن میں بھی موجود ہیں۔ شاید یہ کہا جائے کہ ہندوؤں کے پڑوس نے ہندوستان میں مسلمانوں کو خراب کر دیا۔ مگر سپین۔ مراکو اور مصر میں مسلمانوں کی سوشل حالت کو کس نے بگاڑا؟

علاوہ ازیں کیا انگریزوں میں جن کی موجودہ ترقی کی حالت کا ہندوؤں کی گری ہوئی حالت سے ناواجب مقابلہ کیا جاتا ہے۔ ذات کی تمیز موجود نہیں۔ کیا انگریز لوگ باوجود اعلےٰ تعلیم کے اچھے اچھے ہندوستانیوں کے ساتھ ریل کی ایک ہی گاڑی میں سفر کرنا گوارا کرتے ہیں۔ کیا انگریز لوگ یورپین اور ہندوستانی عیسائیوں کے ساتھ ویسی محبت سے سلوک کرتے ہیں جیسے کہ انگریزوں سے۔ کیا امریکہ کے مہذب باشندے تعلیم یافتہ حبشیوں سے نفرت نہیں کرتے۔ کیا ان کو اپنے ساتھ مدرسوں میں پڑھنے دیتے ہیں۔ اور ریلوں پر سوار ہونے دیتے ہیں۔ یہ سلوک غیروں کے ہی ساتھ نہیں۔ امیر اور اعلےٰ عہدہ دار انگریز چھوٹے درجہ کے انگریزوں کو اپنی سوسائیٹی۔ کلب یا ہوٹل میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ ڈپٹی کمشنر صاحب اپنے ہیڈ کلرک کے ساتھ کھانا نہیں کھاتے۔ ہمارے انصاف پسند ریفارمران سب باتوں کو جانتے ہیں۔ مگر انگریزوں کے رسم و رواج کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ اگر اُن کو نفرت ہے تو ہندوؤں کے طرز معاشرت سے۔ مشترکہ خاندان جس نے ہندوؤں کی عزت کو قایم رکھا

ہے اُن کی نظروں میں بڑا گنہگار انتظام ہے۔ یہ انتظام لوگوں کو کاہل بنا دیتا ہے +

ہم حیران ہیں کہ یہ کہانی ریفارمر صاحب نے کہاں سے سیکھی۔ کیا ایسا کوئی انسان ہے کہ اگر اس کو ٹھیک تربیت ملے تو وہ اپنی روزی کمانے کے لئے کوشش نہ کرے۔ کیا یہ خاندان مشترکہ کا قصور ہے کہ دنیا کی جد وجہد میں ایک خاندان کے مختلف شریک یکساں کامیاب نہیں ہوتے۔ اگر باپ نے غلطی سے ایک بیٹے کو تعلیم دیکر ڈاکٹر بنا دیا اور دوسرے بیٹے کو دوکاندار بنا دیا تو کیا اس دکاندار کو اس وجہ سے کہ اس کی آمدنی بمقابلہ ڈاکٹر کے کم ہے کاہل الوجود اور سست کہنا چاہئے۔ اور اس بات کا الزام مشترکہ خاندان کے ذمہ لگانا چاہئیے۔ کیا یہ دیکھنے میں نہیں آتا کہ باوجود کوشش کے بھی بہت سے آدمی بے روزگار رہتے ہیں۔ کیا ایسے شخص اپنے بھائی بھتیجوں کی مدد اور محبت کے مستحق نہیں۔ کیا اُن معصوم بچوں کے لیئے جو چھوٹی عمر میں یتیم ہو جائیں یہی مفید ہے کہ ان کو یتیم خانوں یا کورٹ آف وارڈس میں غیروں کے سپرد کیا جائے یا یہ کہ ان کے دادا یا چچا وغیرہ اُن کو اپنے خاندان کا تارا سمجھکر محبت سے اُن کی پرورش کریں۔ کیا اُن بیکس عورتوں کے لیئے جو بیوہ ہو جاتی ہیں اور دوبارہ شادی کرنا نہیں چاہتیں یہی بہتر ہے کہ غیروں کی نوکری کرکے اپنا گذارہ کریں یا یہ کہ اپنے بھائی بھتیجوں کے ساتھ رہیں اور ان کی مدد سے اپنی عزت قایم رکھیں۔ میرے تجربہ میں کئی ایک مثالیں ایسی آئی ہیں کہ ایک غریب شخص اپنی بیوی

بچوں کو چھوڑ کر مر گیا اور اُس کے غریب باپ اور بھائیوں نے اسکی
بیوی کو بڑی خاطر سے رکھا اور اس کے بچے کو ایسی محبت سے
پرورش کیا جیسے کہ دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ مگر نکتہ چیں لوگ
ہر ایک شریک خاندان کو جو بیروزگار ہو یا جس کی آمدنی دوسرے
سے کم ہو اُس خاندان میں رہنے کا مستحق نہیں سمجھتے۔ وہ بھولتے
ہیں کہ ایسے مرد اور عورتیں جن کی ظاہرا آمدنی کچھ نہیں ہوتی اپنی
محبت اور محنت سے اپنے خاندان کے کاروبار اور انتظام میں بڑی
مدد دیتی ہیں۔ ورنہ اگر ایسا نہیں ہے تو ہم کو اپنے بوڑھے ماں باپ
کو خیرباد کہہ دینا چاہئیے۔ ہم اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار
ہیں کہ انگریزی راج میں ہر ایک شخص کا خرچ اس قدر بڑھ گیا ہے
کہ وہ دوسروں کے خرچ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ہر ایک شخص کے
لئے اپنے بیٹے کو تعلیم دینا مشکل ہے وہ اپنے بھائی کے بیٹے کو
کس طرح تعلیم دے۔ وہ اپنا پیٹ مشکل سے پالتا ہے بھائی بہنوں
کا کہاں سے گذارہ کرے۔

آج کل اسی وجہ سے خود غرضی بڑھتی جاتی ہے۔ اس لئے گو
ہم اپنے آرام کے لئے سو روپیہ ماہوار خرچ کرنے پر تیار رہوں مگر
اپنے بھائی اور بھتیجے کا جن کی رگوں میں ہمارے والدین کا خون
ہے دس روپیہ ماہوار کا خرچ برداشت نہیں کر سکتے۔ اس خیال
کو روز بروز ترقی ہے مگر یہ کوئی خوشی کا مقام نہیں بلکہ افسوس کا
مقام ہے اور بجائے اس کے کہ ہم خاندان مشترکہ کو نفرت کی نگاہ

سے دیکھیں اور اس کو اپنی قوم کی بربادی کا باعث سمجھیں۔ ہم کو لازم
ہے کہ ہم اُن فایدوں کو جو ہماری سوسائٹی کو اُس سے حاصل ہوئے
ہیں ادب سے یاد کریں۔ مشترکہ رہنے سے ہر ایک خاندان کا خرچ کم
ہوتا ہے اور آپس میں محبت قایم رہتی ہے۔ نادانی اور ناتجربہ کاری
کی وجہ سے خاندانِ مشترکہ میں بعض اوقات بجائے خوشی کے رنج
پیدا ہوتا رہا ہے۔ مگر یہ بات تو ایک میاں بیوی میں اور باپ بیٹے میں
بھی ہو جاتی ہے۔ خاندان مشترکہ میں اگر ایک بھائی نیک نیتی سے محنت
کر کے دوسروں کی مدد کرے اور دوسرے اپنی کمائی اپنے پاس
رکھیں اور اُس بھائی کو ناحق دق کرتے رہیں تو بیشک وہ کسی مدد کے
مستحق معلوم نہیں ہوتے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ اس وقت سینکڑوں
خاندان اچھی طرح سے مشترکہ رہتے ہیں اور ایک سے زیادہ بھائی
اپنی کمائی کو مشترکہ جمع کر کے خوشی کے ساتھ اپنی اوقات بسر کرتے
ہیں۔ مشترکہ انتظام کا اصول انگریزی کلب اور ہوٹلوں کی تہ میں بھی
موجود ہے۔ اگر فرداً فرداً ہر ایک شخص اپنی رہایش اور کھانے پینے
کا علیحدہ انتظام کرے تو اس کو بہت روپیہ خرچ کرنا پڑے مگر کلب
اور ہوٹل میں چونکہ ایک ہی میزبان کے سب مہمان ہوتے ہیں رہایش
اور خورد نوش کا انتظام تھوڑے خرچ میں ہو جاتا ہے فرق یہ ہے
کہ انگریزی انتظام میں صرف روپیہ والوں کو یہ فایدہ ملتا ہے ہندوؤں
کے ہاں غریب امیر سب اُس سے فایدہ اُٹھاتے ہیں گو اُن میں سے
غریب بھی حتے الوسع اپنے خاندان کے لئے مفید بننے کی کوشش

کرتا ہے۔ مگر آجکل کی تہذیب میں غریب آدمی کسی شریفانہ سلوک کا مستحق نہیں۔ اسی لئے آجکل امیروں کے گھر میں غریب رشتہ داروں کو جگہ نہیں ملتی۔ اُن کے لئے شریفوں کے گھروں سے دور غریب خانے بنائے جاتے ہیں وہاں وہ چاہے زندہ رہیں یا مر جائیں ٭

خوشی کا مقام ہے کہ گو ہماری زندگی کا طرز آجکل مشترکہ خاندان کے خلاف ہے مگر جبلی خصلت ذرا مشکل سے تبدیل ہوتی ہے اور ہم ابھی تک اپنے غریب رشتہ داروں سے بہت بیزار نہیں ہوئے۔ بات یہ ہے کہ ایشیائی قومیں مشترکہ کاروبار کے اصول کو ہر ایک معاملہ میں پسند کرتی رہی ہیں اور یہ اصول ان کے رگ و ریشہ میں داخل ہو گیا ہے۔ شادی کے موقع پر برادری کے لوگ اور قریبی رشتہ دار حسب توفیق تنبول دیتے ہیں اور انتظام شادی میں مدد کرتے ہیں۔ ہر ایک شخص اپنی لڑکی اور اپنی بہن کی اولاد کی شادی میں معقول مدد دینے کو اپنا فرض سمجھتا ہے اور وہ بھی اُس کے ساتھ اس کے رنج و راحت میں شریک ہوتے ہیں۔ غمی کے موقع پر سب رشتہ دار رنج بٹانے کو آتے ہیں اور جب کسی کے گھر میں موت واقع ہوتی ہے اس کے دردِ دل کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ انتظام موجودہ تہذیب کی خود غرضی کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہے مگر انقلاب زمانہ نے ہمارے سب انتظام بگاڑ دیئے۔ جہالت اور افلاس نے جن میں ہماری قوم بہت عرصہ سے پھنسی ہوئی ہے ہمارے سب کام خراب کر دیئے۔ ہماری نالائقی کی وجہ سے ہمارے بزرگوں کے بنائے ہوئے

اچھے قاعدے بھی بدنام ہو رہے ہیں ۔

کوئی قوم زوال سے نہیں بچ سکتی

مگر ان قاعدوں پر لعنت کرنے والے لوگ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ عمدہ سے عمدہ قاعدے بھی کسی قوم کو ابدی ترقی نہیں دے سکتے۔ اور زوال سے نہیں بچا سکتے۔ کوئی قوم دو سو سال ترقی کرتی ہے کوئی قوم چار یا پانچسو سال ترقی کرتی ہے مگر آخر فنا آخر فنا۔ یونان اور روما کے بہادروں کے کارنامے اُن کی غیر معمولی حب الوطنی اُن کی سچی قربانی آجکل کم دیکھنے میں آتی ہے۔ مگر قدیم یونان اور روما کی تہذیب اب کہاں ہے۔ آجکل کی یونان اور اٹلی کا زمانہ گذشتہ کی یونان اور اٹلی سے کچھ تعلق نہیں۔ اکبر کے زمانہ میں جو عروج سلطنت مغلیہ کو ہندوستان میں نصیب ہوا اُس کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ آفتاب کبھی غروب ہوگا۔ اپنی بہادری اور دانائی سے فیضی۔ ابوالفضل۔ خان خاناں ٹوڈرمل۔ بیربل۔ مان سنگھ وغیرہ نے دربار اکبری کو بے مثال رونق دے رکھی تھی۔ مگر اب وہ سلطنت مغلیہ کہاں ہے۔ سپین کی اسلامیہ یونیورسٹی سے اور بغداد کی خلافت سے دنیا میں قابل قدر روشنی پھیلی اور پھر معدوم ہوگئی۔ یہ کونسے اصول اسلامیہ کا قصور تھا۔ میری رائے میں کسی اصول کا قصور نہیں۔ قصور اگر تھا تو حضرت انسان کا۔ کسی وقت انسان کا معراج بڑا اعلےٰ ہوتا ہے وہ ہر ایک قسم کی تکلیف برداشت کرتا ہے ہر ایک قسم کی خرابی سے پرہیز کرتا ہے۔ اسکی عقل درست ہوتی ہے۔ اور وہ ہر ایک ارادہ میں کامیاب ہوتا ہے کچھ عرصہ کے بعد انسان اس اعلیٰ

معراج کو برداشت نہیں کرسکتا اور اس کی فطرت گویا قدرتی طور پر اس بوجھ سے تھک کر آرام کرنا چاہتی ہے اور رفتہ رفتہ انسان ہر طرح کی خرابی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس وقت کرامول نے انگلستان کے نالایق بادشاہ چارلس اول کو شکست پر شکست دیکر اس کا سر کٹوایا۔ پیوری ٹن فرقہ کی حالت ایسی قابل تعریف تھی کہ خدا کے فرشتے بھی اُن کی داد دیتے ہونگے۔ تماشا گاہوں کو انہوں نے جلادیا۔ جن گرجاؤں میں بت پرستی ہوتی تھی ان میں سے بت پرستی کے نشانات توڑ دیئے۔ ظلم کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ کسی تکلیف سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اور ایسے بہادر تھے کہ کرامول کی فوج سے تمام یورپ ڈرتا تھا۔ کرامول کے مرنے کے بعد وہی انگریزی قوم جس میں پیوری ٹن لوگ پیدا کیئے تھے اپنی پارسائی سے ایسی تنگ آئی کہ بدچلنی کے سوا اس کو کچھ نہ سوجھا۔ چارلس دویم کی حکومت میں جو بدچلنی انگلستان میں موجود تھی اس کا حال ہر ایک تاریخ دان جانتا ہے ✦

آریہ قوم کی ترقی و تنزل

پنجاب میں گرو تیغ بہادر گرو گوبند سنگھ اور اُن کے جانشینوں اور ہمراہیوں کی جان نثاری اور بہادری خلوص دل اور دھارمک جوش نے ان پڑھ اور بزدل جاٹوں کو شیر نر بنادیا اور انہوں نے وہ وہ کارنامے کیئے کہ جب تک ہندو قوم کا نشان باقی ہے اُن سورماؤں کے نام ادب سے یاد کیئے جائیں گے۔ مگر وہ سچی بہادری اور ایشور بھگتی اب کہاں چلی گئی۔ یہی حال قدیم ہندو قوم کا ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکو

ویدک زمانہ کہئے یا اگر آپ اس لفظ کو استعمال نہ کرنا چاہیں تو کسی اور نام سے یاد کیجئے جبکہ آریہ جاتی ترقی کے معراج پر چڑھ رہی تھی۔ مرد اور عورت ہر ایک طرح کی ودیا حاصل کرتے تھے۔ اور بڑی عمر میں شادی کرتے تھے۔ شادی کرنا لازمی نہ تھا۔ مرد اور عورت کو شادی کرنے نہ کرنے کا اختیار تھا۔ برہمچریہ اور ودیا سے ان کے جسم اور دماغ کی خوب نشو و نما ہوتی تھی۔ اس لئے وہ اپنا دنیاوی کاروبار حوصلہ سے کرتے تھے اور توہمات سے بری تھے۔ بدھواؤں کو اختیار تھا کہ اگر چاہیں دوبارہ شادی کر لیں۔ اس لئے غیر ضروری تکلیف سے اس زمانہ میں عورتیں محفوظ تھیں۔ آریہ قوم نے فلسفہ اور سائینس اور دیگر علوم و فنون میں جو ترقی کی اس کے نشانات بہت کچھ مٹ چکے ہیں۔ جو باقی ہیں اُن سے بھی اس قوم کی اعلےٰ ترقی کا حال معلوم ہوتا ہے۔ جنگ میں آریہ لوگ بڑے بہادر تھے۔ جہاں جاتے تھے فتح ان کی ہمرکاب ہوتی تھی۔ رام اور لکشمن۔ ارجن اور بھیم کرشن اور کرن۔ درونا چاریہ اور بھیشم پتامہ کی بہادری کے قصے اب تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ انتظام زندگی کے واسطے جو مذکورہ بالا قاعدے رشیوں نے بنائے تھے انہوں نے کئی صدیوں تک آریہ قوم کا بول بالا رکھا۔ مگر آخر کار آریاؤں نے بھی اپنے معراج سے اترنا شروع کیا۔ ودیا پڑھنی چھوڑ دی۔ خود غرض اور بیرحم بن گئے کرم کانڈ اور قربانیوں کو سچائی رحمدلی اور انصاف پر ترجیح دینے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے اصلی باشندوں نے زور پکڑنا شروع کیا۔ غیر ملکوں

سے حملہ آوروں نے اگر اپنا تسلط کر لیا۔ آریہ قوم مجبور ہو گئی اور ان کو
خوش کرنے کی غرض سے اس نے ان غیر آریہ قوموں کے رسم و رواج
کی پابندی اختیار کی۔ رفتہ رفتہ چھوٹی عمر کی شادی کا رواج قایم ہو گیا۔
اور عورتوں کی تعلیم بند ہو گئی ؎

بُدھ دیو کا کام

اس زوال کے زمانہ میں بدھ دیو نے اپنی پُرجلال آواز بلند کی اور
آریہ قوم کی خود غرضی۔ بیرحمی اور اگیان کے برخلاف اپنی مثال اور تعلیم سے
وہ بغاوت شروع کی کہ جس نے خلقت کی آنکھیں کھول دیں۔ بہادر بزرگوں
کی اولاد۔ دھرم پر چلنے والے رشیوں کی سنتان اس راج رشی کی پردرد
آواز سن کر شرمندہ ہوئی۔ اور اپنی نادانی کی قایل ہو گئی۔ صرف معمولی درجہ
کے لوگ ہی اس نئی روشنی سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ بڑے بڑے
امیر اور راجے مہاراجاؤں نے بدھ دیو کے قدموں پر سر رکھا اور دنیا
کے لوبھ لالچ کو چھوڑ کر انصاف اور دیا کے راستہ پر چلنے لگے۔ گناہ کا
بوجھ کم ہوا۔ قوم خواب غفلت سے جاگی اور دنیا کی جدوجہد میں اس
صدق دلی اور بہادری سے مشغول ہوئی کہ ہاتھ سے گئی ہوئی بادشاہت
پھر قابو میں کر لی۔ ہندوستان میں بودھ مت کے عروج کا زمانہ آریہ
قوم کی بے مثال ترقی کا آخری دور تھا۔ راجہ جنک اور یدھشٹر کا ست
جگ راجہ اشوک کے وقت میں پھر واپس آگیا۔ کاش کہ انسانی ترقی
پایدار ہوتی۔ کاش کہ انسان کی فطرت میں زوال کے بیج موجود نہ ہوتے

اور راجہ اشوک کا زمانہ سدا ہندوستان میں قایم رہتا + دنیا کے رنج وراحت کی ناپایداری - انسان کی بیغرض کوشش کی ضرورت اور عظمت جو کوروکشیتر کے میدان میں کرشن مہاراج نے ارجن کو سکھائی تھی اشوک نے اپنی تمام رعایا کو سکھا دی اور اُن کی بہادری اور نیک اوصاف کو اعلےٰ درجہ پر پہنچا دیا - قریبًا دو ہزار برس کے بعد انگریزوں کی محنت سے اس راجہ رشی کے دیئے ہوئے حکم ملک کے مختلف حصوں میں میناروں اور پتھروں پر کھدے ہوئے ملتے ہیں - اشوک کے بعد بودھ مت کا چراغ کچھ عرصہ تک ٹمٹایا اور پھر ایسا بے رونق ہوا کہ کہیں بھی روشنی دکھائی نہیں پڑتی تھی - توہمات اور بت پرستی نے زور پکڑ لیا اور آخرکار بودھ مت کی اُجد ہانی ہندوستان سے غایب ہو گئی اور اُس کے غائب ہونے پر ہندو جاتی اس تیزی سے نیچے گری کہ مسلمانوں کا مقابلہ اُس کے لئے مشکل ہو گیا۔

مسلمانوں کی حکومت

اس نے بہتیرے زور مارے مگر پست حوصلہ اور آرام طلب - توہمات میں پھنسی ہوئی اور اندرونی نااتفاقی سے کمزور ہوئی قوم کو محمود غزنوی اور قطب الدین غوری کے سامنے سر جھکانا ہی پڑا اور قریبًا سات سو سال تک مسلمانوں کا طوق اطاعت اُس کی گردن میں پھنسا رہا مسلمان بادشاہوں نے ہندوؤں سے خوب ناک رگڑوائی - اُن کے مندر گرا لئے اُن کے زنار توڑے اور ان کے دیوی دیوتاؤں کی کمزوری کو اچھی طرح ثابت کر دیا - مگر جن اسباب سے ہماری قوم

آہستہ آہستہ بت پرست ہوگئی تھی اُن کو دور نہ کیا ۔ لوگوں کی تعلیم کا انتظام
مسلمانوں کی حکومت میں قطعی کچھ نہ تھا ۔ اور وہ دماغی اندھیرا جس نے
ہماری قوم کو پہلے سے بیہوش کر رکھا تھا مسلمانوں کے وقت میں بڑھتا
ہی گیا ۔ ہندوؤں میں دھارمک خیالات پست ہو گئے اور عورتوں کی
عزت کم ہوگئی ۔ مگر باوجود ان سب مصیبتوں کے پرماتما کو منظور نہ تھا
کہ یہ قوم صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے +

ہندو جاتی اپنے حسب و نسب کو کبھی نہیں بھولی ہے رانا پرتاب
گورو گوبند سنگھ اور سیواجی جیسے بہادروں نے ہندو جاتی کی روحانی
عظمت اور طاقت کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اس طرح ثابت کیا
جیسے کہ اٹلی میں میزینی اور گیری بالڈی نے اپنی حب الوطنی اور
قربانی سے اپنی قوم کو نیکنام کیا ہے ۔ جس دھارمک جوش نے
رانا پرتاب کو قبل از وقت خواب مرگ میں سلایا اُسی نے سیواجی
اور گورو گوبند سنگھ کے ہاتھوں سے سلطنت مغلیہ کو ایسا کمزور
کر دیا کہ اس کا پھر سنبھلنا مشکل ہو گیا ۔ اور آخر کار اُس کو انگریزوں
کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا ۔ انیسویں صدی کے شروع میں ہندو
جاتی اگرچہ نہایت کمزور اور پریشان حالت میں تھی مگر تمام ملک کے
لوگ ویدوں ۔ چھ شاستروں ۔ رامائن ۔ مہابھارت ۔ بھگوت گیتا ۔
اور منو کے دھرم شاستر کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ برہمن لوگ
باوجود بیحد مصیبت اور ذلالت کے زبان سنسکرت سے ناواقف نہوئے
تھے ۔ اور شادی غمی کے موقع پر سنسکرت کی منتر پڑھتے تھے ۔ گو قوم

توہمات میں پھنس رہی تھی مگر اپنے اصلی حسب ونسب کو نہ بھولی تھی۔ میں حیران ہوں کہ جس قوم نے باوجود اس بات کے کہ ابدی ترقی کسی کو اس دنیا میں نصیب نہیں۔ اتنے عرصے تک دنیا میں علم وہنر کا چراغ روشن رکھا۔ اور پھر اپنے زوال کے زمانہ میں بھی اپنی قدیمی بزرگی نہ بھلائی اس کے طریق معاشرت کے قاعدے کس طرح قابل نفرت ہو سکتے ہیں۔ ذات پات کی تقسیم اور خاندان مشترکہ نے ہندوجاتی کو زمانہ سابق میں اتنی مدد دی ہے کہ ہم کو ان کا ذکر بڑے ادب سے کرنا چاہئے۔ مسلمانوں کا طریق معاشرت ہندوؤں جیسا ہی تھا اس لئے اُن کی مثال نے ہم کو ذات کی تقسیم اور خاندان مشترکہ کو خیرباد کہنے پر مجبور نہیں کیا۔ انگریزوں کا طریق معاشرت ہندووں سے بالکل نرالا ہے۔ اس لئے اُن کی نقل اور موجودہ زمانہ کی ضروریات مذکورہ بالا قاعدوں کی پابندی کو مشکل بنا رہی ہیں مگر کوئی بھی وجہ نہیں کہ ہم پرانے قاعدوں کے جاری کرنے والوں کو نفرت سے یاد کریں۔ اور اُن کو خودغرضی کا نمونہ قرار دے کر اپنے آپ کو دنیا کا نجات دینے والا سمجھیں؂

ہندوجاتی کے نکتہ چین افسوس ہے کہ ہندووں کی موجودہ خراب حالت

دیکھ کر چند تعلیم یافتہ لوگوں کی طبیعت ایسی ہوگئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہندو کہلانا نہیں چاہتے اور اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اُن کو ہندو قوم کی تمام تاریخ شروع سے اب تک خودغرضی مکاری اور توہمات کا حال معلوم دیتی ہے ۔

مسٹر رانا ڈے کی ہندو جاتی سے محبت

کاش کہ ہندو جاتی کے یہ سپوت

جو صدق دل سے مسٹر رانا ڈے کی عزت کرتے ہیں اُن کی کتابوں کو غور سے پڑھتے اور اُس عشق سے جو مسٹر رانا ڈے کو ہندو دھرم اور جاتی سے تھا کچھ فیض حاصل کرتے۔ مسٹر رانا ڈے کو پرماتما نے وہ اندرونی روشنی دی تھی کہ جس کے ذریعہ سے وہ ہندوؤں کی حالت کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور بجائے اس کے کہ وہ ہندوؤں سے نفرت کریں اُن کی تاریخی تحقیقات نے ان کو ہندو جاتی کا سچا عاشق بنا دیا تھا۔ اُن کے لکچروں کو پڑھئے ان کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے اُن میں ہندو جاتی اور ملک ہندوستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ۱۸۹۳ء میں سوشل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں ہوا اس موقعہ پر اپنی تقریر میں مسٹر رانا ڈے نے فرمایا کہ" شاید آپ صاحبان میں سے بعض یہ کہیں اور اس مبارک ملک میں آپ کو یہ بات کہنے کے لئے کافی وجہ ہے کہ ہماری حالت واقعی نہایت خراب نہیں

میرا بھی یہی یقین ہے اور اسی سبب سے ہم سوشل ریفارم کے معاون امید کرتے ہیں کہ اگر ہم ہمت سے اور دل لگا کر کوشش کریں تو ہماری حالت ضرور بہتر ہو جائے گی۔ میں ان دو باتوں میں تہ دل سے یقین کرتا ہوں۔ اول یہ کہ ہمارا ملک سب سے اچھا ملک ہے دوئم یہ کہ ہماری ہندو قوم پرماتما کی برگزیدہ قوم ہے۔ اُس نے اس قدیم ملک کو اپنی برکتوں سے مالا مال کرنے میں بلا مطلب عمل نہیں کیا ہے۔ اس ملک کی گذشتہ تاریخ سے پرماتما کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آتا ہے۔ باقی سب ملکوں سے بہتر ہم کو ایسی تہذیب اور مذہبی اور سوشل قواعد ورثہ میں ملے ہیں جو ہزاروں برس کے عرصہ میں خود بخود ترقی کرتے رہے ہیں۔ گذشتہ زمانے میں ہم بلا کسی انقلاب یا اتفاقیہ تبدیلی کے آہستہ آہستہ دوسروں کے خیالات اپنی سوسائٹی میں جذب کرتے چلے آئے ہیں۔ بودھ مت نے ہندوستان میں سر اٹھایا۔ ہم نے اُس کے نیک اصول اختیار کر لئے اور اس کو فتح کر کے ملک سے نکال دیا۔ ہم مسلمانوں کے ظلم کے زمانہ سے بھی گذر آئے اور اُن کی حکومت میں جو سختیاں ہم کو برداشت کرنی پڑیں ان کی وجہ سے ہم زیادہ مضبوط ہو گئے اور آخرکار اس ظلم پر ہم نے فتح حاصل کی۔ بودھ مت کے اثر سے شودروں کی قدیمی غلامی کم ہو گئی۔ شودر لوگ ویش ہو گئے۔ براہمن لوگ فوجی افسر اور حکمران ملک بن گئے بہت سے کشتری براہمنوں جیسے عالم فاضل اور رہنما ہو گئے۔ اور ویشوں میں کئی آدمی دھرماتما اور سنت بن گئے۔ بودھ مت کے

پرچار کی بدولت ہماری قوم گوشت اور شراب سے سخت پرہیز کرنے
لگی اور اس کی سرشت میں رحمدلی کی بنیاد اس پختگی سے قائم ہوگئی کہ
اس کی نظیر کہیں دیکھنے میں نہیں آتی۔ ماں بہن اور بیٹی کے پاک
رشتہ کو ہماری قوم نے اپنی زندگی میں اس طرح قبول کیا کہ جس کا پہلے
خیال تک نہ تھا۔ مسلمانوں کے مذہب کے اثر سے ہمارے لوگ
خدا کی وحدانیت کو جس سے وہ مونہہ موڑ بیٹھے تھے پھر تسلیم کرنے
لگ گئے۔ جبکہ گذشتہ زمانہ میں خدا ہماری اس طرح رہنمائی کرتا
رہا ہے تو انگریزوں کے زمانہ میں جن کی تعلیم اور خیالات پہلے فاتحوں
سے بہتر ہیں ہم کو مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

سنہ ۹۲ء کی کانفرنس میں بھی ذیل کے الفاظ سے انہوں نے
اسی طرح ہندو جاتی کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ "اس بزرگ ملک کی گذشتہ
تاریخ بالکل بے معنی ہوتی اگر اس سے یہ امر ثابت نہ ہوتا کہ باہر کے
حملوں سے اس چیدہ قوم (ہندو قوم) نے ہمیشہ ایک خاص تربیت
حاصل کی ہے اور اس کے خیالات کا معراج اونچا ہوتا گیا ہے کم
سے کم اس کی قابلیت بڑھ گئی ہے۔ باہر کے حملوں سے ہماری قوم
کی ایسی حالت کبھی نہیں ہوئی کہ وہ آیندہ کبھی ترقی نہ کر سکے۔ بلکہ غیروں
کے سامنے کچھ عرصہ سر جھکا کر وہ ہمیشہ اپنا سر اونچا کرتی رہی ہے۔ اور
اُن کے مذہب۔ انتظام سوسائٹی اور تہذیب میں جو چیز اچھی تھی اس کو
اپنے خیالات میں جذب کرتی رہی ہے۔"

ویدک زمانہ

مسٹر راناڈے بڑے غور و مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ قدیم ہندوستان میں ایک ایسا زمانہ گذرا ہے جبکہ لوگوں کی حالت نہایت اچھی تھی اسکو وہ ویدک زمانہ کہتے تھے۔ اُس وقت آجکل کی سوشل خرابیاں موجود نہ تھیں عورتوں کی عزت کی جاتی تھی تعلیم حاصل کرنا انکے لئے بھی فرض تھا۔ ان میں سے بعض عالمانہ کتابیں لکھتی تھیں اور معرفت کے بھجن بناتی تھیں۔ ان کو اختیار تھا کہ شادی کریں یا نہ کریں۔ جو منتر شادی کے وقت پڑھے جاتے ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ عورت اپنے گھر کی مالک ہوتی تھی اور ایسی ہی آزاد تھی جیسے کہ اس کا خاوند۔ ستی ہونا لازمی نہ تھا۔ بلکہ ست جگ دواپر اور ترتیا میں جو کلجگ سے پیشتر کے زمانے تھے بیواؤں کو شادی کرنے کا بالکل اختیار تھا۔ چھوٹی عمر کی شادی کا کسی کو خیال نہ تھا بلکہ شادی کے لئے عورت کا جوان ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔ ذات پات کی تمیز ایسی سخت نہ تھی کہ اعلےٰ ذات کا شخص نیچی ذات میں شادی نہ کرسکے۔ تینوں اونچی ذاتیں ایک دوسرے کے ہاتھ سے کھانا کھانے سے پرہیز نہیں کرتی تھیں اور شودروں میں جو لوگ اچھے ہوتے تھے اُن کو کھانا پکانے کے لئے پسند کیا جاتا تھا۔ اُس وقت بھوت پریت کی پرستش کوئی نہیں کرتا تھا۔ غیر ملکوں میں جانے کی سب کو اجازت تھی بدھ مذہب والوں نے ہندوستان سے نکل کر جاوا اور سماٹرا کے جزیروں میں نئی

بستیاں آباد کیں اور اپنا مذہب جاری کیا۔ اُن کے بعد بودھ مت کے پرچارکوں نے باہر جاکر برہما۔ سیام۔ چین۔ جاپان اور تبت کے باشندوں کو اپنے دھرم میں شامل کیا۔ ہندوستان میں بھی آریاؤں نے قدیمی باشندوں کو اپنا دھرم سکھا کر اپنی قوم کا حصہ بنا لیا۔ اس زمانہ میں آریاؤں کی دماغی روحانی اور جسمانی طاقت اعلےٰ درجہ کی تھی۔

راماین اور مہابھارت۔ وید اور ویدانت۔ اوپنشد اور چھ درشن شاستر سے ہماری قوم کی روحانی اور دماغی ترقی کا اچھی طرح اندازہ لگتا ہے۔ بڑی عمر کی شادی اور صحت کے دیگر قواعد سے لوگوں کی جسمانی حالت بہت عمدہ تھی۔ مضبوط دماغ اور جسم لازمی طور پہ ہر شخص کا حوصلہ اور ہمت بڑھاتے ہیں۔ مہابھارت اور راماین سے معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ کا حال اُن میں لکھا ہے اس وقت آریا قوم بڑی بہادر تھی اور لڑائی کے ہتھیاروں کو بہت اچھی طرح استعمال کرتی تھی۔ اگرچہ بودھ مت کے پیشتر ہی آریہ قوم کی مذکورہ بالا حالت میں بہت کچھ فرق آگیا تھا مگر بودھ مت نے بہت عرصہ تک تنزل کے سلسلہ کو روکا اور ہندوستان کو پھر ترقی پر پہنچایا۔ بودھ مت کے زوال کے وقت ہماری قوم کے پاؤں ایسے اکھڑے کہ پھر ہوش نہ آیا۔

پورانک زمانہ

پورانک زمانہ شروع ہوگیا۔ ہندو دھرم میں بہت کچھ آمیزش

ہوگئی۔ بودھ مت اور جین مت کو ملک سے نکالنے کی غرض سے برہمنوں نے ملک کے اصلی باشندوں کو جن کو وہ پہلے نفرت سے شودر کہا کرتے تھے خوش کرنا شروع کیا اور اُن کے وحشیانہ رسم و رواج کو اپنی سوسائٹی اور دھرم میں داخل کر لیا۔ اُن کے دیوی دیوتاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ بدھ لوگوں اور جین لوگوں کی بت پرستی نے بھی ہندوؤں کو بت پرست بنا دیا۔ رفتہ رفتہ ذات پات کی تفریق زیادہ سخت ہوگئی۔ عورتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھنا بند ہوگیا۔ ستی کی رسم جو سب جاہل قوموں میں پائی جاتی ہے ہندوؤں میں بھی جاری ہوگئی۔ ایک خاوند کی کئی بیویاں اور ایک بیوی کے کئی خاوند ہونے کا رواج شروع ہوگیا۔ شادی کے معاملہ میں لڑکی کی پسند کی جگہ والدین کی پسند کو ترجیح ملنے لگی۔ شادی کرنے کی عمر بھی کم ہوگئی۔ برہمنوں نے اپنی طاقت قایم رکھنے کی غرض سے توہمات کو جائز بنا دیا اور قدیم شاستروں میں نئے نئے منتر داخل کر کے برہمچرج۔ بدھوا بواہ اور سمندر کا سفر کلجگ کے لئے نامناسب قرار دیدیا۔ ان وجوہات سے قوم ایسی کمزور ہوئی کہ مسلمانوں کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکی۔ مقابلہ کیا مگر شکست کھائی کیونکہ اچھے بہادر قومی زندگی میں سے نکل چکے تھے۔ مسلمانوں کے وقت میں چھوٹی عمر کی شادی اور پردہ کا رواج ہندوؤں میں زور پکڑ گیا۔ تعلیم کا نام نہ رہا اور جو تنزل کہ بودھ مت کے زوال کے ساتھ شروع ہوا تھا وہ کمال پر پہنچ گیا۔ اس پورانک زمانہ میں بھی قدیم آریہ تہذیب کی

روح بالکل نیست و نابود نہیں ہوئی۔ مسلمان بھی برہمنوں کے سچے دھرم
کی آگ کو نہ بجھا سکے۔ رانا پرتاپ۔ سیواجی اور گورو گوبند سنگھ نے ہندو
دھرم کی رکشا کے لئے وہ وہ قربانیاں کیں اور ایسی بہادری دکھائی
کہ دنیا میں ان کی نظیر کم ملتی ہے مگر بہ حیثیت مجموعی قوم کی حالت پورانک
زمانہ میں قابل رحم تھی وِدیا کی جگہ اودیا پھیل گئی۔ بہادری کی جگہ نسپت
ہمتی چھا گئی اور بمقابلہ زمانہ سابق کے اِس زمانہ کی وہی حالت تھی
جو عالیشان محلات کے مقابلہ میں کھنڈرات کی ہوتی ہے +

آجکل کے ہندو پورانک زمانہ کے قاعدوں پہ چلتے ہیں

ویدک زمانہ اور پورانک زمانہ کے فرق کو پرانے فیشن کے لوگ
بھی تسلیم کرتے ہیں مگر اصل میں وہ پورانک زمانہ کی پیروی کرتے ہیں
اور ویدک زمانہ کی عظمت سے ناواقف ہیں۔ تمام ملک میں راماین کی
کتھا ہوتی ہے۔ صوبہ متحدہ آگرہ اور اودھ میں بالخصوص تلسی داس کی
راماین خاص و عام کی زبان پہ ہے۔ اُس سے ہندوستان کی ترقی کے
زمانہ کا خوبصورت نظارہ بہت اچھی طرح دکھائی پڑتا ہے۔ اُس
زمانہ میں براہمن کشتری ویش سب ودیا حاصل کرتے تھے۔ وِدوان
براہمنوں کی راجہ لوگ بڑی عزت کرتے تھے سوئمبر کی رسم جاری تھی۔ مرد
اور عورت برہمچرج پر قایم تھے۔ چھوٹی عمر کی شادی کا اور پردہ کی رسم
کا نشان نہ تھا۔ سری رامچندر کی زندگی کی دلچسپ کہانی کو ہمارے
بیشمار مرد اور عورتیں سنتی ہیں اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کی تکلیف

سے رنجیدہ ہوتی ہیں مگر راجہ جنک کے خوشحال زمانہ کی رسم و رواج پر
کوئی غور نہیں کرتا۔ مسٹر راناڈے نے اپنی تحریر اور تقریر سے ویدک
اور پورانک زمانہ کے فرق کو اپنے

مسٹر راناڈے کا اُپدیش

ہموطنوں کے سامنے بہت اچھی طرح
ظاہر کیا۔ سوشل ریفارم پر جتنے لکچر انہوں نے دیئے اُن میں ویدک
زمانہ کی بزرگی اور پورانک زمانہ کی گری ہوئی حالت کا نقشہ خوب کھینچا
ہے۔ وہ اس بات کو اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ان کے ہندو
بھائی اپنے بزرگوں کی پیروی بڑی خوشی سے کرتے ہیں۔ اس لئے
وہ پرانے زمانے کی کتابوں کو پڑھکر ہندو جاتی کو ہمیشہ سمجھاتے رہے
کہ چھوٹی عمر کی شادی بدھوا بواہ کی ممانعت۔ عورتوں کا جہالت اور پردہ
میں رہنا۔ سمندر کے سفر کی ممانعت۔ کھانے پینے میں مختلف ذاتوں
کا ایک دوسرے سے پرہیز۔ ایک ذات کی مختلف شاخوں کا آپس میں
شادی نہ کرنا۔ ذاتوں کا ایک ایک کام کے لئے مخصوص ہونا۔ صرف
ایک ذات کو خیرات کا مستحق سمجھنا ایسی باتیں ہیں جو ہندوستان کی رونق
اور ترقی کے زمانہ میں بالکل موجود نہ تھیں اور جن کے لئے منو کا دھرم
شاستر کسی طرح ذمہ دار نہیں۔ یہ تبدیلیاں تنزل کے وقت میں ہمارے
بزرگوں نے غالباً نیک نیتی سے زمانہ سازی کی غرض سے کی ہونگی مگر
اُن کا نتیجہ اچھا نہیں ہوا۔ اس لئے جو شخص ان خرابیوں کو دور کرنا چاہتے
ہیں وہ ایسے رواج قایم کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستان کی ترقی کے زمانہ
میں موجود تھے۔ اُن پر یہ الزام نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ نئی نئی باتیں جاری

کر رہے ہیں کیونکہ وہ درحقیقت قدیم دھرم شاستر کی پیروی کرتے ہیں۔ انگریزوں کے راج میں مذکورہ بالا سب خرابیاں دور ہونگی اور ریفارم کرنے والا اس بات سے زیادہ خوش ہوتا ہے کہ اصلاح کے کام میں وہ نہ صرف قانون قدرت کی پیروی کرتا ہے بلکہ اُن طریقوں کو اختیار کرتا ہے۔ جن پر زمانہ سابق میں ہمارے باپ دادا چلتے تھے"

مسٹر راناڈے کا پکا بشواش تھا کہ اگر ہم موجودہ خراب رسموں کو چھوڑ دیں تو قدیم زمانہ کی طرح ہم پھر ترقی کے معراج پر پہنچ جائیں گے۔ اس لئے ان کی نظروں میں سوشل ریفارم حب الوطنی کا جزو اعظم تھا۔

سوشل ریفارم اور حب الوطنی

وہ اُن ریفارمروں میں سے نہ تھے جو پولیٹیکل جدوجہد کو بُری نگاہ سے دیکھتے ہیں اور رائے دیتے ہیں کہ اہل ہند کو صرف سوشل ریفارم پر سارا زور دینا چاہیئے اور پولیٹیکل ترقی کی خواہش کو کسی آیندہ زمانہ کے لئے ملتوی کرنا چاہیئے۔ ان کے علاوہ بعض محب قوم ایسے ہیں جو ہماری سوشل برائیوں کو ہماری پولیٹیکل تابعداری کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور جن کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ ہم کو سب کام چھوڑ کر سوراج حاصل کرنے کے لئے سخت کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر سوراج حاصل ہو گیا تو سوشل اصلاح لازمی طور پر خود بخود ہو جائے گی۔ مسٹر راناڈے کو ان خیالات سے بالکل اتفاق نہ تھا۔ ان کی یہ رائے تھی کہ ہر ایک سوسائٹی کی دھارمک سوشل اور پولیٹیکل حالتوں کا ایک دوسرے کے ساتھ مستقل تعلق ہے اور یہ بات ناممکن ہے کہ کسی قوم کی پولیٹیکل حالت خراب ہو اور سوشل حالت

اچھی ہو یا سوشل حالت خراب ہو اور پولیٹیکل حالت اچھی ہو۔ جو ایڈریس
مسٹر رانا ڈے نے سنہ ۱۹۰۰ء میں پراونشل سوشل کانفرنس ستارا میں پڑھا تھا
وہ اِس مضمون پر اُن کی رائے کو بخوبی ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ
"اگر کسی وقت میں کوئی شخص نیچے گرا ہوا ہے تو اس کے اوپر اٹھنے کے لئے
یہ لازمی ہے کہ وہ اپنے کل جسمانی۔ ذہنی اور اخلاقی زور کو استعمال کرے۔
آپ کا یہ خیال کرنا کہ انسان اپنی طاقت کے ایک پہلو کو نظر انداز کر کے دوسرے
پہلو میں ترقی کر سکتا ہے ایسا ہی فضول ہے جیسا کہ سورج کی گرمی کو اُس کی
روشنی سے اور گلاب کی خوبصورتی کو اس کی خوشبو سے علیحدہ کرنا۔ اگر آپ
کو پولیٹیکل حقوق حاصل نہیں ہیں تو آپ کا سوشل انتظام بھی اچھا نہیں ہو سکتا
اگر آپ کے سوشل قاعدے انصاف اور عقل پر مبنی نہیں ہیں تو آپ پولیٹکل
حقوق کو اچھی طرح استعمال کرنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ
کے مذہبی خیالات پست اور بودے ہیں تو آپ کا پولیٹیکل سوشل اور مالی
معاملات میں بھی کامیاب ہونا مشکل ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں
کا ایک دوسرے سے یہ تعلق اتفاقیہ نہیں بلکہ قانون قدرت پر مبنی ہے۔
ہمارے جسم کا یہی حال ہے۔ اگر آپ کے پیٹ کی حالت خراب ہے تو
آپ کے ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہونا مشکل ہے۔ اگر آنکھیں دکھتی ہیں تو
پیٹ کی بھوک بھی کم ہو جاتی ہے۔ اگر ہاتھ میں تکلیف ہے تو چلنے پھرنے
میں پاؤں بھی تکلیف مانتے ہیں۔ جو حالت انسان کے جسم کی ہے وہی
حالت انسانی سوسائٹی کی ہے۔ اِس لئے جو شخص پولیٹکل معاملات کو سوشل
معاملات سے علیحدہ کرتا ہے غلطی پر ہے اور جو شخص کہ ایک معاملہ میں

اپنا فرض پورا کرتا ہے اور دوسرے معاملہ میں اپنے فرض سے غفلت کرتا ہے وہ اپنے فرایض سے ٹھیک طور پر واقف نہیں۔ اس لئے یہ رائے درست نہیں کہ سوشل کانفرنس کو پولٹیکل کانگرس سے علیحدہ رکھنا چاہئے اور دوسرے مقام اور وقت پر اُس کا جلسہ کرنا چاہئے۔ علاوہ ازیں ایسا کوئی سوال نہیں جو بالخصوص پولٹیکل ہو اور اس کے مالی۔ سوشل اور دھارمک پہلو نہوں ہم کو کل معاملات میں ایک ہی سی پیش بندی ہمت۔ کوشش اور غور کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ کہنا ٹھیک نہیں کہ پولٹیکل معاملات میں ہمارا راستہ صاف ہے اور دوسرے معاملات میں صاف نہیں۔ جن دنوں میں ہم کانگرس میں بیٹھکر پولٹیکل معاملات پر غور کرتے ہیں ہمارے لئے مناسب ہے کہ ہم اپنے سوشل نقصوں پر بھی غور کریں کیونکہ اس وقت بے غرضی کا بہاؤ جوش پر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے کانگرس اور کانفرنس کا اجلاس ایک ہی جگہ ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ اگر میرا اختیار ہوتا تو میں ان قومی جلسوں کے ساتھ اور بھی کئی قسم کے کام شامل کرتا تاکہ یہ جلسے اپنے نام اور کام میں درحقیقت قومی بن جاویں"۔

جیساکہ اوپر بیان کیا گیا ہے مسٹر رانادے کے لئے سوشل ریفارم حب الوطنی کا جزو تھا۔ ان کا پختہ خیال تھا کہ جوں جوں ہماری سوشل حالت اچھی ہوگی ہم پولٹیکل آزادی کے لئے زیادہ قابل ہونگے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ تمام ہندوستان جہالت میں ڈوبا پڑا ہے۔ سرکار انگریزی کی سو سال کی کوشش کے بعد اب بھی مشکل سے دس فیصدی آدمی ایسے ہیں کہ جو لکھنا پڑھنا جانتے

ہوں۔ ان لوگوں کی تعداد جنہوں نے اعلےٰ تعلیم حاصل کی ہے نہایت تھوڑی ہے۔ اِس دس فیصدی میں وہ لوگ بھی لکھنے پڑھنے والوں میں شامل ہیں جو صرف اپنا نام لکھنا جانتے ہیں۔ عورتوں کی جہالت کا تو ٹھکانہ ہی نہیں۔ وہ نہ صرف آپ جاہل ہیں بلکہ ان کی جہالت باقی حصہ قوم کی ترقی میں بڑی سد راہ ہے۔ اس بیجد جہالت (داو دیا) کا نتیجہ یہ ہے کہ قریبًا ہم سب لوگ اعلےٰ صفات سے محروم ہیں۔ ہماری آمدنی بہت کم ہے۔ دو دو چار چار روپیہ ماہوار کی آمدنی والے ہزاروں آدمی ہیں۔ سرکاری نقشہ جات کے مطابق ایک باشندہ ہندوستان کی اوسط آمدنی ۲۷ روپیہ سالانہ ہے۔ اس اوسط میں کروڑپتی لاکھ پتی اور ۲ روز کے مزدور بھی شامل ہیں۔ اس کم آمدنی کی وجہ یہ ہے کہ جہالت نے ہم کو علم و فنون سے ناواقف کر رکھا ہے۔ اور پست ہمت کم حوصلہ اور کاہل الوجود بنا دیا ہے۔ اس جہالت کو دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام ملک میں سکول اور کالج کھول دیئے جائیں۔ اس ضرورت کو قوم کے خیرخواہان نے اچھی طرح محسوس کر لیا ہے اور اب آہستہ آہستہ سب طرف سکول اور کالج کھولے جا رہے ہیں مگر سکول اور کالج تب ہی مفید ہو سکتے ہیں جبکہ طالب علم خانہ داری کے فکر سے بری ہوں۔ آجکل یہ حال ہے کہ خاوند کالج میں پڑھتا ہے اور بیوی ساس کی خدمت کرتی ہے۔ بیچارہ خاوند اسی فکر میں گُھلا جاتا ہے اور اپنی تعلیم بڑی مشکل سے حاصل کرتا ہے علاوہ ازیں چونکہ والدین لڑکے کی شادی چھوٹی عمر میں کر کے بہت سا روپیہ اُسپر خرچ کر دیتے ہیں اُس کی تعلیم کے لئے اُن کے پاس بہت کم روپیہ بچتا

ہے اس لئے بسا اوقات روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے لڑکے کی تعلیم بند ہو
جاتی ہے۔ چھوٹی عمر کی شادی سے خاوند اور بیوی کی صحت بھی
خراب ہو جاتی ہے۔ اور ان کی تعلیم میں ہرج ہوتا ہے کیونکہ اعلےٰ
تعلیم حاصل کرنا آسان بات نہیں۔ دماغ اور آنکھوں پر طالب علمی کے
زمانہ میں بڑا زور پڑتا ہے۔ کمزور آدمی کے لئے سخت محنت کرنا بہت مشکل
ہے۔ ان تمام نقصوں کو مدنظر رکھکر قدیم زمانہ میں ہندوؤں کے بزرگوں
نے برہمچرج کا طریقہ قایم کیا تھا جس کے مطابق یہ لازمی تھا کہ مرد ۲۵ سال
کی عمر سے پیشتر شادی نہ کرے۔ قدیم زمانہ میں عورتیں بھی ودیا پڑھتی تھیں
اور بڑی عمر میں شادی کرتی تھیں۔ اس لئے موجودہ جہالت کو دور کرنے
کے لئے یہ ضروری ہے کہ چھوٹی عمر کی شادی کے خلاف کوشش کی جائے
اور لوگوں کو لگاتار سمجھایا جاوے کہ جب تک ہمارے ملک اور قوم میں
برہمچرج کا رواج پھر قایم نہ ہوگا ہمارے لڑکے لڑکیوں کا اعلےٰ تعلیم
حاصل کرنا ناممکن ہے ٭

مگر آجکل ہندوستان میں تعلیم کم درجہ کی ملتی ہے اور بہت سے علوم
یہاں سکھائے نہیں جاتے۔ اُن کے سیکھنے کے لئے ہندوستان سے
باہر یورپ اور امریکا یا جاپان جانا ضروری ہے۔ امتحان سول سروس۔
بیرسٹری۔ ڈاکٹری۔ انجینیری پاس کرنے کے واسطے اور شیشہ لوہا
چمڑا وغیرہ کی تجارت کے رموز سیکھنے کے واسطے دوسرے ملکوں میں
جانا لازمی ہے مگر ہم لوگ ایسے لکیر کے فقیر ہیں کہ سمندر پار جانے کو بڑا
گناہ سمجھتے ہیں اور جو شخص یورپ امریکہ سے واپس آتے ہیں ان کو

برادری سے خارج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پنجاب میں یہ مخالفت موجود نہیں مگر دوسرے صوبوں میں لوگوں کی زیادہ تعداد ولایت جانے کے خلاف ہے۔ اس لئے تعلیم کی ترقی کے لئے اس بات کے پرچار کی بھی ضرورت ہے کہ دوسرے ملکوں میں جانا بہت اچھا ہے اور ملک کے لئے نہایت مفید ہے۔ پولیٹیکل ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کے آرام میں جو ناجایز اور نامناسب رکاوٹیں ہیں ان کو دور کیا جائے۔ بدھوا بواہ کے نہ ہونے سے آجکل بیشمار بدھوائیں سخت تکلیف میں رہتی ہیں اُن کو کھانے کے لئے روٹی اور پہننے کے لئے کپڑا نہیں ملتا۔ مشترکہ خاندان ٹوٹتے جاتے ہیں اور بدھواؤں کی عزت کی حفاظت کے سامان آہستہ آہستہ غائب ہو رہے ہیں۔ اس لئے انکی تکلیف کو دور کرنا نہایت مناسب ہے کیونکہ جب ہماری قوم کی عورتیں مصیبت میں رہیں تو ہمارے مَردوں کی حالت کس طرح اچھی ہو سکتی ہے۔ جو نقص ہماری قوم میں موجود ہیں اُن کے ساتھ ذات پات کی بیحد تمیز نے ملک ہمارا سخت نقصان کیا ہے۔ عالم فاضل لوگ۔ سپاہی۔ تاجر اور خدمت گار لوگ ہر ملک میں ہوتے ہیں اور اپنے ہم پیشہ شخصوں کی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ رعایت کرتے ہیں مگر ہماری قوم میں ہم پیشہ لوگوں کی بیشمار شاخیں ہیں اور وہ ایک دوسرے سے اتنی ہی علیحدہ ہیں جتنے کہ کھتری بنیوں سے۔ اور براہمن کھتریوں سے۔ براہمنوں کی شاخیں سارسوت اور گوڑ آپس میں شادی نہیں کرتیں۔ کھتری بنیوں کے فرقوں کا بھی یہی حال ہے۔ کھتریوں میں سرین بنجاہی چوپڑے کپور۔ اڈھائی گھرے۔ کھنے۔ سرہندی۔ لاہوریے

پشاور ہیں سب اپنی جُدی جُدی کھچڑی پکاتے ہیں۔ ویشوں میں اگروال سرالیوں کا حقہ نہیں پیتے۔ ان تفرقوں نے نہایت نامناسب اختلاف پیدا کر رکھے ہیں اور لڑکے لڑکیوں کی شادی میں اُن کی وجہ سے بڑی دقتیں پیش آتی ہیں موجودہ حالت میں شادی کرنے کا دایرہ تنگ ہے۔ اگر کھتری کی کھتری سے۔ براہمن کی براہمن سے ویش کی ویش سے بلا لحاظ اندرونی فرقوں کے شادی ہو سکے تو ہر ایک شخص کو اپنے لڑکے لڑکی کی شادی میں بڑی سہولیت ہو۔ اس لئے اس امر کے پرچار کی بھی ضرورت ہے کہ ہندوؤں کی چار بڑی ذاتوں کی جدا جدا اندرونی شاخوں میں اتفاق ہو جائے اور اُن کے درمیان شادی جایز قرار دی جائے۔ مگر اس کے علاوہ اس غرض سے کہ جس قدر روپیہ ہمارے پاس ہے اُس سے ہم زیادہ فایدہ اُٹھائیں۔ ہم کو یہ بھی چاہئے کہ ہم اپنے روپیہ کو شادی غمی کے موقعوں پر احتیاط سے خرچ کریں اور کفایت کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں بہت سے ہندوؤں کا یہ قاعدہ ہے کہ دس دن کی واہ واہ کی خاطر لڑکے لڑکی کی شادی میں ہزارہا روپیہ خرچ کر دیتے ہیں اور پھر وہ اور ان کی اولاد افلاس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چونکہ ہماری قوم کا بہت بڑا حصہ اودیا کی وجہ سے کفایت شعاری اور حسن انتظام سے موصوف نہیں ہمارا یہ فرض ہے کہ فضول خرچی کے خراب نتایج سے اُن کو آگاہ کریں۔ ہماری سوسایٹی میں صرف تعلیم حاصل کرنا ہی ضروری نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ انگریزی تہذیب نے جو برائیاں ہمارے ملک میں داخل کر دی ہیں ان کو بھی دور کیا جائے۔ شراب نے جو بربادی لوگوں

کی گی ہے اس کا مفصل حال یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں اُس سے
جسم خراب ہوتا ہے دل اور دماغ کمزور ہو جاتے ہیں ہاضمہ بگڑ جاتا ہے
ہاتھ پاؤں کام کرنے سے جواب دیدیتے ہیں اور بہت جلد موت کا سامنا
کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سا بیش قیمت روپیہ جو بڑی مشکل
سے حاصل ہوتا ہے شراب نوشی میں صرف ہوتا ہے کیونکہ شرابی کو
ناچ رنگ کے بغیر زندگی کا لطف نہیں آتا۔ شراب نوشی اور ناچ میں جتنا
روپیہ خرچ کیا جائے اتنا ہی عیاش آدمی کو تھوڑا معلوم ہوتا ہے۔
اس لئے سوسائٹی کی بہبودی کے واسطے یہ بھی مناسب ہے کہ شراب
خوری اور ناچ سے جو نقصان ہوتے ہیں ان کو ظاہر کیا جائے۔ ان
باتوں کے سوا ہندو سوسائٹی میں یہ بھی بڑا نقص ہے کہ اگر کوئی شخص کسی
غلطی کی وجہ سے ہندو دھرم کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دھرم اختیار کرے
تو بعد میں اس کے لئے ہندو دھرم کا قبول کرنا ناممکن ہے۔ اگر کوئی ہندو
مسلمان ہو جائے یا عیسائی ہو جائے اور بعد میں اپنی غلطی پر پشیمان ہو کر
پھر ہندو سوسائٹی میں داخل ہونا چاہے تو اس کے رشتہ دار اس کو
واپس لینے سے انکار کرتے ہیں۔ اس لئے اب تک یہی ہوتا رہا ہے
کہ اگر ایک دفعہ کسی نے ہندو دھرم چھوڑ دیا تو اس کا ہمیشہ کے واسطے
ہندو دھرم اور ہندو سوسائٹی سے تعلق ٹوٹ گیا۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے
ہندوؤں کا پکا دشمن بن گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کی تعداد میں بہت کمی
ہو گئی۔ اس کمی کو روکنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی مسلمان یا عیسائی
ہندو دھرم اختیار کرنا چاہے تو اس کو خوشی سے ہندو بنا لیا جائے

چاہے وہ مسلمان یا عیسائی پہلے ہندو تھا یا جنم سے مسلمان یا عیسائی
تھا۔ اس تحریک کو شدھی کہتے ہیں۔ اِس طرح یہ امر ظاہر ہے کہ پولٹیکل حقوق
کا اچھا استعمال کرنے کے لئے یا پولٹیکل حقوق حاصل کرنے کے لئے ہماری
سوسائٹی کو ضرورت ہے کہ لڑکیوں کو تعلیم دی جائے۔ بدھوا بواہ کا رواج
شروع کیا جائے۔ بچپن کی شادی اور شراب خوری اور ناچ بند کئے جائیں
شادی غمی کے موقعوں پر فضول خرچی سے پرہیز کیا جائے۔ چاروں ذاتوں
کی مختلف شاخوں کے فرق کو کم کیا جائے۔ تجارت و تعلیم کے لئے سب کو
دوسرے ملکوں میں جانے کی اجازت ہو اور جو لوگ ہندو دھرم میں شامل
ہونا چاہتے ہیں اُن کو خوشی سے شامل کیا جائے۔ ۱۹۰۰ء کی کانفرنس میں
مسٹر رانا ڈے نے ان مختلف امور پر خوب بحث کی ہے۔ یہ کام سوشل ریفارم
میں داخل ہے۔ مگر اوپر ظاہر کیا گیا ہے کہ اس ریفارم کے بغیر ہماری پولٹیکل
ترقی مشکل ہے۔ اس لئے سوشل ریفارم اور پولٹیکل ریفارم کے کام کو
مسٹر رانا ڈے ایک دوسرے کا لازم ملزوم سمجھتے تھے اور ایک بڑے
محب قوم کے جوش اور محبت کی ساتھ سوشل ریفارم کے لئے کوشش
کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کی ترقی کے لئے سوشل ریفارم ویسا
ہی ضروری ہے جیسا کہ پولٹیکل ریفارم اور انڈسٹریل ریفارم اور جہاں تک
اُن سے ہو سکا انہوں نے سب پہلوؤں میں اپنی قوم کی خدمت کی۔
نیشنل کانگریس کے قائم ہونے سے دو سال بعد سوشل کانفرنس بھی قائم
کی گئی اور چونکہ نیشنل کانگریس میں ہندوستان کے بڑے بڑے امیر
اور لائق آدمی شامل ہوتے ہیں یہ ضروری سمجھا گیا کہ سوشل کانفرنس

کا اجلاس کانگریس کا کام ختم ہونے کے بعد اگلے روز اُسی جگہ ہو جہاں
کہ کانگریس کا جلسہ ہوا تھا" تاکہ سوشل کانفرنس میں ہندوستان کے برگزیدہ
آدمی آسانی سے شامل ہو سکیں۔ یہ سوشل کانفرنس ہندو جاتی کی اصلاح
کے واسطے قایم ہوئی تھی کیونکہ اہل اسلام اِن جلسوں میں بہت کم شریک ہوتے
تھے اور یہ نامناسب معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی شرکت کے بغیر ان کے
رسم و رواج پر کوئی رائے زنی کی جائے۔ اس لئے سوا اُس سپیچ کے
جو ١٨٩٩ء میں لکھنؤ کے مقام پر انہوں نے دی مسٹر راناڈے نے سوشل
کانفرنس میں اپنی سب تقریریں ہندوؤں کے رسم و رواج کے متعلق کیں
اور اہل اسلام کے طریق معاشرت پر نکتہ چینی سے پرہیز کیا۔ ہندو جاتی
مسٹر راناڈے کی نکتہ چینی محبت سے بھری ہوتی تھی پر وہ ہزار جان سے عاشق تھے
اُس کی قدیم رونق اور روشنی کے زمانہ سے ان کو کمال محبت تھی۔ اس
لئے جتنے لیکچر ہندو سوسایٹی کے متعلق انہوں نے سوشل کانفرنس میں
یا اس کے باہر دیئے ہیں اُن سے اُن کی حب الوطنی اور دانائی کا بڑا
ثبوت ملتا ہے۔ خدا نے ان کی تحریر اور تقریر کو وہ مٹھاس عطا کی تھی کہ کہیں
اور مشکل سے نظر آتی ہے۔ وہ نکتہ چینی کرتے تھے مگر کیا مجال کہ کسی
حریف کی ذات پر حملہ ہو۔ کیا مجال کہ ان کے الفاظ سے کسی کے دل پر
چوٹ لگے۔ چھوٹے چھوٹے آدمی جن کو سوشل ریفارمر ہونے کا دعوے
ہے پرانے فیشن کے ہندوؤں کو کیا کیا نفرت آمیز کلمے نہیں کہتے۔ اُن کے
بزرگوں اور قدیم شاستروں کو کیا کیا صلواتیں نہیں سناتے۔ مسٹر راناڈے

ہر ایک رسم و رواج کی تہ تک پہنچتے تھے اور اس کی اندرونی خوبی کو اس
لطف سے بیان کرتے تھے کہ ہر ایک شخص قدیم ہندوؤں کی دانائی کا
قایل ہو جاتا تھا اور ان کے قاعدوں کی تائید کرتا تھا۔ سوشل ریفارم
کی ضرورت ظاہر کرنے میں مسٹر راناڈے نے ہندوؤں کو مسلمانوں یا
عیسائیوں کے قاعدوں کی پیروی کرنے کے لئے نہیں کہا۔ تمام عمر وہ
ہندوؤں کو یہی کہتے رہے کہ موجودہ بگڑی ہوئی رسم و رواج کو چھوڑ کر
اپنے لایق بزرگوں کی پیروی کرو اور جن قاعدوں سے اُن کو رونق اور
کامیابی حاصل ہوئی تھی اُن پر کاربند ہو۔ جہاں کہیں اُن کو موقعہ ملا مسٹر
راناڈے نے ہندوؤں کے عروج اور ترقی کے زمانہ کی جس کو وہ
ویدک زمانہ کہتے تھے بہت اچھی تصویر کھینچی ہے۔ اور موجودہ ہندوؤں
کو یقین دلایا ہے کہ اپنی کمزوری کے زمانہ میں ہمارے بزرگوں نے
دفع الوقتی کی غرض سے کئی موقعوں پر اپنے سے زیادہ مضبوط
مگر جاہل قوموں کے رسم و رواج کو قبول کرکے اپنے عمدہ قاعدوں میں
خرابی داخل کر لی اور اپنے دیرپا تنزل کی بنیاد ڈال دی۔ اگر اُن خرابیوں
کو جو جہالت کی وجہ سے ہماری سوسایٹی میں داخل ہو گئی ہیں ہم دور
کر دیں اور ویدک زمانہ کے قاعدوں پر چلنے لگیں تو ہندو جاتی پھر اپنا
گذشتہ عروج حاصل کرے اور زمانہ حال کی روشنی سے مناسب فایدہ
اُٹھائے۔

جب سوشل کانفرنس جاتی سدھار کے واسطے قایم ہوئی
تو مسٹر راناڈے نے صاف ظاہر کر دیا کہ کانفرنس صرف ہندو جاتی کی

اصلاح کے لئے قایم ہوئی ہے۔ ۱۸۸۸ء میں سوشل کانفرنس الہ آباد میں ہوئی تھی وہاں مسٹر راناڈے نے اپنی رائے کا اظہار اس طرح پر کیا تھا۔ ہندو سوسائٹی اور اس کی مختلف ذاتوں اور ان کی جدا جدا شاخوں کی ایسی حالت ہے کہ ان سب کی اصلاح کے لئے نیشنل کانگرس کی طرح ایک سبھا کا بنانا ناممکن ہے۔ کانگرس میں لوگ اس حیثیت سے اکٹھے ہوتے ہیں کہ وہ ایک بادشاہ کی رعایا ہیں۔ ایک ہی طرح کے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ایک ہی قانون کے پابند ہیں۔ اور ان کو ایک ہی طرح کی تکلیفوں کی شکایت ہے۔ اس وجہ سے کانگرس میں بلا لحاظ مذہب و ملت ہندو مسلمان عیسائی اور پارسی سب شامل ہوتے ہیں۔ مگر سوشل معاملات میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کا بڑا اختلاف ہے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں کی بہت سی ذاتیں اور شاخیں ہیں۔ ایک صوبے کے رسم و رواج دوسرے صوبے کی رسم و رواج سے نہیں ملتے۔ کسی جگہ یہ رواج ہے کہ ایک مرد کئی عورتوں سے شادی کر سکتا ہے جیسا کہ بنگال کے کولین براہمنوں کا حال ہے۔ دوسری جگہ ایسا رواج موجود نہیں ہے۔ بدھواؤں کا مختلف ذاتوں میں یکساں حال نہیں۔ بچپن کی شادی کا رواج کہیں موجود ہے کہیں نہیں۔ سمندر پار جانے کی ایک صوبہ میں سخت ممانعت ہے۔ دوسرے صوبوں میں کوئی شخص غیر ملک میں جانے کو برا نہیں سمجھتا۔ ان اختلافات کے ظاہر کرنے سے میری یہ مراد نہیں ہے کہ ہندو جاتی کی سوشل حالت میں کوئی مشترکہ صورتیں نہیں ہیں۔ درحقیقت جیسے کہ کانگرس اپنے آپ کو قومی کانگرس کہنے کی مستحق ہے اسی طرح ایک پہلو سے یہ کانفرنس

بھی قومی کانفرنس کہلانے کی لایق ہے۔ اگرچہ اصلاح کی غرض سے ہماری موجودہ حالت میں اختلاف دکھائی پڑتا ہے لیکن ہماری گذشتہ تاریخ۔ ہمارا قدیمی مذہب۔ دھرم شاستر اور رسم و رواج سب ایک ہیں۔ اس وجہ سے ہم سب کے لیے یہ ممکن ہے کہ باوجود مقامی اختلافات کے ہم اکٹھے ہو کر آپس میں مشورہ کریں۔ ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ان اختلافات کو دور کرکے پرانے قاعدوں کی بگڑی ہوئی صورت کو سنواریں۔ کیونکہ اس بگاڑ نے ہمارے قدیمی دھرم اور بزرگوں کی اشرافت پر بڑا دھبا لگایا ہے۔ یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ جن سوشل برائیوں کی ہم آجکل شکایت کرتے ہیں وہ ہماری گذشتہ ترقی کے زمانہ میں موجود نہ تھیں۔ اس لئے جب ہم موجودہ برائیوں کے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں ہم پر یہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ ہم انگریزوں کے رسم و رواج کو اپنی سوسائٹی میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ درحقیقت ہمارا مدعا یہ ہے کہ اب ہم ایسے رسم و رواج جاری کریں جو آریہ قوم کی ترقی کے زمانہ میں ہماری سوسائٹی میں موجود تھے۔ سوشل کانفرنس کا یہ فرض ہے کہ اصلاح کا جو کام مختلف مقامات اور مختلف ذاتوں میں ہو رہا ہے اس کا حال سب لوگوں کو سنائے تاکہ ایک دوسرے کی مدد اور ہمدردی سے اُن بہادروں کا جو جداگانہ کوشش کر رہے ہیں حوصلہ اور ہمت بڑھے۔ ہر ایک شہر یا صوبہ کی سبھا کو اپنی خاص دقتوں کے رفع کرنے کے لئے آپ جدوجہد کرنی چاہئے۔ مگر ان کو یہ بتلانا ضروری ہے کہ کس اصول اور کن شرائط پر اور کس طریقے سے ان کو یہ کوشش کرنی چاہئے

یہ اصول اور طریقے مختلف سبھاؤں کے لئے مختلف نہیں ہیں۔ اور ان مشترکہ اصولوں اور طریقوں کا ظاہر کرنا سوشل کانفرنس کا کام ہے"

اصلاح کے طریقے

سنہ ۱۹۹۵ء کی کانفرنس میں مسٹر رانا ڈے نے اپنے خیالات اس مضمون پر ظاہر کئے ہیں کہ موجودہ سوشل برائیوں کو کس طریقہ سے دور کرنا چاہئیے۔ ان کی رائے میں اول طریقہ یہ ہے کہ قدیم شاستروں کے قاعدوں پر عمل کیا جائے۔ اور لوگوں کو بتلایا جائے کہ بچپن کی شادی بدھوا بواہ کی ممانعت۔ مختلف ذاتوں کا آپس میں کھانے پینے سے پرہیز وغیرہ خرابیاں پرانے شاستروں کے مطابق نہیں اور اس لئے اُن کو دور کرنا چاہئے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کو یہ بات بتائی جائے کہ فلاں کام اچھا ہے یا خراب ہے اور اُن سے اقرار لیا جائے کہ وہ خراب کام سے پرہیز کریں گے جیسا کہ شراب نوشی کے برخلاف پلیج یا اقرار لیا جاتا ہے +

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اصلاح کے لئے ہر ایک برادری قاعدے مقرر کرے اور جو شخص اُن قاعدوں کو توڑے اسپر جرمانہ کیا جائے یا اس کا حقہ پانی ناطہ رشتہ بند کیا جائے۔ جیسا کہ ویش کانفرنس اور کھتری کانفرنس کرتی ہے +

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ پرانی سوسائٹی سے علیحدہ ہو کر ایک نئی جماعت بنائی جائے اور اس کے سوشل انتظام کے لئے نئے قاعدے قواعد

مرتب کئے جائیں جیسا کہ براہمو سماج نے کیا ہے۔ اس طریقہ میں بھی کچھ فایدے اور کچھ نقصان ہیں مگر بمقابلہ فایدوں کے نقصان زیادہ ہیں۔ سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ سوسائٹی کی گذشتہ تاریخ سے اپنے رابطہ کا تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔

ریفارم کے ان سب طریقوں کا منشا ایک ہی ہے اور کانفرنس نے سوا چوتھے طریقہ کے باقی طریقوں کو قبول کر لیا ہے۔

کیا ریفارم کو ہندو سوسائٹی اور اُس کے قدیم زمانہ سے قطع تعلق کرنا چاہئے

جس چوتھے طریقہ کا اوپر ذکر ہوا ہے اس کے متعلق ۱۸۹۲ء کی کانفرنس میں مسٹر رانا ڈے نے اپنی رائے اس طرح بیان کی ہے "اگر کوئی شخص دیر پا ترقی کرنا چاہتا ہے تو اس کی ترقی ضرور آہستہ آہستہ ہوگی مگر بہت سے لوگ جن کی نیک نیتی پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ ہندو سوسائٹی کی بُری حالت سے ایسے تنگ ہیں کہ جوش میں آکر صدیوں کے کام کو دس برس میں پورا کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے جوش کو روکنا چاہئے۔ اس معاملہ میں سائنس کے مسئلہ ارتقا یا بکاش پر عمل کرنا نہایت مفید ہے۔ اس مسئلہ سے یہ نتیجہ حاصل ہوتا ہے کہ ہر ایک زندہ شے کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تمام اجزا کی ترقی ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک عضو کی پرورش ہو اور دوسرے کی پرورش نہ ہو۔ اس لئے ترقی کا سلسلہ ہمیشہ

دیر طلب ہوتا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں بہت سے صاحبان کا یہ خیال
ہے کہ ریفارمر کو ہمت کر کے ہندو سوسائٹی کے گذشتہ زمانہ سے قطع
تعلق کرنا چاہئے اور جو کچھ اُس کی عقل کے مطابق درست معلوم ہو اُس پر
عمل کرنا چاہئے۔ مگر یہ رائے ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ رائے قوم کی
پرانی عادتوں اور جذبات کو نظر انداز کرتی ہے۔ گذشتہ زمانہ اور زندگی
کی ندی ہمارے پاس سے ہمیشہ بہتی رہتی ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ
اُس کے بہاؤ کو کبھی اِدھر سے اور کبھی اُودھر سے تھوڑا سا پلٹ دیں اور
اس سے اپنے ملک کو سیراب کریں۔ یہ بات ناممکن ہے کہ ہم اس ندی
کو بالکل بند کر دیں یا اس کے راستہ کو بالکل بدل دیں۔ جوں جوں انسان
کا تجربہ بڑھتا جاتا ہے یہ رائے کہ ہمکو پُرانے زمانہ اور پُرانی سوسائٹی
سے قطع تعلق کرنا چاہئے غلط ثابت ہو رہی ہے۔ ہم پرانے زمانہ سے
قطع تعلق نہیں کر سکتے۔ اور نہ کرنا چاہئے کیونکہ ہماری سوسائٹی کا قدیم
زمانہ ہمارا بیش قیمت ورثہ ہے اور اس کے سبب سے ہم کو شرمندہ
ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی قوم کے قدیم زمانہ
کی عزت کریں مگر ساتھ ہی ہم کو چاہئے کہ اُن برائیوں کو جنہوں نے ہماری
سوسائٹی کو کمزور کر دیا ہے کوشش سے دور کریں۔ اس نیک ارادہ سے
وہ سب سبھائیں جن کے ممبر اس کانفرنس میں موجود ہیں کام کرتی ہیں۔ وہ
ہندو شاستروں کو نہایت ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ مگر وہ ان کے
اصلی مدعا کو مدنظر رکھتی ہیں اُن کی لکیر کی فقیر نہیں۔"
سنہ ۹۳ء کی سوشل کانفرنس میں بھی انہوں نے یہی رائے ظاہر کی تھی۔

اس موقع پر انہوں نے فرمایا کہ "ہم میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو آجکل ہندو سوسائٹی میں کوئی خوبی یا ترقی کا نشان دکھائی نہیں پڑتا۔ وہ صدق دل سے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہم کو اس گری ہوئی سوسائٹی سے علیحدہ ہوکر اپنی حفاظت کرنی چاہیئے۔ میں ۳۰ سال سے اس رائے کی مخالفت کرتا آیا ہوں اور جب تک میں زندہ ہوں اور میری زبان بول سکتی ہے میں اس غلط رائے کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ ہندو سوسائٹی تنزل اور غلاظت کا ڈھیر نہیں ہے۔ وہ بیشک قدامت پسند ہے مگر یہ قدامت پسندی ہی اُس کی مضبوطی کا باعث ہے۔ کسی قوم کو تاریخ میں مستقل جگہ نہیں مل سکتی اگر وہ اپنے مذہب۔ اخلاق۔ رواج اور سوشل انتظام کو فیشن کی طرح جلدی جلدی بدلتی رہے۔ مگر ہماری یہ قدامت پسندی ہم کو نئے خیالات کے جذب کرنے اور نئے طریق عمل کے اختیار کرنے سے نہیں روکتی"۔

۱۹۰۵ء کی کانفرنس میں انہوں نے اس مضمون پر مفصلہ ذیل خیالات ظاہر کئے تھے "پرانے خیالات کی پابندی ایک ایسی طاقت ہے جس کو ہم نہ بھول سکتے ہیں نہ نظرانداز کر سکتے ہیں۔ آپ کی گفتگو یا عمل سے چاہے یہ بات ظاہر ہوتی ہو کہ آپ اپنی مرضی سے کوئی عمل کر رہے ہیں مگر یہ بات ناممکن ہے کہ اپنی سوسائٹی کے قدیمی خیالات بیرونی حالات اور اپنی ماں کے دودھ کے اثر سے آپ بچ سکیں۔ یہ کہنا کہ سوشل ریفارم کی غرض سے ہم زمانہ قدیم کے خیالات کو خیرباد کہکر نئی بنیاد پر نئی سوسائٹی کی عمارت بنا سکتے ہیں ایسا ہی فضول ہے جیسا کہ یہ کہنا کہ ہم اپنے باپ

دادا کی مدد کے بغیر خود بخود پیدا ہو گئے ہیں ؞

بمبئی احاطہ میں سوشل ریفارم کا کام کئی طریقوں پر جاری ہے مگر اس احاطہ کے ریفارمروں کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ ہم پرانے فیشن کی ہندو سوسائٹی اور قدیم زمانہ کے خیالات سے قطع تعلق نہ کریں۔ ہم بنگال کے براہمو سماج کی طرح صرف دھارمک اصول پر اصلاح کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے احاطہ میں بھی سماجیں ہیں مگر ہمارے طبیعت میں کچھ ایسی خصوصیت ہے کہ جو ہم کو پرانی سوسائٹی سے قطع تعلق کرنے سے روکتی ہے۔ جو قابو ہم کو پرانی رسم و رواج اور خیالات پر حاصل ہے ہم اس کو ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ہم اصلاح کے کام میں اُن سے مدد لینا چاہتے ہیں۔ بعض کی رائے ہے کہ یہ طریق ہماری کمزوری کا باعث ہے۔ بعض کی رائے ہیں ریفارم پارٹی کا اس طریقہ سے زور بڑھتا ہے"

۱۸۹۵ء کی کانفرنس میں بھی انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ریفارم کے مددگاروں کا قدیمی سوسایٹی سے قطع تعلق کر کے اپنی اصلاح کی کوشش کرنا درست اصول پر مبنی نہیں کیونکہ یہ طریقہ کثیر التعداد لوگوں کی سوسائٹی میں مفید نہیں ہو سکتا۔ اُس سے صرف تھوڑے لوگوں کی اصلاح ہو سکتی ہے ؞

آپ پوچھیں گے کہ مسٹر راناڈے کو ہندو سوسائٹی کے قدیم زمانہ کی وکالت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جواب یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں میں بعض صاحبان ایسے ہیں جو ہر ایک بات میں بیٹر اور بال کا مقولہ پیش

کرتے ہیں۔ وہ خود ہندوستان کی قدیم تاریخ سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں
اور نہ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہر ایک قوم کے دل و دماغ کی بناوٹ
دوسری قوم سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ اگر ہندوؤں کو سوشل ریفارم کا
مشورہ دیتے ہیں تو یہ کہ یوروپین قوموں کے رسم و رواج کی پیروی کرو اور
سڑی ہوئی ہندو سوسائٹی سے قطع تعلق کرو۔ مسٹر راناڈے کو یہ مشورہ
بالکل پسند نہ تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ سوشل ریفارم کے معاملہ میں
ہم کو غیر ملکوں کی پیروی کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اپنی قوم کے قدیمی رسم و رواج
پر عمل کرنا چاہئے اور ہندو سوسائٹی کے اندر رہ کر اس کی اصلاح کی
کوشش کرنی چاہئے۔ ہندو جاتی کے مذکورہ بالا مشورہ دہندگان کی
طرح ایک پادری ڈوبائے نامی نے جو اٹھارویں صدی کے اخیر حصہ
میں صوبہ مدراس میں موجود تھا ہندوؤں کی خراب حالت دیکھکر یہ رائے
لکھی تھی کہ ان لوگوں کو قدیم زمانہ کی سب باتیں بھلا کر پہلے جہالت اور
دھریہ پن قبول کرنا چاہئے تاکہ پچھلے زمانہ کی تعلیم و تربیت کا نشان باقی
نہ رہے۔ اور پھر ان کو اپنا مذہب اور طریق معاشرت انگریزوں سے
سیکھنا چاہئے۔ پادری مذکور کی تردید میں مسٹر راناڈے نے ۱۸۹۵ء کی
کانفرنس میں فرمایا تھا کہ "اس رائے سے ہندوؤں کی قدیم تہذیب
کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوتی ہے۔ ہماری موجودہ بیماری کو دور
کرنے کا جو علاج پادری صاحب نے بیان کیا ہے وہ بیماری سے
بھی زیادہ خوفناک ہے۔ ہمکو اس بات کی ضرورت نہیں کہ اپنے قدیم زمانہ
کو بالکل بھلا دیں۔ کیونکہ وہ زمانہ ایسا تھا کہ تمام انسان اس کا حال سن کر

خوش ہوتے ہیں اور اس کی بزرگی اور رونق پر عش عش کرتے ہیں۔ ہم کو
ضرورت اس بات کی ہے کہ قومی کمزوری کے زمانہ میں ہماری تہذیب
نے اپنی حفاظت کے لئے جو میل جہالت اور توہمات سے کیا تھا
اُس میل کو توڑ دیں۔ اگر یہ میل ٹوٹ جائے تو ہندوؤں کی تہذیب
کو پھر وہی رونق حاصل ہوگی جو اس کو کلجگ سے پیشتر پہلے تین جگوں
میں حاصل تھی۔"

پانچواں طریق۔ اصلاح بذریعہ قانون

جاتی سدھار کا پانچواں طریق یہ ہے کہ قانون کی مدد سے کسی سوشل
خرابی کو دور کیا جائے جیسے کہ اول بدھوا بواہ کو جائز قرار دینے کے
لئے ایکٹ ۱۵ سنہ ۱۸۵۶ء بنایا گیا تھا۔ اور دوئم سنہ ۹۱ میں دفعہ ۳۷۵
تعزیرات ہند کی ترمیم کی گئی تھی جس کے رو سے خاوند کو اختیار نہیں
ہے کہ ۱۲ سال سے کم عمر بیوی کیساتھ ہم بستری کر سکے۔ مسٹر رانا ڈے
اس طریق اصلاح کے حق میں تھے مگر ان کی رائے یہ تھی کہ قانون کی
مدد اسی وقت مفید ہو سکتی ہے جبکہ اصلاح کے اور طریقے کارگر نہ ہوں
اس مضمون پر اُن کی نہایت معقول تحریر موجود ہے اس میں انہوں نے
مخالفین کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور اپنے خیالات بڑی
وضاحت سے ظاہر کئے ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ قانون کی مدد سے بھی
اصلاح کی جائے۔ گو ہر ایک شخص کو اُن کی رائے سے کلی اتفاق
نہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی رائے بڑی عزت کی مستحق ہے کیونکہ

وہ کسی مضمون پر جلدی سے رائے قایم نہیں کرتے تھے بلکہ اس کے نشیب و فراز پر کمال بے تعصبی سے غور کرکے اپنی راے بناتے تھے ؎

۱۸۸۴ء میں مسٹر مالاباری نے جو احاطہ بمبئی میں ایک نامور پارسی اخبار نویس ہیں اس بات پر زور دیا تھا کہ چھوٹی عمر کی شادی کو بند کرنے کے لئے اور بدھوا بیواہ کو جاری کرنے کے لئے گورمنٹ کو قانون بنانا چاہئے۔ گورمنٹ نے ان کی یہ درخواست نامنظور کردی کیونکہ گورمنٹ کی راے میں ہر ایک ریفارم لوگوں کی تعلیم و تربیت کی مدد سے ہونا چاہئے اور جبتک کہ کوئی سوشل خرابی ایسی خوفناک نہ ہو کہ اس کی وجہ سے لوگ جرم کے مرتکب ہوتے ہیں گورمنٹ کو لوگوں کے رسم و رواج میں دست اندازی کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے؎

تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی بہت سے ایسے تھے جن کو مسٹر مالاباری کی تجویز سے اتفاق نہ تھا۔ اس وجہ سے مسٹر رانادے نے مسٹر مالاباری کی تائید میں اپنے خیالات ظاہر کئے۔ مخالفین کا یہ خیال تھا کہ جوں جوں ملک میں تعلیم پھیلے گی۔ لوگوں کی عقل درست ہوگی اور وہ آہستہ آہستہ خراب رسموں کو چھوڑ دیں گے۔ گورمنٹ کی مدد سے کسی اصلاح کا جاری کرنا نہایت نامناسب ہے کیونکہ ایسی ترقی یا اصلاح جس کے لئے قوم اپنی تعلیم و تربیت سے تیار نہ ہو مفید یا دیرپا نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں حکام کا قدرتاً یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو ہمیشہ جابرانہ طور سے استعمال کرتے ہیں۔ ہندوستان میں تو حکام رعایا کے نفع

نقصان کی طرف یا ان کی عزت کی حفاظت کی طرف کم توجہ کرتے
ہیں۔ پولیس کے ظلم وستم کی کہانی کس نے نہیں سنی۔ تحصیلداروں کی
زبردستی کس نے نہیں دیکھی اس لئے سنجیدہ آدمی ہمیشہ گورمنٹ کی دست
اندازی کو بُری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ گورمنٹ نے کچھ عرصہ ہوا
قانون اراضی بنایا غرض یہ تھی کہ سادہ لوح زمینداروں کو چالاک
اور بے ایمان مہاجن فریب دیکر ان کی اراضیات نہ لے لیں۔ اس
ایکٹ پر اعتراض کرنے والے کہتے تھے کہ زمیندار جب تک سادہ
لوح رہیں گے اور اپنے دادوستد کو عقل سے کرنا نہ سیکھیں گے ان کو
فریب ضرور دیا جائے گا۔ اگر اس ایکٹ کی وجہ سے بنیوں کا دادستد
زمینداروں سے بند ہو گیا تو نادار یا بیوقوف اور فضول خرچ زمیندار
متمول اور چالاک زمینداروں سے قرض لیں گے اور ان کے فریب
میں ویسے ہی پھنسیں گے جیسے کہ پہلے بنیوں کے فریب میں پھنستے تھے
اگر گورمنٹ کا یہ منشا ہو کہ زمینداروں کو بنئے نہ لوٹیں اور چاہے کوئی
لوٹ لے تب تو بیشک اس ایکٹ کا منشا کسی حد تک ضرور پورا
ہو گا اگر بجائے اس کے منشا یہ تھا کہ کوئی شخص زمینداروں کی
بے وقوفی اور فضول خرچی سے فایدہ نہ اٹھائے تو ایکٹ مذکور
اپنے مدعا میں ضرور ناکامیاب ہو گا۔ کیونکہ جب تک گورمنٹ اس بات
کو روا رکھے گی کہ زراعت پیشہ لوگ جہالت میں ڈوبے رہیں اور
آٹھ وس روپیہ ماہوار پر فوجوں میں بھرتی ہونے کو بڑی عزت سمجھیں
تو کوئی طاقت کم سے کم کوئی ایکٹ ان کو چالاک آدمیوں کے

دھوکہ اور فریب سے نہیں بچا سکتا۔ اس لئے باوجود اس ایکٹ کی اجرا کے زمینداروں کی حالت ویسی ہی بے رونق ہے جیسی کہ پہلے تھی بہ مقابلہ اُس کے ضروری یہ تھا کہ گاؤں گاؤں میں تعلیم کی روشنی پھیلائی جائے۔ اس سے زمینداروں کی عقل سنورتی اور وہ دوسروں کے دھوکہ فریب سے بچنا سیکھتے۔ یہی حال اُس ایکٹ کا ہے جس کے ذریعہ سے ۱۲ سال سے چھوٹی عمر کی بیوی کے ساتھ خاوند کا ہمبستری کرنا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اصلاح کا مطلب یہ ہے کہ لوگ کسی خرابی سے پرہیز کریں۔ جہاں تک اصلاح کا تعلق ہے یہ ایکٹ بے سود ہے۔ بیوقوف لوگ یا نفس پرست لوگ اب بھی اس ایکٹ کی منشا کے برخلاف عمل کرتے ہیں مگر چونکہ حکام کے کانوں تک شکایت نہیں پہنچتی اس لئے کوئی تدارک نہیں ہو سکتا۔ مگر جن لوگوں کو کچھ عقل اور تمیز ہے وہ پہلے بھی اس قسم کی بیجا باتوں سے پرہیز کرتے تھے اور اب بھی بڑی عمر کی لڑکیوں کی شادی کا رواج قایم کر کے اس ایکٹ کے اصل منشاء کو پورا کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ ایکٹ مذکور کے ذریعہ سے اصلاح کے کام کو بہت کم نفع پہنچا ہے۔

ایسا ہی حال صفائی کا ہے۔ گورنمنٹ نے پلیگ کے معاملہ میں کیا کیا سختیاں نہیں کیں۔ لوگوں کو کیا کیا سزائیں نہیں دیں مگر باوجود ان سختیوں اور سزاؤں کے لوگوں کی عادات میں قطعی کچھ فرق نہیں آیا۔ جہاں چاہتے ہیں پیشاب پاخانہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور گلی کوچوں کو گندہ کرتے ہیں۔ پلیگ کے مریض سے کسی قسم کا پرہیز نہیں کرتے

اور اپنی بے پرواہی کی وجہ سے ہزاروں آدمی جان دیتے ہیں۔ در اصل بات یہ ہے کہ اب تک اُن کی تعلیم و تربیت ایسی رہی ہے کہ وہ صفائی کی قدر نہیں جانتے اور پلیگ سے بچنے کی جو موٹی موٹی ہدایتیں ہیں اُن کو نہیں سمجھتے۔ اُن کو آپ اچھے سے اچھا مکان رہنے کو دیدیں چند دن میں اس کو بھی گندہ کر دیں گے۔ پلیگ کا قانون لوگوں کی عادات کو بہتر کرنے سے قاصر رہا۔ گورنمنٹ نے بڑی جد وجہد کی آخر کار یہی مناسب سمجھا کہ اس معاملہ میں قانون کی دست اندازی کم کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ اور اس کے مشیر اب تک پلیگ کی ماہیت سے اچھی طرح واقف نہیں ہوسکے مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ ڈاکٹری اصولوں کی پابندی سے فایدہ اٹھانے کی کوشش عوام الناس نے بہت کم کی ہے۔ اس کا سبب لوگوں کی غربت بھی ہے اور ان کی جہالت بھی اس لئے جیسا کہ اور ملکوں میں اعلےٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا خیال ہے ہندوستان میں بھی زیادہ تعداد ایسے شخصوں کی ہے جو سوشل ریفارم کے معاملہ میں قانون کی مدد لینے کے خلاف ہیں۔ ان کی رائے یہ ہے کہ لوگوں میں تعلیم اور صحیح خیالات پھیلانے چاہئیں۔ سوشل ریفارم رفتہ رفتہ خود ہو جائے گی۔ مگر بہت سے برگزیدہ صاحبان جن میں مسٹر راناڈے شامل تھے ایسے بھی ہیں جو اصلاح کے کام میں گورنمنٹ سے مدد لینے کو برا نہیں سمجھتے۔ مسٹر راناڈے فرماتے ہیں کہ جو لوگ اس بات سے خوش ہیں کہ گورنمنٹ نے ستی کی رسم کو بند کیا اور جو چاہتے ہیں

کہ سرکار لازمی تعلیم ۔ لازمی ٹیکہ چیچک اور صفائی کے متعلق ہدایات جاری کرے وہ سوشل ریفارم کے کام میں قانون کی مداخلت سے نہیں ڈرتے ۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر ایک شخص کا خود مختار ہونا ضروری ہے بشرطیکہ اس کی خود مختاری دوسروں کی آزادی کو نقصان نہ پہنچائے ۔ مگر وہ اس بات کو بھی مناسب سمجھتے ہیں کہ جہاں کہیں بہت سے انسان ایسی تکلیف میں پھنسے ہوئے ہوں جسے وہ خود دور نہ کر سکیں تو گورنمنٹ کا فرض ہے کہ قانون بنا کر اُسے کم کرنے کی کوشش کرے ۔ بشرطیکہ قانون کی دست اندازی ایک جائز حد سے تجاوز نہ کرے اور اس سے خراب نتائج پیدا نہ ہوں ۔ گورنمنٹ تعلیم ۔ صفائی اور ڈاکخانے کا انتظام کرتی ہے اور تاجروں کو روپیہ دیکر نئی نئی جگہ ریل بنواتی ہے اور تجارت کو کئی طریقوں سے مدد دیتی ہے ۔ اسی طرح وہ قانون کی رو سے قرار دیتی ہے کہ فلاں عمر تک لڑکا لڑکی نابالغ ہوتے ہیں اور فلاں عمر میں ہر ایک شخص معاہدہ کرنے کی قابل ہوتا ہے ۔ اسی طرح گورنمنٹ کو قرار دینا چاہئے کہ فلاں عمر تک لڑکے یا لڑکی کی شادی نہیں ہو سکتی اور اسی طریقہ سے کم عمر بیواؤں کی تکلیف کا دور کرنا بھی گورنمنٹ کا فرض ہے "۔

گورنمنٹ کی دست اندازی کے خلاف ایک اعتراض یہ ہے کہ ہمارے رسم و رواج میں ایک غیر قوم کے حکام کی مداخلت نامناسب ہے ۔ مسٹر رانا ڈے اس اعتراض کو بڑا معقول سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر غیر قوم کے لوگ اپنی مرضی سے اور اپنی ہی خواہش سے

دست اندازی کریں تو یہ اعتراض لاجواب ہے۔ مگر سوشل معاملات
میں گورمنٹ کو خود بخود مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر انگریز
خود غرضی سے عمل کریں تو ہندوستان میں اُن کی قوم کا نفع اسی بات
میں ہے کہ ہم لوگ جیسے ہیں ویسے ہی رہیں۔ یعنے پست قد پست
حوصلہ اور ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہیں اور ہماری
بیوقوفی اور شرارت ہمارے سب کاموں کو بگاڑتی رہے۔
سوشل ریفارم کے معاملہ میں دراصل ہم اپنے نفع کے لئے گورمنٹ
کی مدد چاہتے ہیں۔ پارسیوں اور مدراس کے بنیر قوم کے لئے شادی
کے متعلق قانون بن گیا ہے اور اُن کو اس سے بڑا فائدہ ہوا ہے۔
اس ملک میں انگریزوں کی حکومت غالباً زیادہ عرصہ تک رہے گی
اگر ہم سوشل ریفارم میں گورمنٹ سے مدد نہ لیں اور ضروری معاملات
پر قانون نہ بنوائیں تو ہم بہت دیر تک اصلاح کے ایک زبردست
ذریعہ کو بند کرتے ہیں اور اس کے فایدہ سے محروم رہتے ہیں۔ مسٹر
راناڈے کی رائے تھی کہ ایسے معاملات میں غیر قوم اور اپنی قوم
والے حکام کی تمیز کرنا بے معنے ہے۔ یہ تمیز اُن باتوں میں کرنی چاہئے
جن سے غیروں کا فایدہ ہو۔ اور اپنا نقصان ہو۔ مگر ہمارے سوشل
ریفارم کے متعلق قانون بنانے سے گورمنٹ کا کوئی فایدہ نہیں
ایسے معاملات میں قانون کی تبدیلی ہماری درخواست پر ہوتی ہے
گورمنٹ کی خواہش سے نہیں ہوتی۔ کون نہیں جانتا کہ شراب کی
دُکانیں ہندوستان کو برباد کر رہی ہیں۔ اگر گورمنٹ یک قلم ان دُکانوں

کو بند کر دے تو گورنمنٹ کی آمدنی بہت کم ہو جائے مگر اہل ہند کی
اخلاقی اور جسمانی بربادی کا ایک زبردست راستہ بند ہو جائے۔ کیا
لوگوں کا اس میں فایدہ نہیں کہ گورنمنٹ ان دوکانوں کو بند کر دے۔
ایسے معاملہ میں گورنمنٹ یا قانون کی مدد کی درخواست کرنا سوشل ریفارم
کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ آپ سینکڑوں لیکچر شراب
نوشی کے خلاف دیتے ہیں ہزار شرابیوں میں سے ایک مشکل سے
آپ کی صلاح پر عمل کرتا ہے۔ گورنمنٹ اگر شراب کی دوکانیں ہمارے
ملک سے اٹھا دے تو دیکھئے کتنی جلد شراب نوشی کی کمی ہوتی ہے۔
گورنمنٹ یا قانون کی دست اندازی کو صرف اسی وجہ سے کہ وہ گورنمنٹ
اور قانون کی دست اندازی ہے معیوب سمجھنا دانائی میں شامل نہیں۔
ہر ایک معاملہ کا فیصلہ نفع نقصان کے پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ہونا
چاہئے۔ گورنمنٹ کی مدد کے خلاف ایک یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے
کہ سوسایٹی کی ترقی خود بخود اور آہستہ آہستہ ہو رہی ہے ہم کو غیر قوموں
کے خیالات کے مطابق یکدم اپنی سوسایٹی میں تبدیلی نہ کرنا چاہئے۔
مسٹر رانا ڈے فرماتے ہیں کہ اگر ریفارمر غیر قوموں کی نقل کرنا چاہے
تو اس کے برخلاف یہ اعتراض بیشک درست ہے مگر جو لوگ اس بات
کے حامی ہیں کہ چند سوشل برائیوں کو دور کرنے کی غرض سے نیا
قانون بنایا جائے وہ دراصل غیر قوموں کی نقل کرنا نہیں چاہتے
بلکہ اُس رواج کو دوبارہ جاری کرانا چاہتے ہیں جو ہندوستان کی ترقی
کے زمانہ میں موجود تھا۔ اور وہ خرابیاں دور کرانا چاہتے ہیں جو برخم

فاتحوں اور وحشیانہ اثروں کی وجہ سے ہماری سوسائٹی میں داخل ہوگئی ہیں۔ اس بات کو ہر ایک شخص جانتا ہے کہ جب جسم میں کوئی بیماری ہو جاتی ہے تو اس کو دور کرنے کے لئے وہی خوراک نہیں دی جاتی جو تندرستی کی حالت میں دیجاتی ہے۔ اگر جسم میں کوئی پھوڑا نکل آئے جس کی وجہ سے تکلیف زیادہ ہو تو جراح کے ہاتھ سے اس کو کاٹنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح سوشل خرابیوں کو کبھی کبھی قانون کی مدد سے دور کرنا چاہئے۔ ہندو سوسائٹی اب بھی دھرم شاستر کی پابند ہے۔ انگریزی عدالتیں دھرم شاستر کے مطابق ہندوؤں کے حقوق وراثت اور شادی کا فیصلہ کرتی ہیں۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ دھرم شاستر کے قاعدوں کے مطابق نیا قانون بنایا جائے اور موجودہ خرابیوں کو جو دھرم شاستر کے خلاف ہیں دور کیا جائے۔ مثلاً اگر یہ قانون بنایا جائے کہ کوئی شخص ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری عورت سے شادی نہ کرے۔ سوائے اُن حالتوں کے کہ جن کی منو کے دھرم شاستر میں اجازت ہے یا کہ لڑکی کی شادی ۱۲ سال کی عمر سے پہلے اور لڑکے کی شادی ۱۸ سال کی عمر سے پہلے نہ کی جائے تو کسی پر کوئی جبر نہ ہوگا۔ شاستروں کی یہ بھی ہدایت ہے کہ جب تک کسی مرد اور عورت کی ہم بستری نہ ہو چکی ہو تو مذکورہ بالا عمر سے پیشتر اُن کو شادی شدہ نہ سمجھنا چاہئے۔ اور اگر کوئی بیوہ شادی کرے تو پہلے خاوند کے ترکہ سے اس کو محروم نہ کرنا چاہئے۔ ان قاعدوں کے مطابق قانون بنانے سے ہندو جاتی کی عزت میں کوئی فرق نہیں

آسکتا کیونکہ ہر ایک ہندو دھرم شاستر کی پیروی کرنے کا دم بھرتا ہے ۔

آخری اعتراض یہ ہے کہ ہماری سوشل حالت ایسی خراب نہیں کہ ہم کو ریفارم کے کام میں قانون کی مدد کی ضرورت ہو ۔ بیشک مسٹر مالا باری نے نیک نیتی سے سوشل خرابیوں کے بیان میں کچھ مبالغہ کیا ہے تاہم بھی موجودہ خرابیاں اتنی کافی ہیں کہ قانون کی دست اندازی کی ضرورت ہے ۔ بچہ کشی اور ستی کے رواج کے متعلق بھی پہلے ایسے اعتراض ہوا کرتے تھے ۔ اگر ان کے خلاف قانون نہ بنایا جاتا تو اب تک یہ رواج جاری رہتے کیونکہ باوجود قانون کے اس زمانہ میں بھی جاہل لوگ کہیں کہیں عورتوں کو ستی ہونے میں مدد دیتے ہیں ۔ مسٹر رانا دے کی رائے کے مطابق ریاست میسور میں قانون بنایا گیا جس سے چھوٹی عمر کی شادی اور بڈھے مرد سے چھوٹی عمر کی لڑکی کی شادی بند کی گئی ۔ گائیکواڑ بڑودہ نے بھی اونچی ذاتوں میں بدھواؤں کی شادی کے لئے قانون بنا دیا ہے اور امید ہے کہ بچپن کی شادی کے خلاف بھی وہاں جلد قانون بنایا جائے گا ۔ ریاست نابھہ میں جہاں غالباً مسٹر رانا دے کی آواز نہیں پہنچی راجہ صاحب نے قانون بنایا ہے کہ کسی بارات میں ۱۲ یا ۱۳ آدمیوں سے زیادہ شامل نہ ہوں ۔ نابھہ میں جب کوئی بارات جاتی ہے تو سرکاری افسر باراتیوں کی تعداد کی پڑتال کرنے کے بعد ان کو شہر میں داخل ہونے دیتے ہیں ۔ گورنمنٹ ہند نے بچپن کی شادی اور بدھوا واہ کے متعلق قانون بنانے سے

انکار کردیا۔ مسٹر راناڈے کو گورنمنٹ کا عمل پسند نہ آیا مگر وہ بڑے عقلمند تھے وہ قانون کی مدد کو بہترین طریق اصلاح نہ سمجھتے تھے اور ان کو کافی امید تھی کہ جو روشنی آہستہ آہستہ ہمارے ملک میں پھیل رہی ہے وہ ضرور موجودہ خرابیوں کو دور کرے گی۔

چھٹا طریق۔ دھرم کی تبدیلی

مذکورہ بالا طریقوں کے علاوہ ایک طریق اصلاح مذہب کی تبدیلی بھی ہے۔ اس مضمون پر مسٹر راناڈے نے ۱۸۹۷ء کی کانفرنس میں بحث کی۔ آریہ پتر کا نے جو چھوالی آریہ سماج لاہور کا مستند اخبار ہے سوشل کانفرنس کے کام پر نکتہ چینی کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جب تک اہل ہنود آریہ سماج کا مذہب اختیار نہ کریں گے سوشل ریفارم میں کامیابی بہت مشکل ہے۔ اس کی رائے میں دھرم کی تبدیلی کے بغیر سوشل ریفارم کی امید کرنا سراسر غلطی ہے۔ اسی قسم کے خیالات براہمو سماج کے چند ممبروں نے بھی ظاہر کئے تھے۔ مسٹر راناڈے کو ان خیالات سے بالکل اتفاق نہ تھا کیونکہ دنیا کے مشاہدہ سے ثابت ہے کہ بہت سے لوگ مذہب بدل کر بھی اپنے قدیم سوشل قاعدوں کو نہیں چھوڑتے۔ ہندوستانی عیسائی اور بالخصوص وہ اشخاص جنہوں نے رومن کیتھلک مذہب اختیار کیا ہے اور مسلمانوں کے کئی فرقے اس بات کی ٹھیک مثال ہیں کہ ہندو دھرم کو چھوڑ کر جو لوگ مسلمان یا عیسائی بن جاتے ہیں وہ اکثر ہندوؤں کے رسم و رواج کو

ترک نہیں کرتے۔ مسلمان راجپوت بدھوا بواہ کے سخت خلاف ہیں۔
مدراس احاطہ میں بہت سے عیسائی چھوٹی ذات کے عیسائیوں سے
ناطہ نسبت نہیں کرتے۔ مسلمان راجپوت بھی اکثر غیر ذات کے مسلمانوں
سے شادی نہیں کرتے۔ بہت سے مسلمانوں میں جو پہلے ہندو تھے
بچپن کی شادی کا رواج موجود ہے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں
کہ دھرم کی تبدیلی سے رسم و رواج ضرور بہتر ہو جائیں گے۔ حقیقت
یہ ہے کہ جن لوگوں کی سوشل حالت خراب ہے وہ مذہب کی تبدیلی
سے فایدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس طریقہ میں یہ بھی دقت ہے کہ جب
تک دھرم کی تبدیلی نہ ہوگی سوشل ریفارم کو ملتوی کرنا پڑے گا۔
شاید صدیوں تک خلقت آریہ سماج اور براہمو سماج کے اصولوں
کو قبول نہ کرے۔ اس عرصہ میں اگر اصلاح کا کام جاری نہ کیا جائے
تو رسم و رواج زیادہ بگڑتے جائینگے اور قوم کو سخت نقصان پہنچیگا چونکہ
آجکل جو رسوم ہماری سوسائٹی میں رائج ہیں اُن میں بہت سی ایسی
ہیں جو ہندوؤں کی قدیم ترقی کے زمانہ میں جاری نہ تھیں۔ اور اس وقت
سے آہستہ آہستہ وہ رسم و رواج بگڑتے رہے ہیں یہ ممکن ہے کہ ہم مذہبی
بحث مباحثہ کی رنجشوں اور جھگڑوں سے بچ کر موجودہ سوشل برائیوں
کو رفتہ رفتہ چھوڑ دیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ سوشل کانفرنس
کیوں اپنا کام جاری نہ رکھے اور بلا لحاظ اس امر کے کہ ہم میں سے
کوئی آریہ سماج یا سناتن دھرم سبھا کا ممبر ہے ہم مشترکہ خرابیوں کے
دور کرنے کی کوشش نہ کریں۔ مسٹر رانا دے پرارتھنا سماج کے

ممبر تھے اور اُن کو براہمو سماج اور آریہ سماج کے ساتھ سچے دھرم کی تلاش
کے معاملہ میں پوری پوری ہمدردی تھی تاہم اپنی کل ذمہ واری کو سمجھ کر
انہوں نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ دھرم کی تبدیلی کے وقت تک سوشل
ریفارم کو ملتوی کرنا مناسب نہیں ٭

بدھوا بواہ

سب سے مشکل مضمون جس کا ہر ایک سوشل ریفارم کو مقابلہ کرنا پڑتا
ہے بدھوا بواہ کا مضمون ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ مسٹر رانا دے نے
اس مضمون پر بھی ایک دلچسپ بحث کی ہے اور پرانے ہندو شاستروں
کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ بدھوا بواہ کا رواج آریہ قوم کی ترقی کے
زمانہ میں موجود تھا۔ احاطہ بمبئی میں جس قدر کوشش بدھوا بواہ کے حق
میں ہوئی اس میں مسٹر رانا دے نے بڑا حصہ لیا اور تاریخی تحقیقات کی
مدد سے بدھوا بواہ کے خیرخواہوں کی عقلی دلیلوں کو مضبوط کر دیا۔
ہندوؤں کی گذشتہ ترقی کے زمانہ میں لڑکے لڑکیوں کی شادی بڑی
عمر میں ہوتی تھی اسی وجہ سے لوگ زیادہ عمر تک زندہ رہتے تھے۔ اگر
کوئی عورت بدھوا ہو جاتی تھی تو اس کو اختیار تھا کہ وہ دوبارہ شادی
کرے یا نہ کرے۔ کوئی اس کو مجبور نہ کر سکتا تھا کہ وہ ضرور مجرد رہے۔
مگر جب تنزل کا زمانہ شروع ہوا تو رفتہ رفتہ چھوٹی عمر کی شادی کا رواج
قایم ہو گیا۔ اولاد کمزور ہو گئی۔ اور چھوٹی عمر کی عورتیں بدھوا ہونے
لگیں۔ ترقی کے زمانہ میں عورتیں تعلیم حاصل کیا کرتی تھیں بدھوا ہونیکی

صورت میں اُن کا گیان اُن کی عزت اور حوصلہ کو قائم رکھتا تھا۔ تنزل کے زمانہ میں مردوں اور عورتوں کی تعلیم لازمی طور پر بند ہو گئی۔ اس انقلاب کے ساتھ بدھواؤں کی مصیبت اور تعداد کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ہماری قوم کی سیدھی سادی زندگی اور نفس کشی ہمیشہ سے مشہور ہے۔ اس نے ہندو بیواؤں کو پاک دامن رہنے اور دنیاوی آرام سے بے پرواہ ہونے میں بہت کچھ مدد دی۔ مگر افلاس اور اگیان بھی بڑے ظالم ہیں۔ انہوں نے بدھواؤں کی زندگی تلخ کر دی۔ رشتہ داروں کی خودغرضی ایسی بڑھ گئی کہ وہ بدھواؤں کے آرام سے غافل ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدھواؤں کی کثیر تعداد دنیا کی خوشی سے محروم رہ گئی۔

جو جو اخلاقی خرابیاں بدھوا بواہ نہ ہونے سے ملک میں موجود ہیں وہ ہر ایک شخص کو معلوم ہیں۔ بدھواؤں کی مصیبت نے پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر کے نرم دل پر ایسی چوٹ کی کہ انہوں نے اپنی تمام عمر اور دولت بدھوا بواہ کا رواج جاری کرنے میں خرچ کر دی۔ انہوں نے جو کوشش اور قربانی اس نیک کام میں کی وہ سب تعلیم یافتہ لوگوں پر روشن ہے تمام ملک میں سوشل ریفارم کے مددگار اور خیر خواہان ودیا ساگر کے نام کو بڑے ادب سے یاد کرتے ہیں۔ ان کی لاثانی کوشش کی دھوم احاطہ بمبئی تک پہنچی۔ بدھوا بواہ کی تائید میں جو کتاب انہوں نے تحریر کی تھی اس کو بمبئی اور مفصلات کے سرگرم نوجوانوں نے شوق سے پڑھا اور آخرکار ۱۸۶۶ء میں بمبئی کی بدھوا بواہ سبھا ایک سبھا قایم ہوئی۔ اس سبھا کے میر مجلس جام کھنڈ کے راجہ اور نایب میر مجلس راجہ رگھو ناتھ راؤ

رئیس ونچو رمقرر ہوئے۔ وشنو شاستری پنڈت اس کے سکرٹری بنائے گئے۔ اور شخصوں کے علاوہ مشہور معروف بال منگیش ولکلے کاشی ناتھ ترمبک تیلانگ۔ مہادیو گوبند رانا ڈے۔ جنار دھن سکھارام گیڈگل۔ گوپال راو ہری دیشکھ۔ بالاجی پنڈورنگ۔ شانتی رام نراین این ایم پرمانند۔ بی۔ ایچ بھاگوت۔ اے وی کانتھا والے اس سبھا کے ممبر تھے۔ یہ سب لوگ اپنی قوم کے سچے سیوک تھے۔ اور گو ان میں بہت سے مسٹر رانا ڈے کی طرح نوجوان تھے مگر انہوں نے بڑے ہو کر اپنے اپنے دایرے میں ایسے کار نمایاں کئے کہ بمبئی احاطے کی کایا پلٹ دی۔ بدھوا بواہ کی مخالفت ہندؤں میں مذہبی بنیاد پر قایم کی گئی ہے اس لئے اس ریفارم کا جاری کرنا بڑا مشکل ہے اسے جاری کرنے کے واسطے اس بات کی ضرورت ہے کہ شاستروں کے حوالے دیکر لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ بدھوا بواہ کی اجازت شاستروں میں موجود ہے۔ خوش قسمتی سے یہ کام ودیا ساگر نے شروع کیا تھا۔ وہ سنسکرت کے بڑے فاضل تھے۔ شاستروں کو بخوبی سمجھ سکتے تھے اور مختلف شاستروں میں جو کہیں کہیں اختلاف معلوم دیتا تھا اس کی اصلیت کو پہچانتے تھے۔ اور ساتھ ہی وہ ارادے کے ایسے پکے تھے کہ کسی قسم کی مشکلات سے ان کا حوصلہ پست نہ ہوتا تھا۔ بمبئی کی بدھوا بواہ سبھا کے سکرٹری وشنو شاستری پنڈت بھی اس کام کے لئے بہت موزون تھے۔ مسٹر رانا ڈے سے انہیں دلی محبت تھی۔ بدھوا بواہ کے کاج میں جو خدمات وشنو شاستری نے کیں اُن کی وجہ سے انہیں

احاطہ بمبئی کا ودیا ساگر کہا جاتا تھا۔ کیونکہ ان میں قریبًا وہی اوصاف موجود تھے جنسے ودیا ساگر کا نام نامی روشن ہے۔ وہ زبان سنسکرت اور انگریزی سے بخوبی واقف تھے۔ مخالفین کا جواب دینے کی غرض سے انہوں نے سنسکرت کی کتنی ہی کتابیں مطالعہ کیں۔ ودیا ساگر کی کتاب موسومہ بدھوا بواہ کا مرہٹی زبان میں ترجمہ کیا اور اس مضمون پر بیشمار چھوٹے چھوٹے رسالے لکھکر لوگوں میں تقسیم کیے۔ پبلک میں لیکچر دینا انہیں خوب آتا تھا۔ وہ ہمیشہ چلتے پھرتے لکھتے پڑھتے لیکچر دیتے نظر آتے تھے۔ بدھوا بواہ کے متعلق بحث کرنے کے لئے وہ ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ بڑے بڑے شہروں میں اشتہار دیکر بدھوا بواہ پر لیکچر دیتے تھے اور مخالفین کو مباحثہ کرنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ اخبار اندو پرکاش کے اڈیٹر تھے اور اس میں دل کھول کر بدھوا بواہ کی تائید کرتے تھے۔ چاہے کوئی کتنا ہی اُن کی مخالفت کیوں نہ کرے ان کی طبیعت نہ اوداس ہوتی تھی اور نہ ہراساں۔ ۱۸۶۹ء میں وشنوبا اناد فردار جو سنسکرت میں بڑا فاضل تھا بدھوا بواہ کے خلاف وشنو شاستری کی ساتھ مباحثہ کرنے کو تیار ہوا مگر مباحثہ کی شرائط ابھی طے نہ ہوئی تھیں کہ دفردار نے لوگوں کو اپنی طرف کرنے کی غرض سے بدھوا بواہ کے خلاف لیکچر دینے شروع کر دیئے۔ وشنو شاستری بھی غافل رہنے والے نہ تھے انہوں نے بدھوا بواہ کی تائید میں ایسی پرزور تقریریں شروع کردیں کہ لوگ ان کی لیاقت دیکھ کر حیران ہو گئے۔ مسٹر راناڈے اپنے صلاح مشورے سے وشنو شاستری کے کام کو ترتیب دیتے تھے۔

گو وہ خود شرمیلے تھے مگر بدھوا بواہ کی کامیابی کے لئے اپنے دوست کے جوش خروش کو غنیمت سمجھتے تھے اور اس کی مدد کے واسطے ہمیشہ تیار رہتے تھے - بدھوا بواہ کے جائز ہونے کی نسبت کافی بحث مباحثہ ہو چکا تھا - اب سب نے یہ مناسب سمجھا کہ کوئی بدھوا بواہ کیا جائے تاکہ لوگوں کا حوصلہ بڑھے - ومن راؤ اور نراین راؤ پار پنچئے دو بھائی تھے ان کی بہن وینی بائی بدھوا تھی - وہ اس کی شادی کرنے پر تیار ہو گئے اور ایک شخص پنڈ درنگ ونایک کرمارکر نامی نے وینی بائی سے شادی کرنی منظور کر لی - بدھوا بواہ سہایک سبھا نے اس شادی کا دن اور وقت مقرر کر دیا - اور بہت سے معزز شخصوں سے اس موقع پر تشریف لانے کی درخواست کی - جو دعوتی خط دوستوں کے نام جاری کیا گیا تھا اس پر مفصلہ ذیل ممبران سبھا کے دستخط تھے - (۱) وشنو پرشرام پنڈت (۲) گوپال ہری وشیکھ (۳) مہادیو گوبند رانادے (۴) وشنو مور یشور بھیدے (۵) وشنو پرشرام رانادے (۶) شری کرشن شاستری تالیکار (۷) جنار دھن سکھارام گیڈ گل - اس شادی کے لئے راؤ بہادر موروبا کنتوبا کا مکان جو بمبئی میں گوالیا تالاب کے پاس ہے آراستہ کیا گیا - پرانے فیشن کے لوگ یہ خبر سن کر کہ ایک بدھوا بواہ ہونے والا ہے آگ بگولا ہو گئے - انہوں نے وشنو شاستری کی پارٹی کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں اور یہ بھی کہا کہ ہم اندو پرکاش کے دفتر کو آگ لگا دیں گے - آخر کار انہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ بدھوا بواہ پر بحث کرنے کے لئے ایک جلسہ عام کیا جائے - اگر کثرت رائے سے

بدھوا بواہ جائز قرار دیا جائے تو شادی کی جائے ورنہ نہیں۔ مگر ریفارم پارٹی نے اُن کی کچھ پرواہ نہ کی اور اس بات کے انتظام کے بعد کہ شادی کے وقت فساد نہ ہو ۱۵ جون ۱۸۶۹ء کی شام کو یہ پہلا بدھوا بواہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس موقع پر بڑے بڑے ہندوستانی اور انگریز صاحبان موجود تھے۔ اور دوسرے شہروں سے بھی بہت آدمی آئے تھے۔ وشنو شاستری نے اور براہمنوں کے ساتھ مل کر شادی کے وقت اچاریہ (پروہت) کا کام کیا۔ دولہا اور دُولہن کے واسطے بدھوا بواہ کے مددگاروں نے بہت تحفے بھیجے۔ ان کی قیمت تین ہزار روپیہ دُلہن کے نام پر بنک میں جمع کی گئی۔ شادی کے بعد جب دشمنوں کا اور کچھ اختیار نہ چلا تو بے بس ہو کر دُلہن کے بھائیوں کو اور دعویٰ خط پر دستخط کرنے والوں کو جن میں مسٹر رانا ڈے بھی شامل تھے انہوں نے ذات سے خارج کر دیا۔ ریفارم پارٹی کی طرف سے یہ اشتہار دیا گیا کہ ذات سے خارج کرنے کا عمل بالکل بیہودہ ہے کیونکہ کسی نے یہ بات ثابت نہیں کی کہ دھرم شاستر کی رو سے بدھوا بواہ ناجائز ہے۔ اس شادی سے مسٹر رانا ڈے کے دوستوں کا حوصلہ دوبالا ہو گیا اور ان کے مخالفین غصہ سے بھر گئے۔ آخر کار دونوں فریق اس تجویز پر متفق ہوئے کہ شہر پونا میں بدھوا بواہ کے مضمون پر شاستر ارتھ (مباحثہ) کیا جائے۔ مسٹر رانا ڈے کو یقین کامل تھا کہ شاستر ارتھ میں چاہے فتح ہو یا شکست اس کے ذریعہ سے بدھوا بواہ کا پرچار بہت اچھی طرح ہو گا اس لئے وہ پونا کے مباحثہ کی آمد آمد

سے بہت خوش ہوئے - ہر ایک فریق کے پانچ پانچ پنچ مقرر ہوئے اور اُن پر ایک سرپنچ مقرر ہوا اس کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا صرف اس وقت اختیار تھا جبکہ فریقین کے پنچوں کی رائیں برابر ہوں - اس جلسہ کا میر مجلس سنکھیشورمٹ کا شنکراچاریہ تھا جس نے اس بات کا اعلان کردیا تھا کہ وہ کسی شخص سے جو بدھوا بواہ کے حق میں رائے دیگا بالکل ناراض نہ ہوگا - پنچوں کے نام ذیل میں درج ہیں :-

ریفارم پارٹی کے پنچ	مخالفین کے پنچ
۱- کرشنا شاستری چپ لونکار	۱- بھیکو شاستری گودبولے -
۲- راوجی شاستری اگاشے	۲- دنکر شاستری کھم بیلے -
۳- رگھوناتھ شاستری شیندے	۳- اپا شاستری کھلدیکار -
۴- کیشورام شاستری گیبڈگل	۴- بھیکاچاریہ اینا پوری -
۵- ویانکت شاستری ماتے -	۵- گنیش شاستری کوسٹ کار

سرپنچ گوپال چاریہ کرماڈگر

اس خیال سے کہ مباحثہ میں گڑبڑ نہ ہو سوال اور جواب کاغذ پر لکھے گئے - اور اس کاغذ پر سوال کرنے والوں اور جواب دینے والوں کے دستخط کرائے گئے - ۲۰ مارچ کو یہ بحث شروع ہوئی اور ۹ دن تک جاری رہی - بدھوا بواہ کے مددگار اپنے دعوے کی تائید میں ابھی اور ثبوت دینا چاہتے تھے مگر شنکراچاریہ نے بحث کو بند کرکے پنچوں سے کہا کہ اپنی رائے دو - ریفارم پارٹی کا ایک پنچ ویانکت شاستری دوسرے فریق سے مل گیا - اس طرح اس فریق کے حق میں چھ رائیں ہوگئیں - اور شنکراچاریہ

نے فیصلہ کر دیا کہ بدھوا بواہ کے مددگار ہار گئے۔ وشنو شاستری
اپنے پنچ کی بے ایمانی سے بڑا حیران ہوا کیونکہ اس پنچ نے خود ایک
بڑی عمدہ دلیل بدھوا بواہ کی تائید میں وشنو شاستری کو بتائی تھی۔
وشنو شاستری نے اُس شخص کو بڑی لعنت ملامت کی اس نے شرمندہ
ہوکر اقبال کیا کہ شنکر اچاریہ اور دوسرے فریق کے پنچوں نے جبراً
اس سے بدھوا بواہ کے خلاف رائے دینے کا اقرار لیا تھا۔ یہ بیان
اخبار میں شایع کیا گیا اور اس کے متعلق کئی ایک فوجداری مقدمات
ہوئے۔ چونکہ فیصلہ سے پہلے فریق ثانی کے پنچ ونکر شاستری نے کھلم
کھلا کہدیا تھا کہ میں بدھوا بواہ کے خلاف رائے دونگا اور روپانکت
شاستری کی رائے دراصل بدھوا بواہ کے حق میں تھی اس لئے ریفارم
پارٹی نے یہ قرار دیا کہ پنچوں کا فیصلہ درحقیقت بدھوا بواہ کے حق
میں ہے۔ اس مباحثہ میں مسٹر رانادے نے وشنو شاستری پنڈت
کی شاستروں کے مطالعہ میں بڑی مدد کی اور بدھوا بواہ کی تائید میں
اُن کو بہت سی دلایل سوجھائیں۔ ان دنوں میں بدھوا بواہ کے مضمون
پر بمبئی اور پونا میں بڑا غلغلہ مچ رہا تھا۔ اس کے متعلق جو مقدمات
فریقین کی طرف سے عدالت میں ایک دوسرے کے خلاف دایر
تھے انہوں نے بحث مباحثہ کی آگ کو خوب بھڑکا دیا۔ اس وقت
مسٹر رانادے نے ویدوں اور پرانوں کے حوالجات جمع کر کے ایک
چھوٹی سی کتاب لکھی اور ثابت کیا کہ ہندوؤں کی اعلےٰ ترقی کے زمانہ
میں جس کو ویدک زمانہ کہتے ہیں بدھوا بواہ کی اجازت تھی۔ مسٹر رانادے

نے یہ بھی ظاہر کیا کہ جن شاستروں نے بدھوا بواہ کی مخالفت کی ہے
انکا منشا یہ ہے کہ بدھوائیں ناجایز تعلق پیدا نہ کریں۔ یہی منشا آج کل
کے ریفارمروں کا ہے وہ بھی یہ نہیں کہتے کہ اگر کوئی بیوہ شادی کرنا
نہ چاہے تو اس کو شادی کے لئے مجبور کیا جائے۔ اگر کوئی عورت
اپنے پتی کی یاد میں نیکی سے رہے اور اپنی عزت کو محفوظ رکھے تو
نہایت مناسب ہے۔ اگر کسی بیوہ کو اتنا قابو اپنے جذبات پر نہیں
یا اگر کوئی عورت چھوٹی عمر میں خاوند کا منہ دیکھے بغیر بیوہ ہوگئی ہو تو
ایسی بیوہ کو مجرد رہنے پر مجبور کرنا بالکل خلاف عقل ہے۔ ایسی بیواؤں
کا شادی کرنا نہایت مناسب ہے اور ان کی شادی کو روکنا دھرم اور
انصاف سے مخول کرنا ہے ؛

پرلے فیشن کے لوگ یاگ ولک کا حوالہ دیتے ہیں۔ یاگ ولک
کا شلوک یہ ہے کہ ”جس شخص نے کسی عورت سے پہلے تعلق نہ رکھا
ہو اس کو چاہئے کہ اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ایک ایسی لایق لڑکی
سے شادی کرے جس کی شادی پہلے نہ ہو چکی ہو۔ جو خوبصورت ہو
باپ اور ماں کی طرف سے اس کے ساتھ ہم گوت نہ ہو۔ جو اس سے
عمر میں چھوٹی ہو۔ جو تندرست ہو اور جس کا خاندان وید ودیا میں مشہور
ہو“ اس شلوک سے ظاہر ہے کہ جو شرایط اس میں درج ہیں وہ
بطور سفارش کے ہیں وہ ایسی شرایط نہیں کہ ان کے انحراف سے
شادی کالعدم ہو جائے۔ ورنہ کسی بدصورت عورت کی کبھی شادی

کبھی دوبارہ شادی نکر سکے۔ مگر پرانے خیال کے پنڈت مرد کی پہلی شادی کی پرواہ نہیں کرتے۔ عورت کو ایک دفعہ شادی کرنے کے بعد دوبارہ شادی سے روکتے ہیں۔ سب پنڈت اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ پاراسر رشی کے احکام کلجگ کے زمانہ کے لئے مخصوص ہیں مگر ودیاساگر نے خاص پاراسر کے الفاظ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر خاوند کا جسم کمزور ہو یا وہ مر جائے یا عرصہ تک غیر حاضر رہے یا چند اور حالتوں میں عورت اگر برہم چارنی رہنا چاہے تو بہت مناسب ہے۔ اگر وہ دوبارہ شادی کرنا چاہے تو اس کو اجازت ہے۔ ان صاف الفاظ کے خلاف چھوٹی عمر کی بیواؤں کو مجرد رہنے پر مجبور کرنا اور ان کی شادی نہ کرنا سخت ادھرم اور بیرحمی کا کام ہے۔

اس لئے جو لوگ بدھوا بواہ کو رائج کرنا چاہتے ہیں وہ درحقیقت کوئی نیا رواج جاری نہیں کرتے بلکہ ویدک زمانہ میں جن شاستروں کی پیروی ہوتی تھی ان پر عملدرآمد کرنا چاہتے ہیں۔ اس کتاب سے بدھوا بواہ کے مددگاروں کی بحث نہایت مضبوط ہو گئی۔ اسی اثنا میں ۷ جون سنہ ۱۸۶۹ء کو دوسرا بدھوا بواہ گوکل داس تیجپال سنسکرت سکول میں ہوا۔ دوسروں کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے وشنو شاستری پنڈت نے بھی انہیں دنوں ایک بدھوا سے اپنی شادی کی۔ اس بہادر کی ان تھک کوشش اور مسٹر راناڈے اور دیگر دوستوں کی مدد سے آہستہ آہستہ بہت سے لوگ بدھوا بواہ کے طرفدار بن گئے اور مسٹر راناڈے کے اس مقولہ کی کہ [illegible]

اور جھوٹ اور جہالت کے برخلاف کوئی سچی لڑائی اس دنیا میں ناکامیاب نہیں ہو سکتی"۔ کافی طور سے تصدیق ہوئی۔ گجرات دیش میں بھی بدھوا بواہ کے لئے سبھا قایم ہوئی۔ سیٹھ مادھو داس رگھناتھ داس نے جو ذات کے کپول بنیہ تھے ایک مغزز بدھوا سے شادی کی اور گرگام میں ایک بڑا مکان جس کا نام بدھوا بواہ ہال ہے اس غرض سے بنوا دیا کہ اس میں بدھواؤں کی شادی ہوا کرے۔ افسوس کہ وشنو شاستری پنڈت کی عمر نے وفا نہ کی۔ ایسے بہادر اور سچے آدمی دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں مسٹر راناڈے نے اس بہادر دوست کی سوانح عمری لکھکر اپنی محبت کا نوحہ خلقت کو سنایا اور جب تک زندہ رہے سوشل کانفرنس میں بدھوا بواہ کی ضرورت اپنے ہموطنوں کے سامنے بڑے زور شور سے بیان کرتے رہے گویا کہ وہ اپنے دوست کی وصیت پر عمل کر رہے تھے۔ لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ جب مسٹر راناڈے کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا ان کا فرض تھا کہ اپنی شادی کسی بدھوا سے کرتے۔ وہ افسوس کرتے ہیں کہ مسٹر راناڈے نے بدھوا سے شادی نہ کی۔ مگر جو لوگ مسٹر راناڈے کی طبیعت سے واقف ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ خود جنگ و جدل سے بہت ڈرتے تھے دراصل ان کی طبیعت صلح پسند تھی۔ جب ان کی بیوی مری ان کے والد جو بدھوا بواہ کے سخت خلاف تھے زندہ تھے۔ مسٹر راناڈے گو دل میں بدھوا بواہ کے حق میں تھے مگر اس بات پر تیار نہ تھے کہ بدھوا سے شادی کر کے تمام عمر کے لئے اپنے والد کی ناراضی خرید لیں علاوہ

اِس کے ریفارم کے معاملہ میں وہ ہمیشہ ایسا طریقہ اختیار کرنے کے حق میں تھے جس سے ایک دفعہ ہی سوسائٹی میں کہرام نہ مچے۔ ان کو یقین تھا کہ پائدار ریفارم آہستہ آہستہ ہوگا اس واسطے وہ کبھی ایسا کوئی بیباک عمل نہ کرتے تھے جس سے سوسائٹی برہم درہم ہوجائے۔ اور نہ وہ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ پرانی سوسائٹی سے تعلق ٹوٹ جائے۔ یہ طریق عمل ان کی نظروں میں مناسب تھا۔ بہت سے لوگ مسٹر رانا دے کی صلح پسند پالیسی کو واجبی طور سے بزدلی کی پالیسی بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر ریفارمر ہمیشہ بزدلی کی پالیسی پر عمل کرے تو کوئی ریفارم کامیاب نہ ہو۔ وہ راجہ رام موہن رائے کیشب چندر سین اور ودیا ساگر کی مثال پیش کرتے ہیں۔ راجہ رام موہن رائے اور کیشب چندر سین نے اپنے گھر بار ماں باپ کو چھوڑ دیا مگر اپنے عقیدے کو نہ چھوڑا ودیا ساگر نے اِس حوصلہ اور زور سے بدھوا بواہ کا پرچار کیا کہ تمام سوسائٹی اُن کی دشمن بن گئی۔ انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی بدھوا سے کی اور اُس موقع پر اپنے بھائی کو چٹھی لکھدی کہ اگر کوئی رشتہ دار اس بدھوا بواہ سے ناراض ہوکر اُن سے قطع تعلق کرنا چاہے تو اس کو اختیار رہے۔ کسی رشتہ دار کو خوش کرنے کی غرض سے بدھوا بواہ کا نیک کام چھوڑنا اُن کو پسند نہ تھا۔ بیشک ان بہادروں کے مقابلہ میں مسٹر رانا دے اپنے عمل میں کمزور تھے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ بدھوا بواہ کا پرچار کرنے اور بدھوا بواہ کرنے والوں کو سہایتا دینے میں جو کام انہوں نے کیا اس کے لئے وہ شکریہ کے مستحق نہیں۔ ان کی تحریر اور تقریر میں ایسی

مقناطیسی کشش تھی کہ مختلف خیالات کے لوگ بڑی خوشی سے ان کی نصیحت سنتے تھے اور اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ کب سوشل کانفرنس ہو اور مسٹر رانادے کی تقریر سن کر لطف حاصل کریں۔ اس لئے گو مسٹر رانادے نے بدھوا کے ساتھ شادی نہ کرنے سے اپنی کمزوری ضرور ظاہر کی مگر اس میں شک نہیں کہ انہوں نے اپنی تحریر و تقریر سے بدھوا بواہ کے کام کو بڑی ترقی دی۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ انہوں نے تمام عمر میں کبھی کوئی شیخی کا کلمہ اپنی زبان سے نہیں نکالا۔ وہ اپنی بہادری یا اخلاقی بزرگی کی تعریف کرنا گناہ سمجھتے تھے اور ہمیشہ اوروں کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اس لئے نہ کبھی انہوں نے کسی سے اپنی بہادری کی داد مانگی نہ ہمکو ضرورت ہے کہ ان کی کمزوری پر زیادہ بحث کریں۔ نیکی کا جو بیج انہوں نے بویا تھا وہ اچھی طرح پھل پھول لا رہا ہے +

بچپن کی شادی

بدھوا بواہ نہ ہونے سے جو دکھ ہندو سوسائٹی کو ہو رہا ہے اس کا سب سے بڑا سبب بچپن کی شادی ہے۔ اگیان کی وجہ سے بچپن کی شادی کے رواج نے اتنا زور پکڑا ہے کہ ایک ایک دو دو برس کی لڑکیوں کی شادی ہو جاتی ہے اور اس وجہ سے دو دو چار برس کی عمر کی بدھوائیں بھی ہمارے ملک میں موجود ہیں۔ صوبہ بنگال میں جو آجکل نئی روشنی کا گھر ہے چھوٹی عمر کی بیوائیں بکثرت

ملتی ہیں اور آٹھ برس کی عمر سے ۱۲-۱۴ سال کی عمر تک کی بیوائیں تو ہر ایک حصہ ملک میں پائی جاتی ہیں۔ اخلاقی خرابیوں کے علاوہ دنیاوی آرام سے جو محرومی ان بیکس عورتوں کو برداشت کرنی پڑتی ہے وہ ہمارے ملک کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔ کیونکہ جس ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ دکھ میں رہے اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ اپنی ترقی کی جدوجہد میں اچھی طرح کامیاب ہو۔ اس کے سوا چھوٹی عمر کی شادی کی اولاد لازمی طور پر کمزور ہوتی ہے۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ آجکل کے آدمی چھوٹی عمر میں مرجاتے ہیں اور پہلے وقتوں کے آدمی بہت عرصے تک زندہ رہتے تھے۔ یہ شکایت بیجا ہے کیونکہ موجودہ خراب حالت ہمارے کرموں کا پھل ہے۔ اگر ہم چھوٹی عمر کی شادی کا رواج جاری رکھیں گے تو اولاد ضرور کمزور ہوگی۔ ۱۲-۱۴ برس کی عمر تک مرد کا ویرج پختہ نہیں ہوتا اس لئے اس عمر میں جس شخص کے اولاد پیدا ہوگی وہ مضبوط نہیں ہو سکتی چھوٹی عمر کی شادی سے ایک اور نقصان یہ ہے کہ لڑکے کی تعلیم ختم ہونے سے پیشتر والدین بہت سا روپیہ اس کی شادی پر خرچ کر دیتے ہیں اور اس کی تعلیم کے لئے ان کے پاس کافی سرمایہ نہیں رہتا کیونکہ آجکل تعلیم اتنی گراں ہوتی جاتی ہے کہ سو روپیہ ماہوار کی آمدنی والا آدمی بھی اپنی اولاد کو اعلےٰ تعلیم نہیں دے سکتا۔ اسلئے بچپن کی شادی کا یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ لڑکوں کی تعلیم کے لئے روپیہ بہم نہیں پہنچتا۔ اور ان کی تعلیم بسا اوقات بند ہو جاتی ہے۔ اگر یہ

نقصان بھی نہ ہو تو یہ دقت تو ضرور رہتی ہے کہ لڑکا کالج میں پڑھتا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اس کی بیوی اور گھر والوں میں لڑائی جھگڑا رہتا ہے +

بہر حال خاوند کی غیر حاضری میں بیوی کو وہ خوشی نصیب نہیں ہو سکتی جو اس کی موجودگی میں ہوتی ہے۔ اس لئے جس پہلو سے دیکھو بچپن کی شادی کا رواج قوم کی ترقی اور آرام کے لئے نہایت مضر ہے۔ افسوس یہ ہے کہ باوجود اُس نقصان کے جو ہماری قوم کو اس خراب رواج سے ہو رہا ہے لوگ اندھادھند چھوٹے لڑکے لڑکیوں کی شادی کئے جاتے ہیں۔ کبھی دادا کہتا ہے کبھی دادی کہتی ہے کبھی باپ چاہتا ہے کبھی ماں چاہتی ہے کہ لڑکے کی شادی جلد ہو جائے یا لڑکی کے پھیرے ہو جائیں مبادا باپ دادا کے مرنے کے بعد لڑکے لڑکی کی شادی نہ ہو۔ یہ خیال ہزاروں لڑکے لڑکیوں کو مصیبت میں ڈال رہا ہے۔ پلیگ نے ہزاروں چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو بیوہ بنا دیا۔ اگر شادی شدہ لڑکیاں مر گئیں تو ان کے والدین کا یا سسرال کا بڑا نقصان ہوا کیونکہ شادی پر بڑی بڑی رقمیں خرچ ہوتی ہیں۔ مگر رواج نے لوگوں کو اندھا کر رکھا ہے اور کسی قسم کی مصیبت اور کسی طرح کا دُکھ ان کو اس بد رواج کی غلامی سے آزاد ہونے نہیں دیتا۔

بچپن کی شادی سے جو نقصان سوسائٹی کو ہوتا ہے اُس سے بچنے کی غرض سے قدیم ہندوؤں نے یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ ہر ایک مرد کو ۲۵ سال کی عمر تک برہمچریہ اختیار کر کے ودیا حاصل کرنی چاہئے اور

۲۵ سال کی عمر تک ودیا حاصل کرنے کے بعد شادی کرنی چاہئے۔
اس قاعدہ سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ودیا اچھی طرح سے حاصل کی جاتی
تھی اور مرد کا جسم خوب مضبوط ہو جاتا تھا۔ اس طرح ہر ایک مرد
جسمانی اور روحانی طور سے دنیا کی جدوجہد میں داخل ہونے کا بہمہ
وجوہ مستحق بن جاتا تھا۔ عورتوں کے لیئے بھی ودیا حاصل کرنا ویسا ہی
لازمی تھا جیسا کہ مردوں کو۔ کم سے کم ان کو ودیا حاصل کرنے کی اجازت
تھی اور آریہ قوم کی ترقی کے زمانہ میں یعنے ویدک یا گریہ سوتر زمانہ
میں عورتیں اس اجازت سے اچھی طرح فایدہ اٹھاتی تھیں جسکا نتیجہ
یہ ہوتا تھا کہ وہ بھی بڑی عمر تک کنواری (کماری) رہتی تھیں کیونکہ ۱۲-
۱۴ سال کی عمر تک بہت تھوڑی ودیا حاصل ہو سکتی ہے۔ اُس وقت
برہمن ذات کی عورتیں ودیا حاصل کرنے اور تپ جپ کرنے
میں مشغول رہ کر شادی سے پرہیز کرتی تھیں۔ اور ان کی عزت میں کسی
طرح سے فرق نہیں آتا تھا۔ عام رواج یہ تھا کہ مرد اور عورت جوان
ہو کر شادی کرتے تھے۔ اس رواج کی بدولت آریہ لوگ بلوان اور
بدوان ہوتے تھے ان کا حوصلہ بلند اور ان کے خیالات عالی ہوتے
تھے۔ آجکل کی طرح تھوڑی سی کوشش سے ان کا جسم یا دماغ تھکتا نہ
تھا۔ بلکہ ان کی دماغی کوشش نے ہر ایک مضمون میں ایسی ایسی اچھی
کتابیں قوم کی نذر کیں کہ جن سے آجتک آریہ قوم کا نام دنیا میں روشن ہے
اُن کی جسمانی طاقت مہابھارت اور راماین کے قصوں سے ثابت
ہے۔ ممکن ہے کہ ان کتابوں کے مصنفوں نے مبالغہ کیا ہو۔ مگر

اس میں شک نہیں کہ شاعر کسی کمزور کو بہادر بیان نہیں کرتا۔ رامائن اور
مہابھارت کے بہادروں کی دماغی حالت بھی ظاہر کرتی ہے کہ ان کی
جسمانی تربیت بڑی اعلےٰ درجہ کی ہوگی۔ کسی کمزور یا بزدل شخص کی
طاقت ارادی ایسی مضبوط اور پختہ نہیں ہو سکتی جیسی کہ رام اور لکشمن
ارجن۔ یدھشٹر۔ کرن۔ بھیم۔ درونا چارج اور بھیشم پتامہ کی تھی۔ یہ لوگ
لڑائی میں بےمثال بہادری اور حوصلہ دکھاتے تھے مگر لڑائی کے بعد
منطق اور گیان کی باتیں اس طرح کرتے تھے کہ گویا کالج کے پروفیسر ہیں
بات یہ تھی کہ ان کی زندگی کے سب پہلو کمال پہ پہنچ گئے تھے اور برہمچرج
کے قاعدے نے اس کمال پر پہنچنے میں ان کی بڑی مدد کی تھی شادی
کے وقت مرد اور عورت یعنے دولہا اور دولہن دونوں ایسے منتر پڑھتے
ہیں جن سے وہ ایک دوسرے کی محبت۔ حفاظت اور تابعداری
کا اقرار کرتے ہیں۔ ان منتروں سے بھی ظاہر ہے کہ پہلے زمانہ میں
بڑی عمر کی شادی کا رواج ہندوؤں میں جاری تھا کیونکہ جو قول اور
اقرار دولہا اور دولہن شادی کے وقت آپس میں کرتے ہیں وہ
صرف اچھی عمر والے مرد عورت ہی کر سکتے ہیں نہ کہ بچے جو اُن منتروں
کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ سوئمبر کی رسم بھی جو کشتریوں میں جاری تھی اور
جس میں لڑکی اس شخص سے شادی کرتی تھی جو جسمانی بہادری میں اُسکے
سامنے جلسہ عام میں خاص لیاقت ظاہر کرے صاف ثابت کرتی
ہے کہ پہلے بڑی عمر میں شادیاں ہوا کرتی تھیں۔ آریہ قوم کی ترقی کا
زمانہ ختم ہونے پر آیا کیونکہ اس نے اچھے قاعدوں کی پیروی چھوڑ دی

بودھ مت کا دور شروع ہوا۔ اس نے عورتوں کی عزت بہت کم کردی۔
اور ان کو انسان کی ابدی خوشی کا دشمن قرار دیا۔ بودھ مت کے زوال
کے ساتھ ہماری قوم کی رہی سہی عقل جاتی رہی غیر ملکوں سے شاکا۔
ہن اور جٹ قوموں نے حملے کر کے ہندوستان میں گڑبڑ مچادی۔ اور
مجبوراً ہماری قوم ایسے لوگوں کی تابعدار بن گئی جن کی تہذیب ادنیٰ
درجہ کی تھی۔ آریہ قوم کا تنزل مسلمانوں کے آنے سے کمال پر پہنچ گیا۔ کیونکہ
ان کے دلوں میں عورت کی عزت بہت کم تھی۔ اور مرد اور عورت کے
پاک رشتہ کے متعلق ان کے خیالات پست تھے۔ ان وجوہات سے
آریہ قوم کی حالت بگڑ گئی۔ سوئمبر کی رسم بند ہو گئی۔ مرد بجائے ایک عورت
کے ساتھ شادی کرنے کے کئی بیویاں کرنے لگے۔ ودیا کے معاملہ میں
عورت کو شودر کا درجہ دیا گیا اور وہ تعلیم حاصل کرنے کی مستحق نہ رہی۔
اس کی آزادی میں فرق آگیا اور اول باپ دوئم خاوند سوئم بیٹا اس کا محافظ
بنایا گیا۔ اب جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے تمام ملک میں بچپن کی شادی
کا رواج جاری ہے اور برہمچریہ کا نام کم سننے میں آتا ہے۔ آجکل
کا یہ رواج ایسا نکما ہے کہ نہ حکمت کی رو سے اور نہ پرانے شاستروں
کے رو سے اس کی تائید ہو سکتی ہے۔ سُشرت اور واگبھٹ جو قدیم
زمانہ کے ہندوؤں میں اعلیٰ درجہ کے حکیم گذرے ہیں بیان کرتے
ہیں کہ اگر خاوند کی عمر ۲۵ سال سے اور بیوی کی عمر ۱۶ سال سے کم ہو تو
ان کی اولاد یا تو مردہ پیدا ہو گی یا اگر زندہ رہے گی تو کمزور ضرور رہو گی
مسٹر راناڈے نے شادی کے مضمون پر تمام ہندو شاستروں کا مطالعہ

کیا اور ان کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ شاستر بنانے والوں نے گو مرد کی شادی کو لازمی نہیں ٹھہرایا مگر ۲۵ سال کی عمر کے بعد وہ مرد کی شادی کو جایز قرار دیتے ہیں۔ مسٹر راناڈے کی رائے تھی کہ اگر ہم اپنے لڑکوں کی شادی کو ۲۵ سال کی عمر تک ملتوی نہ کریں بلکہ ۱۸ یا ۲۰ سال کی عمر میں ان کی شادی کریں تب بھی قوم کو بہت فایدہ ہوگا۔ عورتوں کے لئے سوتروں (قدیمی شاستروں) نے شادی کی کوئی خاص عمر مقرر نہیں کی مگر انہوں نے ایسی عورت کی شادی مناسب قرار دی تھی جو سن بلوغ اور تمیز کو اچھی طرح پہنچ گئی ہو۔ جب تنزل شروع ہوا تو سمرتیوں نے عورتوں کی آزادی کو اس طرح کم کیا کہ مجرد رہنے کی ان کو ممانعت کر دی۔ ہر ایک شخص کے لئے ضروری کر دیا کہ بلوغت سے پہلے اپنی لڑکی کی شادی کرے اور اس غرض سے انہوں نے کنیا۔ کماری وغیرہ الفاظ کے معنے بدل کر نئے نئے منتر بنا دیئے۔ ممکن ہے کہ کسی زمانہ میں بادشاہ وقت یا اس کی قوم کے لوگ ایسے نفس پرست تھے کہ وہ ہندوؤں کی کنواری لڑکیوں کو زبردستی اٹھائے جاتے تھے یا ان سے زبردستی شادی کرتے تھے اور اس زبردستی سے بچنے کی غرض سے ہندوؤں نے چھوٹی عمر کی لڑکیوں کی شادی کا رواج قایم کر دیا۔ مسٹر راناڈے فرماتے ہیں کہ غالباً بچپن کی شادی کا رواج قومی مصیبت اور ڈر کے وقت ہمارے بزرگوں نے نیک نیتی سے جاری کیا ہوگا مگر انگریزوں کے راج میں اس قسم کا کوئی ڈر نہیں اس لئے اب ہم کو اسی رواج پر عمل کرنا چاہئے جو ہماری قوم کی ترقی کے زمانہ میں جاری تھا یعنے لڑکی کی شادی

۱۶ سال کی عمر میں اور لڑکے کی شادی ۱۸ سے ۲۵ سال کی عمر تک کرنی چاہیئے۔ یہ رواج شاستروں کے عین مطابق ہے اور جو لوگ چھوٹی عمر کے لڑکے لڑکیوں کی شادی کرتے ہیں وہ شاستروں کے خلاف چلتے ہیں۔ مسٹر رانادے کی تحریر جس میں انہوں نے شادی کے لئے مناسب عمر پر بحث کی ہے نہایت دلچسپ ہے اور ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

کن خیالات سے ہندو جاتی کا تنزل ہوا

مسٹر رانادے اپنے ملک اور قوم کی موجودہ حالت پر ہمیشہ سوچتے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کو اپنے ہموطنوں کے روبرو ظاہر کرتے تھے۔ سوشل کانفرنس میں ان خیالات کے اظہار کا ان کو بہت اچھا موقع ملتا تھا۔ ۱۸۹۷ء کی کانفرنس میں انہوں نے ان وجوہات کا ذکر کیا جنہوں نے پچھلے تین ہزار برس میں ہندو سوسائٹی کی ترقی کو روک دیا اور اس کو بہت نیچے گرا دیا۔ اُن کی رائے میں ہمارے تنزل کا اول باعث یہ تھا کہ ہم دوسروں سے علیحدہ رہنے لگے اور اپنے آپ کو اُن سے بہتر سمجھنے لگے۔ اس خیال کی وجہ سے ہندوؤں نے غیر ملکوں میں جانا چھوڑ دیا کیونکہ ان کے دل میں یہ سما گیا کہ ہم سب سے زیادہ فاضل ہیں ہم کو دوسرے ملکوں میں جانے سے کیا فایدہ۔ علاوہ ازیں انہی خیالات نے ذات پات کی تمیز کو سخت بنا دیا۔ ہر ایک ذات کا دوسری ذاتوں سے ملاپ کم ہو گیا اور ہر ایک شخص کا دایرہ جس میں وہ دوسروں کے ساتھ بیاہ شادی

کا تعلق قایم کر سکے یا کھانا کھا سکے تنگ ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ سب سے
زیادہ پاک صاف ایسے آدمی کو سمجھنے لگے جو اپنی روٹی آپ پکاوے
اور دوسرے کے سایہ کو بھی اپنے کھانے پر پڑنے نہ دے۔ اسی خیال
کی بدولت قوم نے قرار دیا کہ ودیا اور دھرم گیان حاصل کرنا سوسائٹی
کے سب طبقوں کا حق نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو جاتی کے
کثیر التعداد لوگ جہالت میں پھنس گئے اور صدیوں کی جہالت نے انکی
ایسی حالت کر دی کہ حیوان بھی اُن سے بہتر ہیں۔ آجکل ہم کو اس بات کی
ضرورت ہے کہ ہم سوسائٹی کے ہر ایک حصہ کے ساتھ برادرانہ تعلق پیدا
کریں اور کسی کو نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھیں۔ اس سلوک سے ہمارے
دوستوں کا دائرہ بہت فراخ ہو جائیگا اور بجائے دشمن کے سب
لوگ ہمارے مددگار بن جائیں گے ✦

دوسرا سبب ہمارے تنزل کا یہ تھا کہ ہم اپنے آپ کو بے عقل سمجھکر
دوسروں کی عقل پر بہت زیادہ بھروسہ کرنے لگے۔ اب ہمارے
لئے یہ بات ناممکن ہو گئی ہے کہ اپنی عقل اور کانشنس کی پیروی کر کے
اپنے اعمال پر قابو حاصل کریں۔ ہم بہت سی باتوں کو سچا یا جھوٹا اچھا
یا بُرا صرف اس وجہ سے سمجھتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں کسی شخص نے ان کو
سچا یا جھوٹا قرار دیا ہے۔ ہم بعض باتوں کا کرنا اپنا عین فرض سمجھتے ہیں
نہ اس وجہ سے کہ ہماری رائے میں ان کا کرنا ہمارا فرض ہے بلکہ اس
وجہ سے کہ کسی ایسے شخص نے جس کو ہم عقلمند سمجھتے ہیں انہیں ہمارے
لئے فرض قرار دیدیا ہے۔ اس تابعداری کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری خود مختاری

کی طاقت ضائع ہوگئی اور ہر ایک معاملہ میں ہم اوروں کی عقل کے محتاج ہوتے ہیں۔ آجکل ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ گو ہم قدیم یا موجودہ زمانہ کے بزرگوں کی عزت کریں مگر ان کی عزت کو کبھی اتنا رتبہ نہ دیں کہ وہ ہم کو اپنی کانشنس کے برخلاف چلنے پر مجبور کرے +

ہمارے زوال کا تیسرا سبب قسمت کا مسئلہ ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ مختلف آدمیوں کی عقل اور لیاقت یکساں نہیں ہوتی اور انسان بہت سی عادتیں اپنے ماں باپ سے ورثہ میں حاصل کرتا ہے مگر یہ بات بھی لازمی نہیں کہ اچھے یا برے ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے سے انسان ضرور اچھا یا برا ہی ہو۔ موروثی عادات کے علاوہ ہمارے تکبر۔ غصہ اور دوسروں پر فضیلت حاصل کرنے کی خواہش سے ہماری زندگی کی بناوٹ پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ بہت لوگوں کا خیال ہے کہ ہم کو کوشش کرنے کی بالکل ضرورت نہیں جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ یہ خیال غلط ہے۔ اس کی جگہ اپنی سوسائٹی میں ہم کو یہ خیال پھیلانا چاہئے کہ ہر ایک کام ہمارے اختیار میں ہے۔ اگر ہم کوشش کریں اور پرماتما کے حکم کی پیروی کریں تو قسمت ہماری ترقی کو روک نہیں سکتی۔ ہماری سوسائٹی صدیوں سے قسمت کی غلامی میں پڑی ہے۔ جب تک ہم قسمت کے مسئلہ کو قوم کے دماغ سے نہ نکال دیں گے ہماری ترقی نہایت مشکل ہے +

ہمارے تنزل کا چوتھا سبب یہ خیال ہے کہ دنیا میں ہر قسم کی بدی ہمیشہ سے موجود ہے اور اس کے دور کرنے کی کوشش فضول ہے۔ یہ خیال ہماری سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچا رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ

شراب خوری - بدچلنی - ظلم - دھوکہ - دغا اور افلاس دنیا میں سدا سے چلے آئے ہیں ان کے بر خلاف واویلا کرنے سے کیا فایدہ ہے مسٹر راناڈے فرماتے ہیں کہ یہ لوگ انسانی زندگی کے اصلی مدعا کو نظر انداز کرتے ہیں - اُن کے خیال کو کمزور کرنے کے لئے ہم کو اس بات کا پختہ یقین کرنا چاہئے کہ ان برائیوں کا وجود انسان کی ترقی کا سخت مخالف ہے اس لئے ان کا دور کرنا ہر شخص کا فرض ہے - جو وجوہات مسٹر راناڈے نے بیان کی ہیں - ان سے ہمارے تنزل کے اسباب کی فہرست ختم نہیں ہوتی - گو وہ ایسی ضروری ہیں اور ان کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ جو اور وجوہ کسی کو سوجھیں وہ بھی مذکورہ بالا اسباب میں شامل سمجھی جاسکتی ہیں - بعض کا خیال ہے کہ ہندوؤں نے ہمیشہ اپنا بیش قیمت وقت دھرم کا گیان حاصل کرنے میں صرف کیا ہے یہاں تک کہ بودھ مت کے مشہور بانی کے علاوہ اور کئی راجہ مہاراجہ دنیا کے جاہ حشمت کو لات مار کر فقیر ہو گئے - ہندوؤں کا تمام لٹریچر دنیا کی بے ثباتی کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے - لوگ دنیاوی ترقی کو چھوڑ کر ہمیشہ دریاؤں کے کنارے - پہاڑوں کے اندر - جنگل بیابانوں میں اپنے دل کی آگ بجھانے کے لئے جاتے ہیں اور خدا کی ذات کو تلاش کرتے ہیں - دشمن کی دل آزاری کرنا یا اس سے بدلا لینا ہندوؤں کی طبیعت میں کوسوں تک نہیں وہ اپنا نقصان کرینگے مگر غیر کا نقصان کریں گے - اس بے پرواہی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ سُست ہو گئے - دنیا کی جدوجہد برداشت کرنے کی طاقت ان میں نہ رہی - جس نے چاہا ان کو قابو کر لیا - اس طرح

ہمارے قومی تنزل کی بنیاد پختہ ہوگئی۔ یورپ میں بھی جبتک عوام الناس کے دل و دماغ پر دھارمک جدوجہد کا زور رہا ان کی ترقی بہت معمولی تھی۔ سائینس اور مذہب کی لڑائی مشہور ہے۔ جوں جوں مذہب کا ناجائز زور کم ہوتا گیا یورپ کی قومیں جو پہلے جہالت میں ڈوبی ہوئی تھیں تاریکی سے باہر نکلیں اور مادی دنیا کی تحقیقات میں مشغول ہوئیں۔ اس تحقیقات کی بدولت انہوں نے جو مالی اور ذہنی ترقی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس لئے ہم کو چاہئے کہ اپنی تنزل کے اسباب کو جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے دور کریں اور دھارمک جذبات کو مناسب جگہ دے کر دنیاوی ترقی کے لئے اپنا کیریکٹر تیار کریں۔

ہم پلیگ وغیرہ تکلیفوں سے کیوں ڈرتے ہیں

سنہ ۱۸۹۶ء میں پلیگ کا آغاز بمبئی میں ہوا اور اس کی وجہ سے لوگوں کے دل پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ کئی دوستوں نے مسٹر راناڈے کو مشورہ دیا کہ سوشل کانفرنس کے جلسہ کو ملتوی کیا جائے۔ مسٹر راناڈے کسی موقعہ پر ہراساں نہ ہوتے تھے انہوں نے کانفرنس کو ملتوی کرنے کے بجائے یہ مناسب سمجھا کہ اس جلسہ میں پلیگ کے ڈر کو دور کیا جائے اور لوگوں کو ایسا اپدیش کیا جائے جس سے ان کا حوصلہ بڑھے۔ اس سال کے جلسہ کی تقریر میں انہوں نے فرمایا کہ " آجکل اس ملک پر سخت مصیبت نازل ہو رہی ہے۔ اور لوگ خوف زدہ ہو رہے ہیں۔ صاحبان آپ سب کے لئے اس امر پر غور کرنا لازمی ہے کہ ہندوستان

کے باشندے بیماری اور قحط۔ دکھ درد اور افلاس سے بے حد خوف
کیوں کھاتے ہیں۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ہم ایسے طاقتور
نہیں کہ ہوا ہماری مرضی کے مطابق چلے یا بادل ہماری مرضی اور ضرورت
کو پورا کرنے کے لئے فوراً برسنے لگیں مگر اس زمانہ میں ہماری بہتری کے
بہت سے سامان موجود ہیں اور ان کی مدد سے ہم کو اپنی دولت اور صحت
کی بنیاد ایسی مضبوط کرنی چاہئے کہ ہم ایسے نازک وقت میں سے صحیح
سلامت گذرنے کے قابل بن جائیں۔ اگر ہم وقت سے پہلے اپنے آپ
کو تیار کر لیں تو اس قسم کی مصیبت کا ادھا ڈر بھی باقی نہ رہے۔ اگر ہمارے
ہموطن زیادہ عقلمند اور پرہیزگار۔ زیادہ مضبوط اور حوصلے والے
ہوتے تو اُن میں سے لاکھوں آدمی حیوانوں کی طرح زندگی بسر نہ کرتے
ممکن ہے کہ یہ مصیبت اس غرض سے آئی ہو کہ ہم کو اس سے نصیحت ہو۔ ہم اپنے فرائض
کی طرف متوجہ ہوں اور درست زندگی کے قاعدوں کی پابندی کرنا
سیکھیں۔ میں اس معاملہ میں گورنمنٹ کے فرائض پر بحث کرنا نہیں
چاہتا۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ رعایا کو زیادہ خوش حال۔ دولت مند
اور ہر طرح سے کامل بنائے مگر جب تک ہر ایک انسان اپنی ترقی
کے لئے خود کوشش نہیں کرے گا کوئی بیرونی انتظام یعنے گورنمنٹ وغیرہ
اسے کامل نہیں بنا سکتا۔ اس لئے اس موقع پر میں صرف اُن امور پر
گفتگو کرنا چاہتا ہوں جن کا تعلق ہماری ذاتی کوشش سے ہے اور
جن میں اگر ہم کو کامیابی حاصل ہو گئی تو پلیگ اور دوسری مصیبتوں
کا ڈر ہمارے دل سے دور ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ایسی بیماریاں

ہی ہمارے ملک سے معدوم ہو جائینگی" اس تمہید کے بعد مسٹر راناڈے نے فرمایا کہ "گذشتہ سال میں پرانی اور نئی روشنی کے لوگ سب اپنی اصلاح کے کام میں مشغول رہے ہیں۔ کوئی تعلیم کا عمدہ کام کر رہا ہے کوئی ناچ اور شراب خوری کا مخالف ہے۔ کوئی غیر ملکوں میں جانے کا پرچار کرتا ہے۔ کوئی شادی غمی کے موقع پر فضول خرچی کو روکتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ قوم کی زندگی میں ایک نئی طاقت حرکت کر رہی ہے یہ ایک حوصلہ بڑھانے والا نظارہ ہے۔ اس کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ جب ہمارے لوگ ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو ان کی امیدیں بلند ہونگی۔ ان کا بشواس ایسا پکا ہوگا کہ وہ کسی فرض سے جی نہ چرائیں گے اور نہ کسی خطرہ سے ڈریں گے اور جب وہ آپس میں انصاف اور محبت کے اصول پر کاربند ہونگے تو ہندوستان کا رتبہ دنیا کی قوموں میں بڑا ہوگا۔ وہ کسی کا غلام نہیں رہے گا بلکہ اپنی قسمت کا آپ مالک ہوگا یہ آئندہ زمانہ ہے جس کے لئے ہم سب کام کر رہے ہیں۔ اور جس کے آنے کا ہم کو بھروسا ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس زمانہ کو گیان کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ زیادہ مبارک ہیں وہ لوگ جو اسکے لئے کام کر کے راستہ صاف کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ مبارک ہیں وہ لوگ جو اپنی آنکھوں سے اُس زمانہ کو دیکھیں گے اور اس وقت کی پاک زمین پر چلیں گے۔ وبا اور قحط ظلم اور رنج اس وقت ہمارے ملک سے بھاگ جائیں گے اور قدیم زمانہ کی طرح دیوتا پھر اس زمین پر آ کر آدمیوں کے ساتھ ملیں جلیں گے"

مسٹر تیلنگ کی زندگی پر لیکچر

جن شخصوں نے مسٹر تیلنگ کی مفید زندگی کا مطالعہ کیا ہے
ان کو معلوم ہوگا کہ ان کی بے وقت موت سے ہندوستان کو ایسا
سخت نقصان پہنچا کہ جس کی تلافی مشکل ہے۔ انہوں نے سکول اور
کالج کی تعلیم بڑی ناموری سے ختم کی تھی۔ کاروبار وکالت میں وہ ایسے
چمکے کہ ان کی ترقی دیکھ کر سب حیران تھے۔ ان کی تحریر اور تقریر ان کی
حب الوطنی اور علمیت کا شہرہ تھوڑے ہی عرصہ میں چاروں طرف پھیل
گیا۔ وہ خالی کتابی کیڑے نہ تھے بلکہ کانگرس میں اور اس کے باہر ملکی
معاملات پر بڑی لیاقت اور آزادی سے بحث کرتے تھے۔ پولی
ٹکس کے علاوہ وہ سوشل ریفارم کے بھی بڑے حامی تھے۔ سنسکرت
اور انگریزی زبان میں ان کو خاص دسترس حاصل تھی اور اسی وجہ سے
انہوں نے بھگوت گیتا کا انگریزی میں ایسا مستند ترجمہ کیا کہ پروفیسر
میکس مولر نے اس کو مشرق کی متبرک کتابوں کے سلسلہ میں داخل
کیا۔ اپنی علمیت اور حب الوطنی کے جوش میں انہوں نے مرہٹہ قوم کی
نسبت تاریخی تحقیقات شروع کی۔ ان کا ارادہ تھا کہ مسٹر راناڈے
کے ساتھ مل کر مرہٹوں کی ترقی کی مکمل تاریخ لکھیں مگر زندگی نے وفا
نہ کی اور مجبوراً مسٹر راناڈے کو یہ کام تنہا ہی کرنا پڑا۔ گورنمنٹ بھی
ان کی لیاقت کو تاڑ گئی تھی اور جب سنہ ۱۸۸۹ء میں نانا بھائی ہریداس
کی وفات پر بمبئی ہائی کورٹ کی ججی خالی ہوئی تو گورنمنٹ نے اس

عہدہ پر مسٹر تیلنگ کو مقرر کیا۔ اس عہدہ پر ممتاز ہو کر مسٹر تیلنگ نے
اس لیاقت اور عمدگی سے کام کیا کہ گورنمنٹ اور رعایا دونوں خوش
ہوئے۔ مسٹر راناڈے ان کے دلی دوست تھے اور قریباً کل معاملات
میں ان کی رائے ایک ہی تھی۔ ۹۳ء میں جب مسٹر تیلنگ کا انتقال
ہوا تو تمام ملک کو سخت افسوس ہوا اس افسوس کا اظہار مسٹر راناڈے
نے کئی سال بعد ایک مشہور لیکچر میں بڑے جوش کے ساتھ کیا۔ اس
لیکچر میں انہوں نے مسٹر تیلنگ اور ان کے دوستوں کی عمدہ صفات
کا بڑی خوبی سے ذکر کیا ہے۔ اس لیکچر سے مسٹر راناڈے کے خیالات
بہت اچھی طرح ظاہر ہوتے ہیں مسٹر راناڈے نے فرمایا کہ "مسٹر
تیلنگ اور ان کے دوستوں کا اول خاصہ یہ تھا کہ وہ سب حوصلہ سے
بھرے ہوئے تھے۔ مایوسی ان کے پاس نہیں پھٹکتی تھی۔ ہم جانتے ہیں
کہ ہندو جاتی بہت گری ہوئی ہے اور تمام دنیا ہم سے نفرت کرتی ہے۔ ایسی
حالت میں کسی ہندو کا با امید اور باحوصلہ ہونا لوگوں کو اچھا معلوم نہیں دیتا۔
میری رائے میں ہم بالکل نالایق ہیں اگر باوجود اپنی قوم کی ایسی تاریخ کے
جو اور قوموں کی تاریخ سے بدرجہا بہتر ہے ہم حوصلہ اور ہمت ہار بیٹھیں
اگر ہم یورپ۔ ایشیا۔ امریکہ اور افریقہ کا نقشہ ہاتھ میں لیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی
اور قوم اتنے عرصہ تک زندہ نہیں رہی جتنی دیر کہ ہندو جاتی زندہ رہی
ہے۔ اور ملکوں میں قومیں اور مذہب پیدا ہوئے۔ پھولے پھلے اور
معدوم ہو گئے۔ مگر باوجود تنزل کے ہندوستان کے لوگ معدوم ہونے
سے اس طرح بچ گئے ہیں جیسے کہ دنیا میں وہ کسی خاص کام کے لئے مقرر

ہیں۔ موجودہ زمانہ کے لوگ یا ہمارے نزدیک کے متقدمین اس مبارک کام کو ہاتھ لگانے کے قابل نہ ہوں مگر اس میں شک نہیں کہ ہم بھی اس ملک کے خاص مذہب۔ تاریخ۔ لٹریچر۔ فلسفہ۔ طریق معاشرت اور طرز خیال کے سلسلہ کو جاری رکھنے میں خاص کام کر رہے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ اس بات میں باامید اور باحوصلہ ہونے کی کیا وجہ ہے۔ جواب یہ ہے کہ پرماتما نے بلاسبب یہ عنایت نہیں کی کہ ہماری قوم کو اب تک بچا رکھا۔ اگر عیسائی مذہب کی مطابق چند ہزار یہودیوں کا محفوظ رکھنا علت سے خالی نہ تھا تو ہندو جاتی کا جو دنیا کے پانچویں حصہ کے برابر ہے محفوظ رکھنا بھی اتفاقیہ امر نہیں یعنے حکمت سے خالی نہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ ہماری موجودہ خراب حالت ہم کو کسی اعلےٰ مطلب کے لئے تیار کر رہی ہے۔ اسی وجہ سے مسٹر تیلنگ اور ان کے دوست ہمیشہ امید سے بھرے رہتے تھے۔ وہ اپنی قوم کی گذشتہ تاریخ سے نہایت خوش تھے اور ان کو اپنی قوم کی آیندہ ترقی کی بڑی امید تھی۔ ان کو یقین کامل تھا کہ اگر موجودہ مصیبت کے زمانہ میں ہم لوگ پورے اترے تو ہماری قوم دنیا میں ضرور نیک نام ہوگی۔ سب کو معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں بشمار لوگ ایسے ہیں جو اپنی حالت کو تبدیل کرنے کی خواہش اور کوشش نہیں کرتے۔ بعض لوگ ہماری موجودہ حالت سے ایسے متنفر ہیں کہ وہ صدیوں کا کام چند سال میں کرنا چاہتے ہیں۔ مسٹر تیلنگ اور اُن کے دوست اِن دونوں طرح کے لوگوں کی غلطی سے بچکر میانہ روی پسند کرتے تھے۔ اور ان کے دل میں یہ امید بھری تھی کہ ہندوستان کا ستارہ پھر چمکیگا۔ تبدیلی کی خواہش نہ کرنا بدھوں

کی عادت میں داخل ہے۔ بہت جلدی تبدیلی کی امید رکھنا بچوں کا کام ہے۔ بہت سے لوگ ہم میں ایسے ہیں کہ ذراسی کامیابی سے پھول جاتے ہیں اور ذراسی شکست سے ہمت ہار بیٹھے ہیں۔ ایسے کم ہمت لوگوں کا اُن عقلمند شخصوں سے کچھ مقابلہ نہیں جو آیندہ کامیابی کی امید سے بھرے ہوئے ہیں۔ مگر جانتے ہیں کہ وہ کامیابی بڑی کوشش اور تربیت کے بعد حاصل ہوگی۔ کیونکہ اُن کا پختہ یقین ہے کہ جب تک ہماری اندرونی اخلاقی حالت بہتر نہ ہوگی بیرونی تبدیلی سے کوئی ترقی نہیں ہو سکتی۔ آجکل ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم کوشش کرنا نہیں چاہتے۔ ہماری جسمانی ناطاقتی ہم کو سخت محنت برداشت کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اور ہم اس بات کے ناقابل ہیں کہ کسی کام کے لئے زیادہ دیر تک کوشش کریں۔ ہم بہت جلد تھک جاتے ہیں۔ اس لئے ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنی عادات کو بدلیں۔ سینکڑوں برسوں کے تنزل کی وجہ سے ہم بچوں کی طرح جلد مایوس ہو جاتے ہیں یا بدھوؤں کی طرح غصہ ور اور جھگڑالو بن جاتے ہیں۔ بجائے اس حالت کے ہم کو مضبوط ہو کر راستی کے لئے جنگ کرنا چاہئے۔ ہم کو نہ غافل ہونا چاہئے۔ نہ جلد باز ہونا چاہئے۔ نہ شکست سے بے حوصلہ اور نہ کامیابی سے پھولنا چاہئے۔ بلکہ ملک کی ترقی کے لئے امید اور وشواس سے کوشش کرنی چاہئے۔ مسٹر تیلنگ اور ان کے دوست ہماری قوم کے قدیم زمانہ کی بڑی عزت کرتے تھے مگر ہم کو یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ہماری قوم کا وہ زمانہ قابل فخر ہے جس میں ہمارے بزرگ فلسفہ دان تھے۔ ہمارا لٹریچر اور سائنس ترقی پر تھا اور آریہ سنتان ہندوستان سے باہر جنوب میں جاوا کو اور شمال

میں منگولیا کو جاتی تھی - اُس زمانہ کی ہم کو نہایت عزت کرنی چاہئے موجودہ زمانہ سے قریب پیشتر کا زمانہ ہمارے فخر کا مستحق نہیں - اگرچہ اس قریب کے زمانہ میں بھی ایسا وقت گزرا ہے جس کی ہمیں ویسی ہی عزت کرنی چاہئے جیسی کہ بہت قدیم زمانہ کی - مگر ایسے موقع بہت کم ہوئے ہیں - ہماری موجودہ خراب حالت کے سدھار کے لئے پرماتما نے بہت سے سامان مہیا کر دیئے ہیں مگر یہ کام اتنا وسیع ہے کہ اسے پورا کرنے کے واسطے صدیاں چاہئیں

دوسرا خاصہ مسٹر تیلنگ اور اُن کے دوستوں کا یہ تھا کہ وہ ہندوستان کی ترقی کو صرف ایک پہلو میں مدد دینا نہیں چاہتے تھے - ان کی رائے یہ تھی کہ ہم کو اپنی زندگی اور قومی زندگی کے ہر ایک پہلو کو سنوارنا چاہئے کیونکہ اُس کا ایک پہلو دوسرے پہلوؤں سے جدا نہیں ہو سکتا - (۱) اپنی جسمانی حالت کی مثال لیجئے - ہماری موجودہ جسمانی کمزوری صدیوں کی خراب عادتوں قبیح رسموں (بچپن کی شادی وغیرہ وغیرہ) اور غلط خیالات (مثلاً دنیوی آرام سے بے پرواہی) کا نتیجہ ہے - اس کو دور کرنے کی غرض سے ہم کو بہت عرصہ کام کرنا چاہئے - کیونکہ ہماری جسمانی ناطاقتی ہماری زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر نہایت خراب اثر ڈالتی ہے *

(۲) جسمانی کمزوری کے علاوہ ہمارے بیرونی سامان بھی بڑے اصلاح طلب ہیں - ہم کو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اپنے بیرونی حالات کو درست کریں حتےٰ کہ اخلاقی معنوں میں وہ ہوا بھی جو دم کے ذریعہ سے ہمارے اندر جاتی ہے پاک صاف ہو جائے - ان حالات میں ہم کو ایسی تبدیلی کرنی چاہئے کہ نہ صرف ہماری جسمانی حالت بلکہ ہماری دماغی اور

اخلاقی حالت بھی درست ہو جائے +

(۳) - ہم کو اپنی مذہبی حالت بھی سدھارنی چاہئے - آج کل ہم لوگ مسئلہ مسائل کی ادھیڑ بن میں پھنسے رہتے ہیں ہماری زندگی میں سے اصلیت جاتی رہی صرف ظاہرداری باقی ہے - اس حالت کو بدلنے کے لئے ہم کو دوسرے ملکوں یا انگریزوں سے سبق سیکھنے کی ضرورت نہیں ہمارے ملک میں روحانی زندگی نہ صرف کتابوں میں پائی جاتی تھی بلکہ بہت سے آدمی عملی طور پر روحانیت کا بہت عمدہ نمونہ ظاہر کرتے تھے ہم کو وہ روحانیت پھر تازہ کرنی چاہئے - اس کے لئے ہم کو کسی ایسے مسئلہ کی پیروی کی ضرورت نہیں جو دوست کو دوست سے اور ایک ذات کو دوسری ذات سے علیحدہ کردے - بلکہ اپنی زندگی کے کاروبار میں وہ روحانیت داخل کرنی چاہئے جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ - مرد کو عورت کے ساتھ اور بڑے کو چھوٹے کے ساتھ انصاف کرنا سکھاتی ہے +

(۴) ہم کو اپنی مالی حالت بھی بہتر کرنی چاہئے - آجکل ہماری صنعت اور حرفت اسی دقیانوسی حالت میں ہے جس میں وہ اس وقت تھی جبکہ ابتدا میں انسان نے زراعت کا کام شروع کیا تھا اس وجہ سے لاکھوں آدمی سخت محنت کرکے مشکل سے اپنا گزارہ کرتے ہیں - مزدور لوگ ہنرور نہیں سرمایہ تھوڑا ہے اور بے انتظامی میں پڑا ہے - ملک کی خام پیداوار سے نہ تو فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور نہ اس کو بہتر اور زیادہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - اس معاملہ میں بلا کسی مدد کے ترقی کرنا مشکل ہے - پرماتما نے

ہماری مالی ترقی کے لئے بہت اچھا سامان مہیا کر دیا ہے یعنی ہم کو انگریزوں
کا جو صنعت حرفت اور انتظام سرمایہ میں استاد ہیں شاگرد بنا دیا ہے
اگر اس زمانہ میں بھی ہم اپنی مالی حالت نہ سدھار سکیں تو نہایت
افسوس اور حیرانی کی بات ہے +

(۵) - اس کے علاوہ ہمارا فرض ہے کہ اپنے ملک کے پولیٹیکل معاملات
میں دلچسپی ظاہر کریں - اگرچہ لوگوں کا خیال ہے کہ پولیٹیکل ترقی کا کام
نہایت آسان ہے مگر میری رائے میں یہ کام سب سے مشکل ہے
جب تک کہ ہم اپنی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو بہتر نہ کریں +

الغرض یہ اصول بلاشبہ درست ہے کہ ہماری زندگی کا ہر ایک پہلو
ایک دوسرے سے وابستہ ہے - یہ ناممکن ہے کہ ہم ایک پہلو میں ترقی
کریں - اور دوسرے پہلوؤں سے غافل رہیں - اگر ہم ایک پہلو میں غافل
ہیں تو اس غفلت کا نتیجہ ہم کو دوسرے پہلوؤں میں بھی برداشت کرنا
پڑے گا - یہ اصول مسٹر تیلنگ اور ان کے دوستوں کا تھا - وہ سوشل
دھارمک - مالی اور پولیٹیکل معاملات میں یکساں کوشش کرتے تھے اور
دوسرے لوگوں کا حوصلہ بڑھاتے تھے - ان کا یہ عقیدہ مذہبی عقیدہ کی
حد تک پہنچ گیا تھا کہ ہم کو اپنی زندگی کے سب پہلوؤں میں ترقی کرنی چاہئے
ہم کو اپنا جسم مضبوط کرنا چاہئے - ہم کو اپنے کل تعلقات میں انصاف کرنے کی
عادت سیکھنی چاہئے - اپنی عقل کو تعصبات سے بری کرنا چاہئے - اور
توہمات کے قابو سے نکلنا چاہئے - یہ سبق مسٹر تیلنگ اور ان کے دوستوں
کی زندگی سے ہم کو حاصل ہوتا ہے" +

بھگوت دھرم

انگریزی دان لوگ اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ پوپ کے برخلاف
جو بغاوت لوتھر نے کی اس سے یورپ میں کتنی کھلبلی پڑ گئی تھی۔
اس سے پہلے پوپ کی طاقت اتنی زبردست تھی کہ بڑے بڑے
بادشاہ اُس کے سامنے دم نہ مار سکتے تھے۔ جو کوئی شخص پوپ کی مخالفت
کرتا تھا اس پر طرح طرح کی مصیبت نازل ہوتی تھی اس لئے ہر ایک آدمی
پوپ کے سامنے سر تسلیم خم کرتا تھا۔ جو لوگ شہر روما میں باہر سے جاترا
کو آتے تھے وہ ایک گرجا گھر کے مقدس زینوں پر پڑے پڑے اُترتے
چڑھتے تھے۔ کھڑے ہو کر ان زینوں پر چڑھنے کی اجازت نہ تھی ان زینوں
کا نام سینٹا گراڈا تھا۔ پوپ کے اہلکار آئندہ زندگی میں نجات دینے
کے لئے لوگوں سے ٹیکس وصول کرتے تھے۔ جو شخص ٹیکس ادا
کرتا تھا اس کو اگلی دنیا میں نجات ملنے کا پورا یقین ہو جاتا تھا۔ اسی
طرح اور بہت سے توہمات پوپ کی بیحد حکومت کی وجہ سے عیسائی
دنیا میں جاری تھے اور اُن سے انسانی آزادی عقل اور اخلاق
کو سخت نقصان پہنچتا تھا۔ مگر کسی کا حوصلہ نہ تھا کہ پوپ کی مخالفت
کرے۔ کیونکہ پوپ کے ہاتھ میں تینوں دنیاؤں کی نجات کی کنجی تھی۔
اور وہ جسکو چاہتا تھا جادوگر یا جادوگرنی قرار دے کر آگ میں زندہ
جلوا دیتا تھا۔ مگر اُن پوشیدہ طاقتوں کو جو انسان کی ترقی کی نگہبان ہیں
یہ منظور نہ تھا کہ پوپ کی بیحد و ناجائز حکومت ابد تک جاری رہے۔

شروع میں مارٹن لوتھر بھی چونکہ اس نے اپنے زمانہ کے عیسائیوں کی سی تربیت حاصل کی تھی۔ پوپ کو نہایت ادب اور خوف کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مگر خدا نے اس کی طبیعت میں کمال درجہ کی بہادری اور آزادی داخل کر دی تھی۔ وہ ایک دفعہ بڑے شوق سے روما کی جاترا کو گیا۔ وہاں جاکر جو بت پرستی۔ ذہنی غلامی اور بزدلی دیکھی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اسی وقت اس نے پوپ کے ادب اور خوف کو خیر باد کہا اور اس بات کا مصمم ارادہ کیا کہ اس بت پرستی اور غلامی کو جڑ سے اکھاڑ دونگا۔ اس نے کچھ عرصہ کے بعد کھلم کھلا پوپ کی مخالفت شروع کی۔ پوپ اور اس کے غلاموں نے بڑی بڑی دھمکیاں دیں اس کو موت کا ڈر دلایا اور اس کی بڑی بے عزتی بھی کی۔ مگر لوتھر شیر ببر کا دل رکھتا تھا اس نے ان سب دھمکیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ اور پوپ کے برخلاف ایسا جہاد جاری کیا کہ رومن کیتھلک دھرم کی بنیاد کھوکھلی کر دی۔ لوتھر کے ہم خیال شخصوں کو رومن کیتھلک بادشاہوں نے انگلستان اور دوسرے ملکوں میں قتل کرایا اور زندہ آگ میں جلایا مگر سچ کو کوئی آگ جلا نہیں سکتی کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی۔ ان بہادروں نے سولی پر چڑھ کر اور آگ میں جل کر اپنے خون سے پوپ کی مخالفت کی بنیاد پختہ کر دی۔ اور اس کے دشمنوں کی تعداد ہر ایک ملک میں ہزاروں لاکھوں تک پہنچ گئی۔ لوتھر کی بغاوت کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ بے شمار لوگ رومن کیتھلک دھرم چھوڑ کر پراٹسٹنٹ ہوگئے بلکہ وہ ذہنی غلامی اور اخلاقی بزدلی جس میں لاکھوں بندگان خدا پہلے ڈوبے

ہوئے تھے۔ آہستہ آہستہ دور ہوگئی۔ سب طرف علم کا سورج چمکنے لگا۔ لٹریچر نہایت عمدہ ہوگیا قدیم لاطینی زبان کی جگہ جو اس وقت یورپ میں پادریوں اور قانون دان لوگوں کی فضیلت کی نشانی تھی ہر ایک ملک کی اپنی اپنی زبان مروج ہوگئی اور جو لوگ پہلے صرف لاطینی زبان پڑھکر جنٹلمین بن جاتے تھے اب اُن کی اولاد اپنی ملک کی زبان سیکھنے لگی۔ ذہنی غلامی اور تاریکی دور ہونے سے لوگوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ بجائے بزدل اور کم ہمت ہونے کے وہ آزاد منش اور بلند ہمت ہوگئے۔ اس لئے وہ ملک جہاں پر اٹسٹنٹ دھرم جاری ہوا ترقی کا نمونہ بن گئے اور جہاں رومن کیتھلک دھرم جاری رہا ان کی حالت پست ہوگئی۔ الزبتھ کے زمانہ میں انگلستان کے لوگ چاروں طرف پھیل گئے اور جہاں گئے فتح ان کی ہم رکاب رہی۔ جو لوگ پرانے دھرم کے پیروں کے ظلم سے تنگ آکر امریکہ چلے گئے تھے انہوں نے وہاں ایسی روشنی پھیلائی کہ جس نے رفتہ رفتہ تمام دنیا کو چندھیا دیا۔ رومن کیتھلک دھرم کی خرابیوں سے جو حالت یورپ میں ہوگئی تھی قریباً وہی حالت ہندوستان میں اس وجہ سے ہوگئی تھی کہ لوگوں کی عملی زندگی میں سے دھرم کا اصلی جوہر یعنی انصاف بالکل معدوم ہوگیا تھا۔ قدیم زمانہ میں براہمنوں کی بڑی عزت ہوتی تھی۔ راجہ مہاراجہ ان کا ادب کرتے تھے۔ مگر یہ عزت اور ادب براہمنوں کے جسم کے واسطے نہ تھے۔ ان کی روحانیت اور ذہنی اور اخلاقی بزرگی کے سامنے خلقت خوشی خوشی سر تسلیم خم کرتی تھی۔ برہمن لوگ روپیہ پیسہ کی قطعی پرواہ نہ کرتے تھے ان کا کام شاستر پڑھنا اور پڑھانا تھا۔ بعض ان میں سے ۲۵ سال کی عمر تک بعض ۳۶ سال تک بعض ۴۸

سال کی عمر تک برھم چاری رہتے تھے یعنے ودیا حاصل کرنے میں مشغول رہکر شادی کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ تپ جپ کی سخت ریاضت ان کے لئے مقرر تھی اور وہ سب طرح کی تکالیف برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس تربیت کے عوض میں اگر قوم نے ان کی عزت کی تو کیا تعجب کی بات کی۔ پڑھے لکھے آدمی کی ان پڑھ کے مقابلہ میں ہمیشہ قدر ہوتی ہے۔ اس لئے ہماری قوم ہمیشہ برہمنوں کی مطیع رہی کیونکہ سائینس اور فلسفہ وغیرہ ہر طرح کے علوم سے وہ بخوبی ماہر تھے اور آجتک ان کی معلومات کے سامنے مہذب دنیا پانی بھرتی ہے۔ جن جن باتوں کو ہم اپنی نادانی کی وجہ سے صرف توہمات اور بیہودہ سمجھتے تھے وہ مغربی سائینس کی روشنی سے دانشمندی کی شکل اختیار کر رہی ہیں اور ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ مغربی قوموں کی موجودہ مشکلات کو ہمارے قدیم بزرگوں نے سینکڑوں کیا ہزاروں برس پہلے حل کر دیا تھا مگر براہمنوں کی دانائی کی بھی حد تھی۔ آخر وہ انسان تھے۔ بیحد عزت اور رسوخ سے ان کا سر پھر گیا۔ ان کی نخوت کا ٹھکانہ نہ رہا۔ وہ ہر ایک شخص کو جو سنسکرت زبان سے ناواقف تھا حقارت سے دیکھنے لگے۔ ان کی رائے میں جو کوئی شخص براہمن خاندان میں پیدا ہوتا تھا عزت کا مستحق تھا۔ چاہے وہ عالم فاضل یا پارسا ہو یا نہ ہو۔ ان کا خیال ہو گیا کہ عالموں کے خاندان میں پیدا ہونے سے اس خاندان کی پشتینی تربیت کا حصہ بچہ کو ضرور ملتا ہے قوم نے بھی اس اصول کو قبول کیا اور عالم اور جاہل برہمنوں کی تمیز آہستہ آہستہ دور ہو گئی جیسا کہ آج کل شرادھوں کے دنوں میں ہنوز دیکھنے

وقت یہ نہیں دیکھا جاتا کہ جس براہمن کو کھانے کے لئے بلاتے ہیں وہ پنڈت ہے یا باورچی۔ یا تحصیل کا سپاہی۔ نیوتہ براہمن ذات کے آدمیوں کو دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ خواندہ ہوں یا ناخواندہ۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی دماغ میں سماگئی کہ براہمنوں کو چھوٹی ذات کے لوگوں سے میل جول کم رکھنا چاہئے اس لئے ان کے ساتھ کھانا پینا اور شادی بیاہ کرنا قطعی طور پر بند ہوگیا۔ شودروں کو شاستر پڑھانا بھی گناہ سمجھا گیا۔ ان کا سایہ پڑنے سے برہمن کا جسم ناپاک ہونے لگا۔ مدراس احاطہ کے کئی مقامات میں چھوٹی ذات کے آدمی شودر وغیرہ اس گلی کوچہ میں داخل نہیں ہو سکتے جہاں کہ برہمن کا گذر ہو۔ اس خیال کی وجہ سے ۱۸۵۰ء کے بعد بھی سنسکرت کالج کلکتہ میں براہمن ذات کے لڑکوں کے سوا اور کسی ذات کے لڑکوں کو داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ جب پنڈت ایشور چند رودیا ساگر اس کالج کے پرنسپل ہوئے تو ان کی فراخ طبیعت اس ممانعت کو برداشت نہ کر سکی۔ انہوں نے معقول دلایل دے کر شودروں کو اس کالج میں داخل کرنے کی اجازت گورنمنٹ سے حاصل کی۔ جب ہندوؤں کا زوال شروع ہوا تھا تو اس وقت روحانیت پاکیزگی اور علمیت صرف سنسکرت دان لوگوں کا ہی حصہ سمجھے جاتی تھی۔ جو لوگ سنسکرت سے ناواقف تھے ان کے لئے بہشت میں داخل ہونا مشکل خیال کیا جاتا تھا۔ قوم کے زوال کے ساتھ عورتوں کی آزادی تعلیم اور عزت کا بھی تنزل ہوتا گیا۔ اور یہ خیال پختہ ہوگیا کہ وہ کسی اعتبار کے قابل نہیں۔ یہ سب باتیں قانون قدرت کے خلاف تھیں اور ان سے ہماری قوم کا بہت بڑا نقصان ہو رہا تھا

اس لئے تیرھویں صدی سے لے کر ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایسے ایسے دھرماتما لوگ پیدا ہوئے کہ جنہوں نے براہمنوں کی بے حد طاقت اور غرور کو کم کرنے میں اسی قدر زور مارا جتنا کہ لوتھر نے پوپ کے برخلاف ظاہر کیا تھا۔ بنگال میں مہاتما چیتن نے کالی اور شکتی کی پرستش کے برخلاف بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا اور یہ ثابت کیا کہ پرماتما کا سچا بھگت بننے کے لئے عالم فاضل ہونا ضروری نہیں بلکہ دل کی صفائی کی ضرورت ہے۔ پنجاب میں گرو نانک دیو نے یہی پرچار کیا اور ہندو مسلمانوں کو تلقین کی کہ قرآن اور وید۔ پیغمبر اور اوتار۔ ملا اور پنڈت۔ مسجد اور مندر کسی انسان کو ایشور سے نہیں ملا سکتے اگر اُس کا دل صاف نہ ہو اگر وہ دوسرے انسانوں سے پریم نہ کرے بلکہ خود غرضی میں پھنس کر ان کے نقصان کے درپے ہو +

گرو نانک خدا رسیدہ شخص تھے اُن کے بچن سچائی سے پر تھے اور لوگوں کے دلوں پر بڑا اثر کرتے تھے۔ دنیاوی مصیبتوں کی ستائی ہوئی خلقت نے اِن کو اس طرح قبول کیا جس طرح گرمی کے موسم میں پیاسا آدمی برف یا ٹھنڈے پانی کو پیتا ہے۔ چاروں طرف گرو نانک کی بانی سنائی دینے لگی۔ غریبوں کے مکانوں میں امیروں کے محلوں میں گرو نانک کے شبد پاپی دلوں کو ہلانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چار سو پانچسو برس کے بعد بھی گرو نانک کی روحانیت قوم کے دل میں اب تک موجود ہے اور گو سکھوں کا فرقہ خاص طور پر اُن کا معتقد ہے مگر تمام ہندو جاتی تہ دل سے اُن کی عزت کرتی ہے اور ان کی روحانیت

سے بھرے ہوئے شبد سن کر سب کے دل میں پاک خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ صوبہ آگرہ اور اودھ میں تلسی داس۔ سور داس اور کبیر نے روحانی روشنی پھیلانے میں بڑا کام کیا۔ تلسی داس کی راماین ایک اعلےٰ درجہ کی کتاب ہے۔ اور اب تک غریب اور امیر اس کو پڑھ کر لطف اور روحانی تسکین حاصل کرتے ہیں۔ بنگال اور پنجاب سے بڑھ چڑھ کر مہاراشٹر دیش میں پرچلت دھرم کی خرابیوں کی مخالفت کا خوب نشوو نما ہوا۔ اس مخالفت کو مسٹر رانا دے نے بھگوت دھرم کا نام دیا ہے۔ جو سادھ سنت مہاراشٹر میں وقتاً فوقتاً یہ نیا دھرم پھیلاتے رہے اُن میں سے ۱۰۰ سنتوں کی سوانح عمری مہاپتی نے لکھی ہے۔ ان سو مہاپرشوں میں دس عورتیں تھیں۔ دس مسلمان تھے۔ باقی نصف برہمن تھے اور نصف چھوٹی ذات کے آدمی تھے مثلاً قصائی۔ جلاہے۔ سنار چمار۔ نائی زمیندار۔ سپاہی وغیرہ۔ ہندوستان کی روحانی بغاوت کی یہ ایک خصوصیت تھی کہ پرچلت دھرم کے مخالف غریب آدمی تھے۔ اور کسی ملک میں اتنے سنت لوگ نہیں ملیں گے جنہوں نے باوجود غریب ہونے کے بڑی بڑی خرابیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور اُس کوشش میں بوجہ اپنی نیک زندگی اور بردباری اور انکساری کے کامیابی حاصل کی۔ یہ بغاوت تمام ذاتوں میں پھیل گئی اور ہندو مسلمان مرد عورت سب پر اس کا اثر ہوا۔ اس بغاوت اور کوشش سے کوئی جنگ وجدل نہیں ہوئی۔ اِن سنتوں نے اپنا کام چپکے چپکے اور آہستہ آہستہ کیا اور تمام ملک کی کایا پلیٹ دی۔ جب تک کوئی تحریک اس طرح عوام الناس

ہیں نہ پھیلے اور اُن کے دل پر چوٹ نہ لگ ئے۔ تب تک اسکی کامیابی ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے۔ مسٹر راناڈے کی رائے میں براہمو سماج اور آریہ سماج میں یہ نقص ہے کہ انہوں نے اب تک قوم کے دل پر اثر نہیں کیا۔ ان کا اثر ایسے شخصوں پر ہے جنہوں نے ایک خاص تربیت حاصل کی ہے۔ مگر بھگوت دھرم پنجاب میں یا دکن میں صرف تعلیم یافتہ لوگوں کا دھرم نہ تھا۔ ہل چلانے والے کسان۔ ترازو پکڑنے والے دوکاندار وغیرہ ہر طبقہ کے آدمی ان سادہ سنتوں کی زندگی اور پرچار سے متاثر تھے معمولی سے معمولی ان پڑھ سکھ گرنتھ صاحب کے شبد آپ کو سنا سکتا ہے مگر تعلیم یافتہ لوگوں میں بے شمار ایسے آدمی ہیں جو براہمو سماج کی روشنی سے محروم ہیں۔ ان پڑھ لوگوں کا تو کیا ذکر ہے + جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ پہلے صرف براہمن لوگ ہی تعلیم حاصل کر سکتے تھے اور ان کی ساری علمیت زبان سنسکرت میں ہوتی تھی۔ پیدائش اور موت کے موقعوں پر جو رسوم ہوتی تھیں وہ سب زبان سنسکرت کے ساتھ ادا کی جاتی تھیں۔ علوم و فنون کی کتابیں سنسکرت میں تھیں۔ جو کوئی اس زبان سے ناواقف ہوتا تھا وہ عالم کہلانے کا مستحق نہ تھا۔ ان سادہ سنتوں نے (۱) یہ پرچار کیا کہ تمام کام زبان سنسکرت میں نہ ہونا چاہئے معمولی لوگ اس زبان کو نہیں سمجھتے ۔ اور شادی غمی کے موقعہ پر جو منتر پڑھے جاتے تھے وہ عام فہم نہ تھے اس لئے ان پڑھ آدمی کو ان کے پڑھنے سے کچھ فایدہ نہ ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں ایشور کی بھگتی کرنا پڑھے ہوئے اور ان پڑھ دونوں طرح کے آدمیوں کا حق ہے۔ مگر دھرم کی کتابیں سب زبان

سنسکرت میں تھیں۔ اسلئے براہمنوں کے سوا اور باقی لوگ دھرم کے گیان سے محروم رہتے تھے۔ ان بھگتوں نے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے سنسکرت کتابوں کا ترجمہ شروع کر دیا اور اپنی اپنی زبان میں کتابیں لکھیں۔ ایکناتھ اور ٹوکارام بھگت نے سنسکرت کتابوں کے خیالات کو عام فہم زبان میں ظاہر کیا۔ براہمنوں نے ان کی سخت مخالفت کی یہاں تک کہ انہوں نے ایکناتھ اور ٹوکارام کی کتابوں کو پانی میں پھینکدیا مگر وہ پھر بھی ضائع نہ ہوئیں۔ چونکہ بودھ مت کے بعد ویدوں اور شاستروں کا زور ہندوجاتی میں کم ہو گیا تھا۔ اس لئے ان سنتوں نے رامائن۔ مہابھارت۔ بھگوت گیتا اور بھاگوت پران کا ترجمہ مرہٹی زبان میں کر دیا۔ اور ان ترجموں کی بدولت بہت سی خلقت اپنے قدیم دھرم اور تاریخ سے واقف ہو گئی۔ اب شاید ہی کوئی ہندو ہوگا جو رامائن اور مہابھارت کے قصوں سے ناواقف ہو۔ اور اسی وجہ سے وہ لوگ بھی جو پڑھے لکھوں میں شمار نہیں ہوتے تھے مہذب بن گئے۔ کیونکہ ان کتابوں میں انسانی فرائض کا نقشہ بہت اچھی طرح کھینچا گیا ہے۔ اور کوئی شخص ان کی کتھائیں کر ان کی اعلیٰ تعلیم سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی اصول کو مدنظر رکھکر مسٹر راناڈے نے یہ کوشش کی تھی کہ بمبئی کے کالجوں میں مرہٹی گجراتی وغیرہ زبانیں بھی پڑھائی جائیں۔ وہ جانتے تھے کہ صرف انگریزی زبان پڑھنے سے ہمارے لوگوں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ انگریزی میں آسانی سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ مگر اپنی مادری زبان پر قابو نہیں رکھتے۔ وہ انگریزی میں صفحہ کے صفحہ لکھ سکتے ہیں مگر اپنی زبان میں ان کو ایک خط لکھنا بھی مشکل ہے اسی وجہ سے قریباً سب تعلیم یافتہ

لوگ اپنی خط وکتابت انگریزی زبان میں کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں اخبار کم ہیں ان کو انگریزی خوان لوگ اکثر نہیں پڑھتے۔ وہ صرف انگریزی اخباروں کے گردیدہ ہیں۔ یہی حال کتابوں کا ہے۔ سب کے سب انگریزی کتابیں پڑھتے ہیں۔ کسی تعلیم یافتہ کے گھر پر جاییئے دیسی زبان کے اخبار اور کتابیں وہاں نہ ملیں گی۔ اس لئے پڑھے لکھے آدمیوں اور ان پڑھوں میں کسی قسم کا میل جول نہیں ہو سکتا اور نہ دیسی زبانوں کو ترقی ہو سکتی ہے اگر تعلیم یافتہ آدمی دیسی زبانوں کی ترقی میں کوشش کریں تو تھوڑے ہی عرصہ کے اندر دیسی زبانوں میں بھی عمدہ اخبار اور کتابیں پیدا ہو جائیں۔ مگر کسی زبان میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس زبان کی تعلیم سکول اور کالج میں دی جائے۔ مسٹر راناڈے نے بہتیری کوشش کی کہ ایم اے کورس میں مرہٹی اور گجراتی داخل ہو جائے مگر ناکامیاب رہے۔ ان کے مرنے پر لوگوں کو اندیشہ تھا کہ مسٹر راناڈے کے ساتھ یہ کوشش بھی خاک میں مل جائے گی مگر جو بیج وہ وہاں پرمش اپنے دوستوں اور شاگردوں کے دل میں بو گئے تھے وہ پھلے پھولے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ ان کے مرنے کے کچھ عرصہ بعد مسٹر چمن لعل سیتلواد نے جو بمبئی ہائی کورٹ کے نامی وکیلوں میں سے ہیں۔ اور مسٹر راناڈے کے پیرو ہونے کا فخر کرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں یہ تجویز پیش کی کہ دیسی زبانیں بھی ایم۔ اے کورس میں داخل کی جائیں۔ اکثر انگریز ممبر اس تجویز کے مخالف تھے مگر مسٹر سیتلواد کی پارٹی ایسی مضبوط تھی کہ مخالف پارٹی کو نیچا ہی دیکھنا پڑا اور

اب بمبئی یونیورسٹی میں یہ قاعدہ ہے کہ جو شخص ایم۔ اے کے لئے زبان انگریزی پڑھے اس کو ایک دیسی زبان مثلاً مرہٹی گجراتی وغیرہ بھی پڑھنی پڑتی ہے۔ مسٹر راناڈے بڑے فخر سے کہا کرتے تھے کہ آجکل یونیورسٹی کی تعلیم میں ہندوستانی زبانوں کو داخل کرنے کے لئے جو جدوجہد ہو رہی ہے وہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں ہم اُن سادھو سنتوں کی پیروی کر رہے ہیں جنہوں نے چودھویں پندرھویں صدی میں اس بات کی تلقین کی تھی کہ سب گیان زبان سنسکرت میں بند رہنا نہیں چاہئے بلکہ عام فہم زبانوں میں عوام الناس تک پہنچانا چاہئے۔ اس تلقین اور کوشش میں ان بزرگوں کو قابل قدر کامیابی حاصل ہوئی +

(۲) ان بھگتوں کی تعلیم کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ انہوں نے لوگوں کے دل سے کرم کانڈ کی عظمت اور ضرورت دور کر دی۔ اُس وقت خدا پرست وہ آدمی سمجھا جاتا تھا جو گھنٹوں پوجا کرتا رہے اور کسی سے بات چیت نہ کرے۔ وہ شخص نجات کا مستحق سمجھا جاتا تھا جو شادی غمی کے موقعہ پر پنڈتوں کو بلا کر بڑی بڑی پیچیدہ رسمیات ادا کرے۔ اس کے مقابلہ میں ان بھگتوں کا پرچار یہ تھا کہ کرم کانڈ سچے دھرم کا انگ (حصہ) نہیں ہیں۔ بلکہ اِن ظاہری رسوم کی پیروی دل کی پاکیزگی اور حقیقی بھگتی کو بجائے مدد دینے کے دور کرتی ہے۔ کیونکہ جب لوگوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ صرف رسوم ادا کرنے سے ان کو نجات مل جائے گی تو وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اُن کا چال چلن اچھا ہے یا برا ہے۔ اگر کوئی شخص گیاجی جا کر اپنے بزرگوں کا شرادھ کرایا یا بنارس اور ہردوار جا کر گنگا

میں ہنسا آیا تو سب لوگ اس کو دھرم آتما سمجھتے ہیں چاہے وہ اپنے
روزانہ بیوہار میں نامعتبر یا بے ایمان ہو۔ تیرتھ جاترا کرنے کے بعد وہ
سب گناہوں سے بری سمجھا جاتا ہے۔ ہر روز ہم دیکھتے ہیں کہ بہت
سے لوگ اپنے ماں باپ کی حیات میں اُن سے بدسلوکی کرتے ہیں اُنہیں
کھانے کو نہیں دیتے۔ اور ان کی شکل سے بیزار رہتے ہیں۔ مگر ان کا
خیال ہے کہ ماں باپ کے نام پر شرادھ کھلانے سے دیوتا خوش ہو جائینگے
یہ اعتقاد ظاہرداری کی عادت کو مضبوط کرتا ہے اور اس بات کی جرأت
دیتا ہے کہ عملی زندگی میں نیکی کی پرواہ نہ کریں۔ ان بھگتوں کے پرچار سے
لوگوں کو اس امر کا قائل ہونا پڑا کہ چاہے کوئی شخص گھنٹوں پوجا کرے
یا نہ کرے چاہے وہ اپنے بزرگوں کا شرادھ کرے یا نہ کرے خواہ وہ اور
رسمیات ادا کرے یا نہ کرے اُس کی نجات ضرور ہو گی اگر وہ اپنے عمل
میں ایماندار منصف مزاج اور رحم دل ہے۔ یہ سنت لوگ اپنے بیوی
بچوں کے ساتھ رہتے تھے اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ گھر کو چھوڑ کر
جنگلوں میں جانا فضول ہے۔ کیونکہ گرہست میں رہ کر بھی انسان پرماتما کی
سیوا کر سکتا ہے۔ اس پرچار سے عوام الناس کے اخلاق پر بہت اچھا
اثر ہوا +

(۳) ہندوؤں میں یوگی لوگ کئی کئی دن تک بلا کچھ کھانے پینے کے
سمادھی لگائے بیٹھے رہتے تھے۔ بعض ایسی حالت بنا لیتے تھے کہ
بظاہر بالکل مردہ معلوم ہوتے تھے۔ راجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ میں ایک
فقیر ہری داس نامی ۴۰ روز تک بلا کھانے پینے کے ایک مکان میں بند

رہا۔ جب مکان کھولا گیا تو دیکھنے والوں نے اس کو مردہ سمجھا مگر بعد ازاں وہ پھر اپنی حالت پر آگیا۔ ایسی کراماتیں پسند رہوئیں۔ سولھویں صدی میں بھی ہوتی تھیں اور بہت سے لوگ ایسی طاقت حاصل کرنے کی بڑی کوشش کرتے تھے اور دنیاوی فرایض سے غافل ہو جاتے تھے۔ بھگوت دھرم پرچار کرنے والوں نے بڑے زور سے بیان کیا کہ یہ کارروائی سب پاکھنڈ ہے اور یوگ ودیا کا حاصل کرنا بالکل فضول اور بے فایدہ ہے۔ بجائے اس کے آدمیوں کو چاہئے کہ اپنے فرایض پورے کریں اور خلقت کو آرام دیں +

(۴) چوتھی بات ان بھگتوں نے یہ کی کہ ذات پات کی تمیز کا زور ڈھیلا کر دیا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ان سادھ سنتوں میں مسلمان نائی دھوبی سنار کمہار چمار شامل تھے اور ان سب کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ پنجاب میں گرو نانک کے ساتھ بھائی مردانا ہمیشہ رہتا تھا اور گرو صاحب اس کو ایسا ہی عزیز سمجھتے تھے جیسے کہ اپنے اور رفیقوں کو۔ اسی طرح مہاراشٹر میں بھی یہ خیال مضبوط ہو گیا کہ ایشور کا بھگت بننے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص وید پاٹھی برہمن ہو۔ بلکہ ہر ایک شخص جو سچے دل کے ساتھ پرماتما کی پوجا کرتا ہے بھگت کہلانے کا مستحق ہے + میری رائے میں یہ موقع مناسب نہیں ہے کہ یہاں ذاتوں کے سلسلہ کی اصلیت۔ فایدے اور نقص پر بحث کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ذات کے سلسلے نے ہندو جاتی کو قایم رکھنے میں بہت کچھ مدد دی ہے۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ جب بعد

طاقت نے براہمنوں کو مغرور بنا دیا تو انہوں نے دوسری ذاتوں سے
بدسلوکی شروع کی۔ یہاں تک کہ سوائے برہمنوں کے اور ذاتوں کے
لئے پڑھنا پڑھانا ممنوع کر دیا۔ کشتری اپنی باری میں ویشوں کو نفرت
کی نگاہ سے دیکھنے لگے اور ویش لوگ شودروں کے سایہ سے
بھاگنے لگے۔ کھانا پینا بھی ذات ذات کا جدا جدا ہو گیا۔ اس طرح
جہالت کے زمانہ میں ذات کی تمیز نے نااتفاقی اور آپس کی مخالفت
خوب پھیلا دی اور قوم کی جہالت کو زیادہ وسیع اور گہرا کر دیا۔ سادھ
سنتوں نے بڑے زور سے پرچار کیا کہ پرماتما کی نظروں میں براہمن
اور شودر برابر ہیں۔ اگر شودر کے اعمال براہمن کے اعمال سے بہتر ہیں
تو برہمن کو شودر پر کوئی فضیلت نہیں۔ براہمن اور شودر جنم سے کوئی
شخص نہیں ہو سکتا بلکہ اپنے کرموں سے ہر ایک شخص براہمن اور
شودر ہو سکتا ہے۔ اس پرچار نے براہمنوں اور دوسری اونچی
ذاتوں کے گھمنڈ کو بہت کچھ ڈھیلا کر دیا۔ اور بجائے نفرت
اور نااتفاقی کے قوم کے مختلف طبقوں کو محبت اور یگانگت کی
زنجیر میں جکڑ دیا۔

(۵) جو شخص کالی دیوی کی پرستش کرتے تھے وہ اس کو خوش کرنے
کے لئے جھوٹوں اور بکروں کی قربانی کرتے تھے اب بنگال میں دسہرہ
کے روز بیشمار بکرے ذبح کئے جاتے ہیں۔ سوائے اُن لوگوں کے
کہ جن کے دل کو عادت اور رواج نے سخت بنا دیا ہے ہر ایک شخص
کو یہ رسم نہایت مکروہ اور نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ دھرم کی

بنیاد رحمدلی پر ہونی چاہئے نہ کہ بے زبان جانوروں کے خون پر۔ مگر
لکیر کے فقیر ایک غلط خیال کی پیروی میں ہزاروں جانوروں کی جانیں
ضائع کرتے ہیں۔ یہی خیال بام مارگ کے فرقہ کا ہے۔ سنا جاتا ہے
کہ بام مارگی لوگ دھرم کے نام پر بدکاری اور شراب خوری کرتے
ہیں۔ ان خراب رسموں اور فرقوں کی پول بھگوت دھرم والوں نے
خوب کھولی۔ اور اس طرح وہ لوگوں کو راہ راست پر لائے۔

(۶)۔ یہ بھگت لوگ ایک پرمیشور کے ماننے والے تھے اور دیوی
دیوتاؤں کی پرستش کے سخت مخالف تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی پرستش
درحقیقت اگیان کا نتیجہ ہے۔ جن شخصوں کو اصلی گیان نہیں ہے وہ
سورج کو دیوتا مانتے ہیں۔ چاند کو دیوتا مانتے ہیں پانی کو دیوتا مانتے
ہیں۔ ہوا کو دیوتا مانتے ہیں وغیرہ وغیرہ حالانکہ یہ چیزیں پرماتما کی
طاقت کے مختلف پہلوؤں کا کچھ کچھ اظہار کرتی ہیں۔ اور الوہیت
کا ان میں کوئی جز نہیں۔ گیانی پرش چاند سورج اور ہوا پانی کی
تہ میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور گیان کی نظر سے پرماتما کی
بیحد اور لاثانی ذات کو دیکھتا ہے۔ اس کی نگاہ میں چاند اور سورج
آگ اور پانی ایسے ہی فانی ہیں جیسے کہ انسان ہے بلکہ ایک خاص
لحاظ سے انسان کا درجہ اُن چیزوں سے برتر ہے۔ کیونکہ انسان
ذی عقل ہے اور چاند سورج وغیرہ ذی عقل نہیں۔ دیوی دیوتاؤں
کی پرستش کرنے والے لوگ اگرچہ ان کو پرماتما سے کم درجہ دیتے
ہیں مگر اپنے اگیان کی وجہ سے اکثر اس فرق کو بھول جاتے ہیں اور

پرماتما کی طرف دھیان نہیں کرتے۔ یہی حال مورتی پوجن (بت پرستی) کرنے
والوں کا ہے۔ وہ بھی مورتیوں کو اصلی پرماتما نہیں سمجھتے۔ مگر اُن میں
اتنی عقل نہیں ہوتی کہ مورتیوں سے وہی کام لیں جو کہ ایک مہذب شخص
اپنے کسی دوست کی تصویر سے لیتا ہے۔ یعنی اس تصویر کے ذریعہ
سے اپنے دوست کو یاد کرتا ہے اور اس سے ملنے کی تمنا کرتا ہے۔
مورتی پوجن کرنے والے اپنی پوجا مورتیوں تک ہی محدود رکھتے ہیں
اور اس پرماتما کو جس کا نہ کوئی جسم ہے اور نہ لباس ہے بھول جاتے
ہیں۔ اس لحاظ سے مورتی پوجن انسان کے خیالات کو بجائے بلند
کرنے کے پست کرتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ جو لوگ بت
پرست نہیں وہ سب خدا رسیدہ ہوتے ہیں یا کہ اُن لوگوں سے جو بت
پرست ہیں اپنی عملی زندگی اور چال چلن میں لازمی طور پر بہتر ہوتے
ہیں۔ بت پرست اور خدا پرست دونوں کو اپنے اعمال کا نتیجہ ملے گا۔
پرماتما کی نظروں میں دونوں برابر ہیں اور بمقابلہ اُن خدا پرستوں کے
جو بت پرستوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں پرماتما غالباً بت
پرستوں کو رحم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بھگوت دھرم کا پرچار کرنے
والے سادہ سنت بھی بت پرستوں کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے
تھے بلکہ ان کو محبت اور پیار سے بتلاتے تھے کہ دیوی اور دیوتا
اور پتھر کی مورت کسی شخص کو پرماتما تک نہیں پہنچا سکتی۔ انسان
کو چاہیے کہ فرضی سہاروں کی جگہ پرماتما کا اصلی اور سچا سہارا ڈھونڈے۔
گرو نانک نے اور کبیر نے اپنے موثر شبدوں سے سب کے دل پر

یہ بات اچھی طرح سے جما دی کہ پرماتما کے سامنے دیوی دیوتا بے بس ہیں اور کسی کی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ اس مضمون پر گرو نانک اور کبیر کے شبد ایسے پرزور ہیں کہ ہر ایک شخص ان کو سن کر قایل ہو جاتا ہے۔ مرہٹہ دیش کے سنتوں نے بھی اس پرچار کو بڑے زور شور سے کیا اور لوگوں کو ایک پرماتما کی پرستش سکھا کر ان کا حوصلہ بلند کر دیا +

(۵) ان بھگتوں کو پرماتما میں بڑا پکا بشواس تھا وہ اس کو سب جگہ حاضر ناظر سمجھتے تھے ان کو اس بات کا یقین تھا کہ امیر اور غریب۔ مرد اور عورت براہمن اور شودر ہر ایک سے پرماتما اسی طرح پیار کرتے ہیں جیسے کہ ماں باپ اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں چاہے وہ خوبصورت ہوں یا بدصورت۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ہم پرمیشور کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اس کی آواز سنتے ہیں۔ اور اس سے بات چیت کرتے ہیں اس لیئے وہ اس بات کا پرچار کرتے تھے کہ ہر ایک شخص پرماتما سے مل سکتا ہے کیونکہ پرماتما سب کے قریب ہے۔ پرمیشور سے ملنے کے لیئے وہ بھگتی اور پریم کو کرم کانڈ۔ تیرتھ جاترا۔ برت۔ دیا وغیرہ پر ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ ان باتوں کا جسم اور من سے تعلق ہے۔ مگر پرمیشور انسان کی روح کو اپنی سیوا میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ سب سے بڑا دان یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو پرمیشور کی سیوا اور مرضی کے ارپن کر دیں اور کسی چیز کو اپنا نہ سمجھیں۔ سب سے بڑا تپ یہ ہے کہ ہم پرمیشور کے سامنے انکساری کریں۔ گیان۔ یوگ۔ تندرستی۔ دولت اور اولاد بھی نکمی ہے۔ سب سے اچھی چیز یہ ہے کہ پرمیشور اور اس کی مخلوقات سے

پریم کیا جائے۔ سنت نام دیو جب درخت کی چھال اتارنے لگا تو
اُس کے آنسو نکل پڑے کیونکہ اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا درخت
سے خون نکلنے لگا۔ اس لئے اس نے اپنے بدن پر کلہاڑی لگائی
تاکہ اسے درخت کی تکلیف معلوم ہو۔ سنت شیخ محمد قصائی کے گھر پیدا
ہوا تھا اس نے اپنے بدن پر چاقو سے زخم لگا کر تکلیف محسوس کی
اور قصائی کا کام کرنے سے انکار کر دیا۔ سنت ٹوکا رام جب کھیت
کی رکھوالی کرنے گیا تو اس کو دیکھ کر چڑیاں بھاگ گئیں۔ وہ سمجھ گیا
کہ مجھ میں ضرور کچھ نقص ہے۔ ورنہ چڑیاں مجھ سے کیوں ڈرتیں۔ یہ حد درجہ
کی روحانیت اور اپنے آپ کو پرمیشور کے ارپن کر دینا آجکل تعجب کی
بات معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ ہمارے حالات اب مختلف ہیں۔ اس میں
شک نہیں کہ آج کل ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ اپنی طبیعت میں
سختی اور طاقت مقابلہ کو داخل کریں۔ مگر یہ مناسب نہیں کہ ان سنتوں
کے کام کا ہم اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق اندازہ لگاویں۔ جب
ہندو سنتوں کا اسلام سے مقابلہ ہوا تو انہوں نے تعصب کی سختیاں پیدا
کر کے ان پر غلبہ حاصل کیا۔ بہت سے مسلمان اُن کے پیرو ہو گئے۔
اور انہوں نے بھی بہت سے مشہور بھجن بنائے۔ یہ سنت لوگ مسلمانوں
کے مقابلہ میں خاص کامیاب ہوئے۔ انہوں نے لڑائی کر کے نہیں
بلکہ پرمیشور کی مرضی پر شاکر رہ کر یہ روحانی فتح حاصل کی۔ اُن کی کوشش سے
ہندو اور مسلمان دونوں مان گئے کہ رام اور رحیم دراصل ایک ہی ہیں
یہ اتحاد سیواجی کے ظہور سے پیشتر پختہ ہو چکا تھا۔ باوجود اس بات

کے کہ کبھی کبھی مسلمانوں کا تعصب بھڑک اٹھتا تھا۔ جو یہ چاران سنتوں نے مہاراشٹر دیش میں کیا اس کی بدولت مرہٹہ قوم روحانی غلامی سے آزاد ہوگئی اس کا حوصلہ بلند ہوگیا اور ہمت بڑھ گئی۔ آپس کی نااتفاقی دور ہوگئی اور برہمن اور رشودر ایک دوسرے کی رعایت کرنے لگے الغرض مرہٹہ قوم اس قابل ہوگئی کہ اس وقت کے مسلمانوں کی پُر تعصب اور جابر حکومت کی جگہ اپنی حکومت قائم کرے۔ اسی وجہ سے سیواجی کے گرو رام داس نے اُس سے کہا تھا کہ اپنے باپ دادا کے دھرم پر قائم رہو کیونکہ اس میں روحانیت اور بے تعصبی موجود تھی +

خلاصہ ۔ مسٹر رانا ڈے فرماتے ہیں کہ ان بھگتوں نے یہ کام کیا جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ ہم کو بھی آجکل یہی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کسی شخص کو یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ راجہ رام موہن رائے نے یا کسی اور انگریزی خوان ہندوستانی نے اس کام کو شروع کیا ہے۔ یہ کام انگریزوں کے عہد حکومت سے پیشتر سے جاری ہے۔ مسلمانوں کے وقت میں مذکورہ بالا سادھو سنتوں نے اور ان سے پیشتر بدھ دیو نے۔ ان سے بھی پیشتر بھگوت گیتا نے اور اُس سے پہلے پرہلاد اور واسدیو نے ریفارم کے مبارک کام کو کیا تھا اور گری ہوئی قوم کو بلند ہمت اور بلند خیال کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لئے جب ہم سوشل ریفارم کی طرف توجہ کرتے ہیں ہم کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ہم یوروپین لوگوں کی تعلیم پر چلتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ریفارم کے معاملہ میں ہمارے بزرگوں کی مثال اور کوشش ہماری ہدایت کے لئے کافی ہے۔ ہم کو غیروں کی پیروی کی بالکل ضرورت

نہیں - اگر ہم ان بھگتوں کی مثال سامنے رکھ کر کوشش کریں تو ہم ضرور کامیاب ہونگے کیونکہ ہمارا کام پرماتما کا کام ہے - اور جیسے کہ قدیم زمانہ میں ریفارم کے معاملہ میں غریب آدمیوں کو کامیابی ہوئی - آجکل بھی دیندار لوگوں کو ضرور کامیابی ہوگی بشرطیکہ ہم پرماتما کے قاعدوں کے مطابق چلیں - گرو نانک غریب آدمی تھے - کبیر صاحب بہت غریب تھے مگر پرماتما کی بھگتی نے اُن کے دل کو امیر بنا رکھا تھا وہ کسی دنیاوی لالچ کی پرواہ نہیں کرتے تھے - اگر ہم لوگ جو موجودہ زمانہ میں اپنی قوم کی مردہ ہڈیوں میں نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں اور اس کی موجودہ بدصورتی سے رنجیدہ ہو کر اس کو خوبصورت بنانا چاہتے ہیں - خود غرضی - خود پسندی - کینہ اور حسد کو چھوڑ کر دیش بھگتی میں تولین ہو جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری کوشش کامیاب نہ ہو ٭

ریوایول یا ریفارم - ہم کو نئے زمانہ کی رسمیں جاری کریں -

یہ بات سب جانتے ہیں کہ خالص دھرم کا تعلق انسان کی اعلےٰ خواہشوں سے ہے اور مختلف مذہبوں کا اصلی منشا یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کرے - اور اس کے حکم کی پیروی کر کے اعلےٰ درجہ کی زندگی بسر کرے جس سے اُس کا اور دیگر انسانوں کا فائدہ ہو - گو مختلف مذاہب کے پیرو بہ معراج تسلیم کرتے ہیں مگر بدقسمتی سے آپس میں ان کی عداوت ایسی ہے کہ جیسے ایک مذہب کے سوا دوسرے مذہب والے ڈاکو اور لٹیرے ہیں اور اُن کے وجود سے دنیا کا سخت نقصان ہو رہا ہے - عیسائی اس بات

میں مشغول ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہبوں کو جھوٹا ثابت کریں۔
مسلمان شروع سے عیسائیوں اور ہندوؤں کو کافر سمجھتے آئے ہیں۔
ہندوؤں کی نظروں میں عیسائی اور مسلمان دونو گمراہ ہیں۔ یہ عداوت
زبانی جمع خرچ تک محدود نہیں رہی بلکہ بہت سے کشت و خون اور ناانصافیوں
کا بھی باعث ہوئی ہے۔ عیسائیوں اور مسلمانوں نے ہندوؤں کے
رسم و رواج پر اُن کے دھرم اور دیوی دیوتاؤں پر ہمیشہ حملے کئے۔ مگر جب
ہندوؤں میں سے آریہ سماج نے ہندو مذہب کی تائید کی اور عیسائی
مت اور اسلام کے نقصوں کو ظاہر کرنا شروع کیا تو عیسائیوں اور مسلمانوں
کو سخت ناگوار گذرا۔ ان کا خیال تھا کہ گو عیسائی اور مسلمان ہندوؤں کے
مذہب کو گالیاں دیتے رہیں ہندوؤں کا حق نہیں کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب
دیں۔ اسی طرح ہندوؤں میں ممبران برہمو سماج اور آریہ سماج نے
پُرانے فیشن کے ہندوؤں کے عقاید کی خوب دھجیاں اڑائی ہیں مگر
جب مسز بیسنٹ نے اپنی غیر معمولی لیاقت۔ جوش
اور استقلال سے سناتن دھرم کے اصولوں کی وکالت
شروع کی تو ہمارے دھرماتما بزرگوں نے انصاف
کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ سب کہنے لگے کہ یہ کون ہے جو سناتن
دھرم کی وکالت کرتی ہے یہ گورنمنٹ کی جاسوس ہے۔
اور ہندوؤں کو ہمیشہ کے لئے انگریزوں کا غلام رکھنا
چاہتی ہے۔ اس کی مورت بنا کر جلانی چاہئے۔ اور
بڑی کوشش کرنی چاہئے کہ اس کا کام خراب ہو۔

چاروں طرف سے دھرم کے سیوکوں نے شور مچانا شروع
کر دیا۔ مسٹر رانا دے معمولی لوگوں کے کینہ وحسد سے بالکل
بری تھے۔ مگر چونکہ پرارتھنا سماج کے ممبروں کا اُن
کے ساتھ زیادہ تعلق تھا۔ ان کی ہر روز کی شکایت سے
مسٹر رانا دے کے دل میں مسز بیسنٹ کے پرچار
سے ڈر پیدا ہو گیا۔ اور بجائے اس کے کہ کچھ عرصہ انتظار
کرتے اور دیکھتے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ انہوں نے
۹۷ء کی کانفرنس میں قدیم ہندو زمانہ کے پوجاریوں پر بڑے زور
سے یورش کی اور نہ صرف مسز بیسنٹ کے خیالات کو بیہودہ ثابت کرنے
کی کوشش کی بلکہ آریہ سماج کے مشہور اصول نیوگ پر بھی حملہ کیا۔ اگر مسز
بیسنٹ کا نام لے کر مسٹر رانا دے گالیاں دیتے تو ممبران آریہ سماج
کو شکایت نہ ہوتی۔ چونکہ انہوں نے تقریر اس پیرایہ میں کی تھی کہ اس سے سوامی
دیانند کے خیالات پر بھی چوٹ لگی اسلئے آریہ سماجی بھائی بھی شکایت کرنے
لگے کہ مسٹر رانا دے کا حملہ بالکل بیجا ہے ٭

ریوایول یا ریفارم کے سوال پر مسٹر رانا دے نے مفصلہ ذیل الفاظ
میں ریوایول کے حامیوں کی بیہودگی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "جو لوگ
ہم سے یہ کہتے ہیں کہ ہم کو قدیم زمانہ کی رسمیں جاری کرنی چاہئیں ہم اُن
سے یہ سوال کرتے ہیں کہ ہندوؤں کی تاریخ کے کونسے زمانہ کی رسمیں
ہمیں دوبارہ جاری کرنا مناسب ہیں۔ ویدوں۔ سمرتیوں۔ پرانوں۔ مسلمانوں
کے زمانہ میں سے ہم کو کونسا زمانہ پسند کرنا چاہئے۔ کیا ہم کو اس زمانہ کے رسم

درواج جاری کرنے چاہئیں - جبکہ برہمن لوگ شراب پیتے تھے اور گوشت کھاتے تھے - اُس زمانہ کے دیوتا اور آدمی شراب اور گوشت کا استعمال اس طرح کرتے تھے کہ آجکل کوئی شخص بھی اُن عادات کو پسند نہ کرے - کیا ہم کو ۱۲ قسم کے بیٹوں اور آٹھ قسم کی شادیوں کا رواج جاری کرنا چاہئے جس کی رو سے عورت کو جبراً پکڑ کر شادی کرنا اور مرد عورت کا ناجائز تعلق مناسب سمجھا جاتا تھا - کیا ہم کو بھائی کی بیوہ کے ساتھ نیوگ کرنے کا رواج جاری کرنا چاہئے - کیا ہم کو رشیوں اور اُن کی بیویوں کی بدکاری کے زمانہ کو اپنے ملک میں واپس لانا چاہئے +

کیا ہم کو وہ زمانہ واپس لانا چاہئے جس میں دیوتاؤں کو خوش کرنیکی غرض سے بیشمار جانوروں کی قربانی کی جاتی تھی - کیا ہم کو شکتی کی پرستش جس سے بدکاری پھیلتی تھی پھر جاری کرنی چاہئے - کیا ہم کو ستی اور بچہ کشی اور زندہ آدمیوں کو دریاؤں میں ڈبونے کی رسم جاری کرنی چاہئے کیا ہم کو وہ زمانہ واپس لانا چاہئے جبکہ برہمنوں اور کشتریوں میں سخت لڑائیاں رہتی تھیں اور ملک کے اصلی باشندوں پر آریہ قوم ظلم اور ستم کرتی تھی +

کیا ہم کو وہ زمانہ واپس لانے کی کوشش کرنی چاہئے جبکہ ایک مرد کی کئی بیویاں ہوتی تھیں اور ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے تھے - کیا ہم کو براہمنوں سے درخواست کرنی چاہئے کہ وہ امیر اور جنٹلمین بننا چھوڑ دیں اور قدیم زمانہ کی طرح راجاؤں کے دان پہ

پر زندگی بسر کریں*

یہ نظریں کافی طور سے ثابت کرتی ہیں کہ پرانے زمانہ کے رسم و رواج کو دوبارہ جاری کرنے کی تجویز بالکل عمل میں نہیں آسکتی اور نہ اُس سے ہماری بہتری ہو سکتی ہے۔ اگر یہ رسمیں عمدہ اور مفید تھیں تو ہمارے بزرگوں نے انہیں کیوں بدلا۔ اگر وہ خراب اور مضر تھیں تو ان کو اتنی صدیوں کے بعد دوبارہ جاری کرنے میں کیا خوبی ہے۔ علاوہ ازیں سوسائٹی ایک جاندار شے کی طرح ہے اور اس کی گذشتہ حالت پھر واپس نہیں آسکتی۔ اس لئے گذشتہ رسم و رواج کو دوبارہ تازہ کرنے کی بجائے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ موجودہ رسم و رواج کی اصلاح کی جائے"۔

مذکورہ بالا سپیچ پڑھنے کے بعد مجھے نہایت ادب اور افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس نکتہ چینی سے مسٹر رانا دے نے اُن لوگوں کے ساتھ جو قدیم زمانہ کے رسم و رواج جاری کرنا چاہتے ہیں سخت ناانصافی کی ہے۔ قریباً ہر ایک لیکچر میں اور خصوصاً سنہ ۱۸۹۸ء اور سنہ ۱۹۰۰ء کے لیکچروں میں جو انہوں نے سوشل کانفرنس میں دیا تھا۔ مسٹر رانا دے نے خود اُس قدیم زمانہ کی جس کو وہ ویدک زمانہ کہتے تھے بڑے فخر سے تعریف کی ہے۔ اور بیان کیا ہے کہ "ہم لوگ جو آجکل سوشل ریفارم کے کام میں مشغول ہیں ہندوؤں سے انگریزوں کے رسم و رواج کی پیروی کرانا نہیں چاہتے۔ بلکہ ہندو سوسائٹی میں اُن قاعدوں کو دوبارہ جاری کرنا چاہتے ہیں جو ہندو قوم کی ترقی کے زمانہ میں موجود تھے"۔ کیا

مسٹر رانا دے کے لئے اس بات کا سمجھنا مشکل تھا کہ وہ لوگ جو آجکل
قدیم زمانہ کے قاعدوں کی تائید کرتے ہیں قریباً انہیں قاعدوں کو جاری
کرانا چاہتے ہیں جن کو مسٹر رانا دے خود پسند کرتے تھے۔ لڑکے لڑکیوں
کو تعلیم دینا۔ لڑکے لڑکیوں سے برھمچرج کرانا۔ عورتوں کی عزت کرنا
بدھوا بواہ کی اجازت دینا۔ مختلف ذاتوں کی بیشمار شاخوں کے اختلاف
کو دور کرنا۔ ذات پات کی تمیز کی سختی اور ناانصافی کو کم کرنا۔ غیر ملکوں
میں تعلیم اور تجارت کے لئے سفر کرنا۔ یہ سب ایسی اصلاحیں ہیں
جن کے متعلق مسٹر رانا دے کے خاص دوستوں۔ آریہ سماجیوں اور
مسز بیسنٹ میں بہت کم فرق ہے۔ ہر ایک سچا ہی خواہ قوم یہی چاہتا ہے
کہ ہماری سوسائٹی میں ایسے رواج اور قاعدے جاری ہوں جن سے
لوگوں کا حوصلہ بلند ہو۔ ان کا جسم توانا ہو اور دل و دماغ روشن ہوں +
کوئی شخص سناتنیوں میں بھی ایسا موجود نہیں جو ناپاک اور ناجائز رسوم
کو ہماری سوسائٹی میں دوبارہ جاری کرانا چاہے۔ نیوگ کو آریہ سماج
کے ممبر ویدوں کے رو سے جائز قرار دیتے ہیں مگر ان میں سے اسپر
عمل کرنے کے لئے کوئی بھی تیار نہیں۔ مسز بیسنٹ بدھوا بواہ کے
خلاف ہے نہ اس وجہ سے کہ ان کا دوبارہ شادی کرنا شاستروں کی
رو سے ناجائز ہے بلکہ اس نیت سے کہ بدھواؤں کو تعلیم کے کام میں
مدد دینی چاہیے۔ ہم کہ سکتے ہیں کہ ہماری سوسائٹی کی حالت آجکل
ایسی نہیں کہ کم عمر بدھواؤں کی شادی نہ کیجائے یا کہ وہ تعلیم کے کام میں
مدد دے سکیں۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ باوجود ساٹھ ستر سال کی کوشش

اور پرچار کے بہت تھوڑے لوگ بدھواؤں کی شادی کو مناسب سمجھتے ہیں تو مسز بیسنٹ کی رائے کہ ہم کو بدھواؤں سے تعلیمی کام میں مدد لینی چاہئے کچھ زیادہ نامناسب معلوم نہیں ہوتی۔ اسی طرح گو وہ چاروں ذاتوں کو قایم رکھنا چاہیے گر ان کی بیشمار شاخوں کو قایم رکھنے کے سخت خلاف ہے۔ اس لئے اُن لوگوں کے خیالات جو قدیم زمانے کے رسم و رواج کو دوبارہ جاری کرانا چاہتے ہیں ایسے بیہودہ نہیں جیسا کہ مسٹر رانا ڈے نے اپنی مذکورہ بالا تقریر میں ان کو ظاہر کیا ہے۔ ورنہ جیسے کہ مشہور لالہ لاجپت رائے نے دسمبر ۱۹۰۴ء کی ہندوستان ریویو کے آرٹیکل "ریوایول یا ریفارم" میں بیان کیا ہے۔ ریفارم کے مددگاروں سے بھی یہ سوال ہو سکتا ہے کہ کیا وہ انگریزوں کے نمونہ پر ہماری اصلاح کریں گے یا اہل فرانس کے نمونہ پر۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ہم عیسائیوں کے قانون طلاق کی پیروی کریں۔ یا اہل امریکا اور فرانس کی طرح عارضی شادی کا رواج جاری کریں۔ کیا وہ ہماری عورتوں کو ایسے پیشوں میں داخل کرکے کہ جن کے لئے قدرت نے ان کو نہیں بنایا مرد بنانا چاہتے ہیں۔ کیا وہ مہابھارت کے وقت کے جایز نیوگ کی جگہ ایسا ناجایز اور خلاف اخلاق نیوگ ہماری سوسایٹی میں جاری کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ آجکل یورپ میں رائج ہے۔ کیا وہ ایسی اصلاح کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اتوار کو شراب پیا کریں اور گائے کا گوشت کھایا کریں۔ کیا وہ چاہتے ہیں کہ ہم غیر ملکوں کے رسم و رواج کو اختیار کرکے اور یورپین سوسایٹی کی خرابیاں قبول کرکے اپنی سوسایٹی میں انقلاب پیدا کریں؟

اِن سوالات کو سُن کر ریفارم کے مددگار فوراً پکار اٹھیں گے کہ ہم ان برائیوں کو ہندو سوسائٹی میں داخل کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ یہ فرمائینگے کہ ہم اہل یورپ کی آزادی۔ وقت کی پابندی۔ بلند ہمتی۔ تعلیم اور تحقیقات کا شوق اور حب الوطنی ہندو سوسایٹی میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اسی طرح ریوایول کے مددگار بھی یہ بات نہیں کہ سکتے کہ ہم قدیم زمانہ کی خراب رسمیں جاری کرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ پرانے آریاؤں کے وہ قاعدے جاری کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم لوگ بہادر۔ اولوالعزم۔ محب قوم۔ قول اور فعل کے سچّے۔ بلوان۔ وِدوان اور دھن وان۔ عالم اور فاضل بن جائیں اور ہماری قوم پھر تمام دنیا کی استاد بنے۔ ذرا غور کریں تو ریفارم اور ریوایول کا عندیہ ایک ہی معلوم ہوتا ہے اور چونکہ خود مسٹر رانادے کی یہ پختہ رائے تھی کہ موجودہ ناقص رسم و رواج ہماری ترقی کے زمانہ میں موجود نہ تھے اس لئے وہ لوگ جو ہماری قدیم ترقی کے زمانہ کے رواجوں کو ہندو سوسائٹی میں داخل کرنا چاہتے ہیں درحقیقت وہی کام کر رہے ہیں جو مسٹر رانادے کرنا چاہتے تھے۔ مسٹر رانادے ہر ایک شخص کے خیالات اور کام کو ہمیشہ ہمدردی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مجھے بڑا تعجب ہے کہ انہوں نے ریوایول کے مددگاروں کی اصلی منشاء پر غور نہ کیا اور معمولی نکتہ چینوں کی طرح ان کی بیہودگی ثابت کرنے کی کوشش کی +

آجکل بھی ہم کو رشی بننے کا موقع حاصل ہے

سنہ ۱۹۰۰ء میں کانگرس اور سوشل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں
ہوا تھا۔ مسٹر راناڈے اُن دنوں بیمار تھے۔ اس لئے وہ لاہور
نہ آسکے۔ اور سوشل کانفرنس میں پڑھنے کے لئے جو سپیچ انہوں نے
تحریر کی تھی اُس کو اُن کے شاگرد رشید مسٹر گوکھلے نے کانفرنس میں
پڑھا۔ اس سپیچ میں بھی وہی خیالات تھے جو مسٹر راناڈے کانفرنس کے
کئی جلسوں میں پہلے ظاہر کر چکے تھے۔ ملک ہند اور ہندو قوم سے
اُن کو جو محبت تھی وہ اسے ظاہر کئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ وہ بار بار
ہندو قوم کے زمانہ ترقی کو نگاہ شوق سے دیکھتے تھے اور قدیم زمانہ
کو یاد کر کے امید کرتے تھے کہ ہندوؤں کا ستارہ پھر بلندی پر پہنچے گا۔
سنہ ۱۹۰۰ء کے لیکچر میں انہوں نے یہ بات ثابت کی کہ ہندوستان کی
قدیم رونق کے زمانہ میں یا تو برہمن کشتری ویش اور شودر کی جدا جدا
جماعتیں قایم نہیں ہوئی تھیں یا اُن کا آپس کا فرق زیادہ مستقل نہ تھا۔
اس وقت راجہ لوگ اپنی لڑکیاں براہمنوں کو شادی میں دیتے
تھے۔ اور براہمن اپنی لڑکیوں کی شادی راجاؤں سے کرتے تھے۔
راجہ مہاراجہ علم حاصل کرتے اور تپ جپ کر کے براہمن بن جاتے
تھے۔ اور براہمن لوگ تیر اندازی (دھن) سپاہ گری سیکھ کر فوجوں کے
سردار (سیناپتی) بنتے تھے جیسے کہ کورو پانڈو کی لڑائی میں درونا
چارج جو ذات کے براہمن تھے فن سپاہگری میں سب کے مسلمہ استاد

تھے۔ عورتوں کا یہ حال تھا کہ بہت سی عورتیں تمام عمر شادی نہیں کرتی
تھیں۔ بلکہ ودیا حاصل کرنے میں اور ایشور کی بھگتی میں مشغول رہتی
تھیں۔ رشیوں کی زندگی بڑی سادہ ہوتی تھی۔ اور سادہ مزاجی اور
بلند خیالی کا اعلےٰ نمونہ تھی۔ ہر ایک رشی اپنی بیوی کے ساتھ رہ کر
ڈنگر پالتا تھا اور کھیتی کرتا تھا۔ بے شمار شاگردوں کو ودیا پڑھاتا
تھا۔ اور رفتہ رفتہ نئی بستیوں اور شہروں کی بنیاد رکھتا تھا۔ اِن
رشیوں کی مدد سے آریہ قوم کے راجاؤں نے شمال سے جا کر جنوبی
ہند میں اپنی بادشاہت قائم کی۔ اگست اور اتری نامی رشیوں نے
جنوبی دکن میں آریہ تہذیب پھیلائی۔ جب رامچندر لنکا جا رہے تھے
تو اِن رشیوں کے آشرم میں ٹھہرے تھے۔ والمیک نے اِن آشرموں
کا جو حال اپنی رامائن میں لکھا ہے وہ آجکل بھی بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے
اُس زمانہ کے رشی بڑے عالم فاضل ہوتے تھے اور کیا لڑائی کے وقت میں اور کیا
امن کے دنوں میں راجہ مہاراجہ ان رشیوں کی رائے پر چلتے تھے۔ اعلےٰ
علمیت اور پارسائی میں برہم رشی اور راجہ رشی یکساں ہوتے تھے۔
راجہ جنک زبردست راجہ تھا۔ مگر وہ بڑا عالم اور پارسا شخص تھا۔
راجہ بامدیو اپنی پارسائی۔ علمیت اور بھگتی کے لئے مشہور تھا۔ اجات
شترو کاشی کا راجہ تھا برہم رشی بلاکی کا استاد تھا۔ اس سے ظاہر
ہے کہ نہ صرف براہمن لوگ ہی ودیا حاصل کرتے تھے بلکہ کشتری
راجا اور براہمن ایک دوسرے سے حسب ضرورت ودیا سیکھتے تھے۔
درحقیقت براہمن اور کشتری کے کام کی مستقل تقسیم نہ تھی۔ اپنی مرضی

اور تعلیم کے مطابق کشتری لوگ براہمن بن جاتے تھے اور براہمن لوگ کشتری کا کام کرتے تھے۔ اب حل طلب سوال یہ ہے کہ بعد میں خاص براہمن لوگ کس طرح سے اُس عزت کے مالک ہو گئے جو اور کسی ذات کو حاصل نہیں۔ اس معاملہ کی اصلیت یہ ہے کہ کشتری راجاؤں کو سنہ عیسوی کے شروع میں غیر ملک کے لوگوں نے اپنا تابعدار بنا لیا آریہ قوم کو اپنے نئے بادشاہوں سے کچھ محبت نہ تھی۔ چونکہ کشتری راجاؤں نے کوئی مستند شاستر نہیں لکھے تھے اس لئے براہمنوں نے جن کے بڑے بڑے رشیوں کا نام لوگ بڑی عزت سے یاد کرتے تھے اپنی تحریرات سے عوام الناس میں اپنی طاقت بڑھالی۔ جو پوران اس زمانہ میں لکھے گئے تھے انہوں نے بھی براہمنوں کی عزت بڑھانے میں بڑی مدد دی۔ رفتہ رفتہ رشی کا خطاب براہمنوں کے لئے مخصوص ہو گیا اور براہمن ہی پڑھی لکھی جماعت تصور ہونے لگے۔ جب تک وشنومت نے براہمنوں کی عزت میں فرق نہ ڈالا اُن کی عزت بڑھتی گئی۔ پنجاب میں سکھوں کی بدولت جو مخالفت براہمنوں کی ہوئی اس نے ذات پات کی تمیز دور کر کے لوگوں کے خیالات میں ایسی تبدیلی پیدا کی کہ جس کی نظیر ہندوستان کے اور حصوں میں بالکل پائی نہیں جاتی۔ سکھوں میں گرنتھ صاحب نے ویدوں اور پورانوں کی جگہ لے لی ہے اور گوروؤں اور ان کی اولاد کو وہی عزت ملتی ہے جو قدیم زمانہ میں براہمنوں کو ملتی تھی۔ آجکل انگریزی حکومت کی وجہ سے نئی نئی طاقتیں ہماری سوسائٹی میں کام کر رہی ہیں۔ اور اب

ہر شخص کو پوری پوری آزادی ہے کہ اپنے اعمال بہتر بنا کے رشی کا درجہ حاصل کرے۔ اگرچہ ہم کو قدیم زمانہ کی باتیں جاری کرتے وقت موجودہ زمانہ کی ضروریات کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے تاہم قدیم زمانہ کے قاعدوں کو سامنے رکھکر ہم نوجوانوں کے دل میں ودیا کا پیار۔ مختلف مضامین کے مطالعہ کا شوق اور گورو کی وہ محبت اور عزت قایم کر سکتے ہیں کہ جس کے بغیر کوئی سلسلہ تعلیم مکمل نہیں ہو سکتا ساتھ ہی ہم کو چاہیئے کہ اپنے نوجوانوں کو دنیا کے حالات سے واقف کریں تاکہ وہ دوسروں کو حقارت سے نہ دیکھیں اور ان طاقتوں کا جو دنیا میں کام کر رہی ہیں ٹھیک اندازہ لگائیں۔ اس کے علاوہ ہم کو اپنی گفتگو اور اپنے اعمال سے انسان کی محبت ظاہر کرنی چاہیئے اور رسم و رواج کو اپنی کانشنس کا مطیع رکھنا چاہیئے۔ ہم کو اس بات کا بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ہماری سوسایٹی میں ایسے گروہوں کا نیا فرقہ قائم نہ ہو جائے جو خانہ داری سے آزاد ہوں۔ اس میں کلام نہیں کہ جو لوگ جنجی رہ کر انسان کی خدمت کرتے ہیں انہوں نے دنیا کو بہت کچھ فایدہ پہنچایا ہے مگر میری رائے میں وہ انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو سے ناواقف رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں ہمارے لئے سب سے اچھی مثال ان رشیوں کی ہے جو اپنی استری کے ساتھ رہ کر اور ودیا کا پرچار کرکے بنی نوع انسان کو فایدہ پہنچاتے تھے۔ قدیم زمانہ میں اگست منی اور اس کی بیوی لوپامدرا۔ اتری رشی اور اس کی بیوی انسویا۔ اور وششٹ اور اس کی بیوی ارن دھاتی کی زندگی کی مثال سے

میری اس رائے کی تصدیق ہوتی ہے - موجودہ زمانہ میں دیوان بہادر رگھوناتھ راؤ مدراس احاطہ میں - بمبئی احاطہ میں ڈاکٹر بھنڈارکر - بنگال میں مہارشی دیبندر وناتھ ٹھاکر - کیشب چندر سین - پرتاب چندر موزمدار اور پنڈت شونا تھ شاستری اور پنجاب میں لالہ ہنسراج اور لالہ منشی رام کی زندگی ثابت کرتی ہے کہ گرہستی رہ کر انسان اپنی قوم اور ملک کی اچھی طرح سے خدمت کر سکتا ہے - جس قوم میں ایسے آدمی پیدا ہو سکتے ہیں وہ کبھی معدوم نہیں ہو سکتی - اگر ہم لوگ ان مہاپرشوں کی پیروی کرتے رہیں تو ضرور ہمارے ملک میں ترقی اور رونق کا وہ زمانہ آئیگا جس کے آنے کی ہم سب کو امید ہے +

خلاصہ - پچھلے صفحوں میں قریباً اُن سب تقریروں کا لُب لباب آچکا ہے جو مسٹر راناڈے نے سوشل ریفارم کے متعلق سوشل کانفرنس میں کی تھیں - اُن کو پڑھ کر ہر شخص تسلیم کرے گا کہ اس مہاپرش کو ہندو جاتی سے بڑی گہری محبت تھی - وہ ہندو جاتی کی قدیم بزرگی اور شان پر عاشق تھا اور بجائے افسوس کرنے کے کہ وہ ہندو جاتی میں کیوں پیدا ہوا اس کو اس بات کا فخر تھا کہ وہ ہندو سوسائٹی کا ممبر تھا - اس محبت کی وجہ سے اس کو اپنی قوم کی موجودہ حالت سے سخت رنج ہوتا تھا مگر اس کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ ہمارا ملک اور ہماری قوم پرماتما نے ایک اعلےٰ مطلب کے لئے دنیا میں محفوظ رکھی ہے اور اگر ہم دانائی اور جوش کے ساتھ اپنی قومی زندگی کے سب پہلوؤں کو سدھاریں تو ممکن نہیں کہ آیندہ زمانہ میں ہم ویسے ہی ترقی یافتہ نہوں

جیسے کہ ویدک زمانہ میں تھے۔ اس آئیندہ ترقی کے واسطے یہ ضروری ہے کہ ہم ویدک زمانہ کی طرح عمدہ رواج جاری کریں یعنے ذات پات کی ناجایز اور نامنصفانہ تمیز دور کریں۔ لڑکے لڑکیوں کی شادی اُس وقت کریں جبکہ وہ تعلیم ختم کر چکیں۔ جو لڑکیاں چھوٹی عمر میں بدھوا ہو جائیں ان کو دوسری شادی کرنے کی اجازت دی جائے۔ غیر ملکوں میں جاکر تعلیم حاصل کریں اور تجارت کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کوشش میں ریفارمر کو اپنی پرانی سوسائٹی سے قطع تعلق نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ قطع تعلق کرنے کے بعد اس کا کوئی حق نہیں رہتا کہ وہ اپنی اصلی سوسائٹی کے معاملات میں کسی طرح کا دخل دے۔ بلکہ اس میں اور اس سوسائٹی میں باہمی ہمدردی باقی نہیں رہتی اور ان کو ایک دوسرے کی اچھی باتیں بھی پسند نہیں آتیں۔ جوشیلا ریفارمر براہمن اور رسادھو کو دیکھ کر آگ بگولا ہو جاتا ہے اس کا خیال ہے کہ اگر یہ دونو فرقے آج سمندر میں غرق ہو جائیں تو ہندو سوسائٹی فوراً انگلنڈ اور امریکا کی طرح ترقی یافتہ ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ شروع شروع میں سوامی دیانند سرسوتی کا بھی یہی خیال تھا اور وہ پہلے براہمنوں ہی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے مگر چونکہ وہ بڑے دانا تھے وہ جلد تاڑ گئے کہ کیا برہمن اور کیا کھتری کیا ویش اور کیا شودر یہ سب اس لایق ہیں کہ ان کو سمندر میں غرق کیا جائے۔ اِس لئے انہوں نے تمام ذاتوں یعنے کل سوسایٹی کا ریفارم کرنا ضروری قرار دیا۔ مسٹر راناڈے کی بھی باوجودیکہ وہ براہمو سماج کے رکن اعظم تھے یہ رائے کبھی نہیں ہوئی کہ کسی زمانہ میں براہمنوں نے

کونسل کر گے یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ آؤ ایسے قاعدے جاری کریں جن سے
تمام ہندو جاتی برباد ہو جائے ۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ براہمنوں کی تہذیب
اعلےٰ درجہ کی تھی مگر ایسے زمانہ میں جبکہ ہندو قوم کی حالت پست تھی
ہمارے بزرگوں نے غالباً نیک نیتی سے اور زمانہ سازی کی
غرض سے چند ایسے رواج اور خیالات اختیار کر لئے جو ان کے
جاہل ہمسایہ اور فاتح لوگوں میں جاری تھے ۔ اس زمانہ سازی اور
مجبوری کی حالت کو مسٹر رانا دے بڑے رحم اور افسوس کی نظر سے
دیکھتے تھے ۔ کیونکہ وہ اس بات کو تہ دل سے مانتے تھے کہ ہماری قوم
نے پستی کے زمانہ میں بھی اپنی قدیم بزرگی کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا ۔ اسی
وجہ سے پرانے فیشن کے ہندوؤں سے ان کو بڑی ہمدردی تھی ۔
وہ جوشیلے ریفارمروں کی طرح ہیجو مادیگرے نیست کے اصول پر کام
نہیں کرتے تھے ۔ اور نہ کسی شخص کو ایسے راستہ پر کہ جو وہ غلط سمجھتے تھے
چلتا دیکھ کر ان کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا ۔ وہ بہ حیثیت جج دیہات
میں دورہ کرتے تھے اور مندروں میں ٹھہرتے تھے اور اُن کے
پوجاریوں اور پرستش کنندوں سے بات چیت کر کے اُن کے دماغ
میں عمدہ خیالات ڈالنے کی کوشش کرتے تھے ۔ مسٹر رانا دے کے کٹر
براہمو دوست جو مندروں اور پوجاریوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے
تھے اُن کی اس حرکت سے ناخوش تھے ۔ مگر مسٹر رانا دے اپنے ارادے
کے ایسے پکے تھے کہ اس قسم کے متعصب اور تنگ دل اعتراضوں سے
اُن کی ہمدرد طبیعت پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا ۔ وہ پوجاریوں اور برہمنوں

کو اپنی قوم کا حصہ سمجھتے تھے اور جبکہ وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے یہ ناممکن تھا کہ وہ اُن لوگوں کے ساتھ جو اُن کے گوشت اور خون کا حصہ تھے ہمدردی اور محبت نہ کرتے اسی وجہ سے ہندو اور مسلمان - آریہ سماجی اور برہمو سماجی - سناتن دھرمی - اور تھیا سوفٹ لوگ سب ان کے پند و نصائح کو بڑے ادب سے سنتے تھے اور حتے الوسع ان کی رائے پر چلنے کی کوشش کرتے تھے - افسوس کہ وہ جلد اس دنیا سے کوچ کر گئے اور اپنی جگہ کوئی شیریں زبان روشن دماغ اور ہمدرد ریفارمر نہ چھوڑ گئے - سوشل کانفرنس کے جلسے اب بھی بدستور کانگرس کے ساتھ ہوتے ہیں - ایک عالم اور معزز صاحب مسٹر راناڈے کے قایم مقام ہو کر سوشل ریفارم کے مضمون پر آئے سال کانفرنس میں ایک لمبی چوڑی تقریر کرتے ہیں - ان کی لیاقت میں کچھ شبہ نہیں مگر مسٹر راناڈے کا سا جادو اُن میں ندارد ہے - وہ کسی کو اپنی طرف کھینچنے کی طاقت نہیں رکھتے - جب وہ تقریر کرتے ہیں تو اُن کے سامعین کی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ ان کا لکچر ختم نہ ہو - مسٹر راناڈے کی تقریر خواہ کتنی ہی لمبی ہوتی سامعین کو کبھی تکان معلوم نہ ہوتا تھا سامعین یہی چاہتے تھے کہ وہ گھنٹوں تقریر کرتے رہیں - اگر خوشی کی بات ہے تو یہ ہے کہ سوشل ریفارم پر جو تقریریں انہوں نے کیں وہ ہر ایک جوئندہ کو مل سکتی ہیں اور ریفارمر اور خیر خواہان ریفارم ان کو پڑھ کر اپنی سدھار کے لئے اس مہان پرش کے خیالات سے سبق حاصل کر سکتے ہیں ۔

مسٹر رانا ڈے کا دھرم

مسٹر رانا ڈے پرارتھنا سماج بمبئی کے ممبر تھے۔ گو اُن کا مذہبی
عقیدہ وہی تھا جو کہ براہمو سماج کا ہے مگر پرارتھنا سماج کے ممبر اپنے
آپ کو ہندو سوسائٹی سے علیحدہ نہیں سمجھتے۔ بنگال میں براہمو سماج
کو ہندو سوسائٹی سے بہت کم اُنس ہے۔ جب راجہ موہن رائے نے
سنہ ۱۸۲۸ء میں براہمو سماج کی بنیاد ڈالی تھی ان کا یہ کبھی منشا نہ تھا کہ ہندو
سوسائٹی سے قطع تعلق کر کے ایک نئی سوسائٹی بنائی جائے۔ وہ
پرچلت ہندو دھرم کی خرابیاں پسند نہ کرتے تھے اور بت پرستی کے
خلاف تھے۔ مگر ہندو شاستروں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے
اُن کے بعد مہارشی دیبندر ناتھ ٹھاکر نے راجہ رام موہن کی طرح ہندو
سوسائٹی سے اپنا تعلق جاری رکھا۔ مگر بابو کیشب چندر سین اور
پرتاب چندر موزمدار وغیرہ نوجوانوں نے اس بات کو گوارا نہ کیا اور
مہارشی سے علیحدہ ہو کر ایک نئی سماج قایم کر لی جس کا نام بھارت
ورش براہمو سماج تھا۔ جب بابو کیشب چندر سین نے سماج کی مرضی
کے خلاف اپنی لڑکی کی شادی مہاراجہ کوچ بہار سے کر دی تو ان کے
بہت سے ہمراہی اُن سے سخت ناراض ہو کر علیحدہ ہو گئے اور سادھارن
براہمو سماج بنالی۔ بابو کیشب چندر سین اور بابو پرتاب چندر موزمدار
انگریزی زبان کے بڑے عالم تھے۔ اور اس زبان میں اس فصاحت سے
تقریر کرتے تھے کہ ہزاروں لوگ انگریز اور ہندوستانی ان کے لکچر

سننے آتے تھے۔ بابو کیشب چندر سین نے تمام ہندوستان کا دورہ کیا اور بہت سے مقامات میں براہمو سماج قایم کی۔ اُن کی جادو بھری تقریر سب کے دل کو لبھا لیتی تھی۔ دونوں نے یورپ کا سفر کیا اور اپنی لیاقت اور فصاحت سے وہاں بھی بڑی نیک نامی حاصل کی۔ مگر اُن کی تعلیم میں نقص یہ تھا کہ انہوں نے اپنے پیروؤں کو ہندو سوسائٹی سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ اول تو یہ بات تھی کہ نیا مسلمان اللہ ہی اللہ پکارے۔ وہ ہندو سوسائٹی میں پیدا ہوئے اور پھلے۔ وہ اپنے زمانہ کے ہندوؤں کی گری ہوئی دھارمک اور رفاقتی حالت سے اچھی طرح واقف تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کے رسم و رواج کی اس زور سے مخالفت کی کہ رشتہ داروں نے ان کو گھر سے نکال دیا۔ اور دونوں میں سخت رنجش ہو گئی۔ بنگالی بڑے جوشیلے ہوتے ہیں کیشب چندر سین کی فصاحت نے اُس جوش کو دوبالا کر دیا سینکڑوں جوان اور بوڑھے اُن کے مرید ہو گئے اور ہندو سوسائٹی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ بمقابلہ راجہ رام موہن رائے کے بابو کیشب چندر سین زبان سنسکرت سے بہت کم واقف تھے ان کی تعلیم خالص انگریزی کتابوں پر مبنی تھی۔ جوانی کے جوش میں اپنے آبائی دھرم سے ناراض ہو کر عیسائی مت کی انگریزی کتابیں انہوں نے اس شوق سے پڑھیں کہ اُن کی تمام تحریر اور تقریر پر عیسائی مذہب کا گہرا رنگ چڑھ گیا پٹیر اور پال کے مقولے اُن کی زبان پر رواں تھے۔ حضرت عیسےٰ کی تلقین کے سامنے ان کا سر ہمیشہ

جھکا رہنا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے پیرو اور ہمراہی بھی ہندو دھرم سے متنفر ہو کر عیسائی دھرم کے مددگار ہو گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ اصلی ہندو دھرم کا مطالعہ کرتے اور اُن وجوہ پر غور کرتے جنہوں نے ہندو دھرم کی موجودہ حالت خراب بنا دی ہے انہوں نے یورپ کی موجودہ ترقی یافتہ حالت کا ہندوؤں کی گری ہوئی حالت سے مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ اور اُس زمانہ کو جس میں ہندو دھرم اور سوسائٹی کی بہت اچھی حالت تھی بالکل بھلا دیا۔ اور یہ فیصلہ کر دیا کہ جہالت توہمات بت پرستی اور ۳۳ کروڑ دیوی۔ دیوتاؤں کا نام ہی ہندو دھرم ہے اور ہندوؤں کے سب رواج ایسے ہیں کہ اُن پر عملدرآمد کرنا عین جہالت کی نشانی ہے اس لئے انہوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ ہم ہندو نہیں ہیں۔ مسلمانوں اور عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانا ان کی نظروں میں عین ثواب بن گیا۔ انہوں نے شادی کے موقع پر ہندوؤں کی طرح پھیرے لینے کی رسم بند کر دی اور ممبران برہمو سماج کی شادی کے واسطے نیا قانون بنوایا۔ سادھارن برہمو سماج والے بھی اپنے آپ کو ہندو سوسائٹی میں شامل سمجھنا کسرِ شان خیال کرتے ہیں باایں ہمہ اگر ممبران برہمو سماج کو کوئی کہہ دیتا ہے کہ آپ نیم عیسائی ہیں تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ ہم تو ہندو ہیں ہمارے دشمن ہم کو ناحق بدنام کرتے ہیں۔ مگر اس میں شک نہیں کہ عیسائی پادریوں سے مل کر۔ ان کے ساتھ جلسوں میں شامل ہو کر اور ان کی کتابیں پڑھ کر اِن صاحبوں کو خاص خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح

ہندو سوسائٹی کے دھرم اور رسم و رواج پر بیرحمی سے نکتہ چینی کرنا بھی اُنہیں بڑا لطف دیتا ہے۔ اور اُنکے فرض میں داخل ہے۔ ان کی نکتہ چینی ایسی ہوتی ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نکتہ چین ہندو ہیں بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ مسلمان یا عیسائی ہیں۔ بمبئی میں براہمو سماج کا نام پرارتھنا سماج ہے جو وہاں ۱۸۶۷ء میں قایم ہوئی تھی۔ اس میں احاطہ بمبئی کے بڑے بڑے آدمی شامل ہیں۔ ڈاکٹر بھنڈارکر مسٹر چاندا وارکر اور مسٹر گوکھلے کا نام تمثیلاً بیان کرتا ہوں۔ مسٹر تیلنگ اور مسٹر راناڈے کو بھی پرارتھنا سماج کے ممبر ہونے کا فخر حاصل تھا اور اس میں بھی کلام نہیں کہ سماج کو بھی اس بات کا فخر تھا کہ مسٹر راناڈے جیسا لایق آدمی اس کا ممبر ہے۔ مسٹر راناڈے سچے براہمو سماجی تھے۔ وہ ہندو مسلمان اور عیسائی وغیرہ سب کو ایک دوسرے کے برابر سمجھتے تھے۔ صرف اس وجہ سے کہ کوئی شخص ہندو ہے وہ اس کو اخلاقی معیار میں مسلمان اور عیسائی سے بہتر نہیں سمجھتے تھے اور اسی طرح وہ کسی مسلمان اور عیسائی کو صرف اس وجہ سے کہ وہ مسلمان یا عیسائی ہے ایک ہندو سے بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ وہ سب کو ایک نظر سے دیکھتے تھے اور کسی مذہب کی توہین نہ کرتے تھے بلکہ ہر ایک مذہب کو بڑی عزت سے یاد کرتے تھے۔ وہ ہر ایک شخص کو اس کے اعمال سے پرکھتے تھے۔ اور اُن اعمال کے مطابق وہ ان کی نظروں میں اچھا یا برا تصور ہوتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب مذہبوں کو ادب سے یاد کرنا ٹھیک نہیں۔ اسی وجہ سے ہندو مسلمان اور

عیسائی ایک دوسرے کے مذہب کی نکتہ چینی کرتے ہیں اور وہ
لوگ جن کو اپنے مذہب سے زیادہ پیار ہوتا ہے۔ بسا اوقات فرط
جوش میں دوسرے مذہب والوں کو نہایت تکلیف دیتے رہتے
ہیں کیونکہ کافروں کو آرام نہ دینا بھی ثواب میں داخل ہے۔ جب ایک
متعصب شخص کسی دوسرے مذہب کا ذکر سنتا ہے تو اس کی
آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اور چہرے سے غصہ ٹپکتا ہے۔ اگر
اس کے اختیار میں ہو تو وہ دوسرے مذہب والے کو تلوار سے کاٹ
دیوے۔ ایسے شخص کہا کرتے ہیں کہ دھرم کا اصلی جزو گیان ہے ہندو
کہتے ہیں کہ ان کے مذہب میں سب سے بہتر گیان یا علم الہی حاصل
ہوتا ہے۔ اسی طرح مسلمان اور عیسائی اپنے مذہب کی تعریف کرتے
ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کے طریقے پر چلنے سے انسان کو
نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صرف اچھے اخلاق
والا آدمی ٹھیک طور سے دھرماتما کہلانے کا مستحق نہیں اس کے
لئے یہ ضروری ہے کہ اس کو ایشوری گیان بھی ہو۔ مگر تجربہ سے
دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو گیان کی تلاش میں ہمیشہ مذہبی کتابیں
پڑھتے رہتے ہیں یا تو باوجود اپنی نیکی کے بڑے غصیلے اور بیرحم
ہوتے ہیں یا ان کے معمولی اخلاق بھی اچھے نہیں ہوتے۔ وہ
روح اور خدا نجات اور حیات ابدی وغیرہ مسایل پر بڑی لیاقت
سے بحث کر سکتے ہیں مگر اپنے روزانہ بیوہار میں نامناسب عمل کرتے
ہیں۔ اس وجہ سے بہت سے لوگوں کی یہ رائے ہے کہ دنیا کے فائدے

کے لئے یہ زیادہ ضروری ہے کہ انسان کے اخلاق اچھے ہوں چاہے
اس کو ایشوری گیان حاصل ہو یا نہ ہو۔ صرف ایشوری گیان بلا عمدہ
اخلاق کے بے سود ہے۔ اس لئے ہندو مسلمان اور عیسائی
اپنے اعمال کے مطابق اچھے یا برے ہیں صرف ہندو مسلمان
یا عیسائی ہونے سے کوئی شخص دھارمک یا اخلاقی میدان میں خاص
عزت کا مستحق نہیں۔ مگر بعض براہمو سماجی صرف اس وجہ سے کہ وہ
ہندو سوسائٹی میں پیدا ہوئے ہیں یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ جہاں تک
ہو سکے ہندو دھرم اور رسم و رواج کی نسبت بھلا برا کہا جائے۔
مگر وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے۔ قدیم
زمانہ کے ہندوؤں کی ان کو کوئی چیز پسند نہیں آتی۔ ابتدائی مسلمانوں
کی فتوحات اور عیسائیوں کی قربانیاں ان کو زیادہ اپیل کرتی ہیں گو
اُن کا دعوے ہے کہ ہم سب کو ایک ہی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔
خوش قسمتی سے مسٹر رانا ڈے معمولی براہمو سماجیوں کی اس غلطی
سے بچے رہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ دوسرے مذہبوں
کی تہ ہیں نہیں کرتے تھے اور عیسائی دھرم اور اسلام میں جو خوبیاں تھیں
ان کو خوشی سے تسلیم کرتے تھے مگر وہ ہندو سوسائٹی کی قدیم بزرگی
اور رونق پر ہزار جان سے فدا تھے۔ انھوں نے ویدک زمانہ کے
ہندوؤں کی عظمت کو اچھی طرح سمجھ لیا اور اس کی دل کھول کر
تعریف کی اور بیان کیا کہ براہمو سماج کوئی نیا دھرم نہیں ہے
اور نہ اس کی بنیاد ۱۸۲۸ء میں راجہ رام موہن رائے نے ڈالی۔

جو تحریک رام موہن رائے نے جاری کی وہ بہت پرانی تحریک ہے۔ یعنے بھگوت گیتا اور بھاگوت پُران جیسی پرانی ہے۔ بلکہ نارد۔ پرہلاد واسودیو اور ان رشیوں کے وقت سے جاری ہے جو راجہ جنک کے دربار میں گئے تھے۔ اس وقت سے برابر سادھ سنت لوگ دھرم اور پاکیزگی کا پرچار کرتے چلے آئے ہیں۔ راجہ رام موہن رائے سے پہلے اور پیچھے بھی یہ اصلاح کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس لیئے یہ کہنا کہ براہمو سماج ایک نو بدھان ہے بالکل غلط ہے اور ہمارے لئے یہ بالکل ضروری نہیں کہ دھارمک اور سوشل اصلاح کے لئے عیسائیوں کی کتابوں سے روشنی حاصل کریں ہماری گذشتہ تاریخ میں ہماری رہنمائی کے لئے کافی روشنی موجود ہے۔ مسٹر راناڈے اپنے آپ کو ہندو سوسائیٹی سے علیحدہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ زور شور سے کہتے تھے کہ میں ہندو ہوں۔ وہ ہندو جاتی کو پرماتما کی برگزیدہ قوم سمجھتے تھے اور انکو اس بات کا فخر تھا کہ وہ ہندو جاتی میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے بار بار کہا کہ ہم کو ہندو جاتی کے قدیم زمانہ سے شرمندہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ قدیم زمانہ ہماری قوم کی نہایت رونق کا زمانہ تھا۔ تمام دنیا اس کو عزت سے یاد کرتی ہے۔ اور اسی قدیم زمانہ کے قاعدوں پر چل کر ہماری قوم اب پھر بڑی رونق اور عزت حاصل کر سکتی ہے۔ جو لوگ آجکل کے ہندوؤں کو نفرت سے دیکھتے ہیں ان کے جواب میں مسٹر راناڈے نے فرمایا کہ موجودہ ہندو سوسائیٹی غلاظت اور ناپاکیزگی کا ڈھیر نہیں ہے اور ہم کو اس سے

قطع تعلق کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ ایک پادری نے موجودہ
ہندوؤں کی بری حالت دیکھ کر مشورہ دیا تھا کہ ہندوؤں کو اپنا گذشتہ زمانہ
بھول کر دہریہ پن اور جہالت اختیار کرنی چاہیئے اور جب ہندوپن کا
کوئی نشان باقی نہ رہے تو ان کو چاہیئے کہ انگریزوں کا مذہب۔ قانون اور
طریق معاش قبول کریں۔ مسٹر رانا دے نے اس کے جواب میں فرمایا کہ یہ
علاج بیماری سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ ہم کو اپنے قدیم زمانہ کو بھلانے
کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ وہ ایسا پر رونق زمانہ تھا کہ تمام دنیا اس پر عش
عش کرتی ہے۔ ہم کو ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان رسوم اور قاعدوں
کو ترک کریں جو ہم نے اپنی پستی کی حالت میں جاہل قوموں سے سیکھ لئے
تھے۔ اگر ہم ان کو چھوڑ دیں اور اپنے شاستروں پر کاربند ہوں تو ہندو قوم
کی پھر وہی اچھی حالت ہو جائے جو ست جگ دواپر اور ترتیا میں تھی
اور کلجگ کی خرابیاں سب دور ہو جائیں۔ یہ خیالات جن میں ہندو دھرم
کی عزت اور ہندو سوسائٹی کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ مسٹر
رانا دے تمام عمر ظاہر کرتے رہے اور ان کے دھارمک اور سوشل
لکچروں میں موجود ہیں۔ دوسرے ممبران برہمو سماج اور مسٹر رانا دے
میں فرق یہ تھا کہ مسٹر رانا دے صدق دل سے ہندو دھرم کی عزت اور
ہندو سوسائٹی سے محبت کرتے تھے۔ وہ ہندوں کے نقص بھی کبھی
کبھی ظاہر کرتے تھے مگر اسی طرح جس طرح کہ دانا ماں باپ اپنی اولاد
کو نصیحت کرتے ہیں۔ اُن کی نکتہ چینی سے یہ کبھی ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ
کوئی غیر شخص ہندوؤں کو فہمایش کر رہا ہے۔ وہ بت پرست نہیں تھے مگر

کیا مجال کہ بت پرستوں کی دل آزاری کے لئے کوئی کلمہ زبان سے نکالیں۔ وہ الہامی کتابوں میں یقین نہیں کرتے تھے مگر کیا مجال کہ الہامی کتابوں کے ماننے والوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ وہ ہر ایک مضمون پر مباحثہ کرتے تھے مگر ذاتیات کو اُن کی بحث میں بالکل دخل نہ ہوتا تھا۔ سوامی دیانند اور آریہ سماج کو وہ ہمیشہ عزت سے یاد کرتے تھے۔ مگر ایک معمولی براہمو سماجی کو اتنی برداشت نہیں کہ سوامی دیانند اور آریہ سماج کے متعلق صبر سے گفتگو کر سکے۔ براہمو سماجیوں کا کیا ذکر ہے آریہ سماجی اور سناتن دھرمی بھی دھرم کے معاملہ میں اپنے مخالفین کی نسبت اکثر ایسے چھچھورے پن کی گفتگو کرتے ہیں کہ گویا تمام خدائی ان کے دماغ میں بند ہے اور دوسرا آدمی بالکل پاگل اور بیوقوف ہے۔ مسٹر راناڈے کو اس بات کا سخت افسوس تھا کہ ممبران براہمو سماج اپنے دھرم میں ایسے لولین ہیں کہ وہ ہندو سوسائٹی کی ترقی میں کچھ دلچسپی ظاہر نہیں کرتے اور اُن میں اور ہندوؤں میں اتنی ہی علیحدگی ہوتی جاتی ہے جتنی کہ ہندو مسلمانوں میں ہے۔ اس لئے وہ خود کوئی ایسا عمل نہیں کرتے تھے جس سے اُن کی ہندوؤں سے علیحدگی ثابت ہو بلکہ وہ اُن سے شیر و شکر رہتے تھے۔ جب وہ بطور جج دیہات میں دورہ کرتے تھے تو اکثر اوقات مندروں میں ٹھیرتے تھے اور اُن کے پوجاریوں اور پرستش کرنے والوں سے بات چیت کر کے اُن کے خیالات کو بہتر کرنے کی کوشش کرتے تھے ان کے دوست جو کٹر براہمو تھے اس بات کو پسند نہ کرتے تھے مگر مسٹر راناڈے کی صلح پسند طبیعت پر اُن کی

ناراضی سے کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ وہ ہندوؤں کے سوا اور کسی کے ہاتھ سے
کھانا یا پانی نہ لیتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کسی پادری کے مکان
پر جا پی لی تھی۔ پرانے ہندو سخت ناراض ہو گئے۔ انہوں نے فوراً
معافی مانگ لی کیونکہ وہ اپنی سوسائٹی سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتے تھے
بمقابلہ اس صلح پسندی کے بعض صاحبان کو جب تک مسلمانوں اور
عیسائیوں کا کھانا پانی نہ ملے تب تک ان کو لطف زندگی حاصل نہیں ہوتا
ورنہ ہندوؤں کے کھانے پانی میں ان کو کچھ مزا آتا ہے۔ مسٹر رانا دے نے
اس طریق کو کبھی پسند نہیں فرمایا۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ مسلمانوں
اور عیسائیوں کے کھانے پانی میں زہر نہیں ہوتا اور دنیا کی ترقی کے لئے
یہ ضروری بھی ہے کہ سب انسان ایک دوسرے کے ہاتھ سے کھانا کھائیں
مگر وہ جلد بازی کو پسند نہ کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہماری سوسائٹی
کی ترقی پائدار ہو گو آہستہ ہی ہو وہ جانتے تھے کہ ہندو سوسائٹی اس بات
کی سخت مخالف ہے کہ ہندو لوگ مسلمانوں کے ہاتھ کا کھانا کھائیں۔
اس لئے وہ ایسا عمل کرنے سے پرہیز کرتے تھے کیونکہ ان کا پختہ یقین
تھا کہ جو شخص ہندو سوسائٹی سے علیحدہ ہو جاتے ہیں ان کی نصیحت ہندو
سوسائٹی خوشی سے نہیں سنتی اور ہندو سوسائٹی کو فائدہ پہنچانے کی خواہش
اُن کے دلوں میں بھی رفتہ رفتہ کمزور ہو جاتی ہے۔ اگرچہ مذہبی لحاظ سے
مسٹر رانا دے کا یہ طریق عمل بہادرانہ معلوم نہیں ہوتا اور جو لوگ آزادی
پسند ہیں وہ مسٹر رانا دے کو بزدل اور کمزور بیان کرتے ہیں مگر اس میں
شک نہیں کہ مسٹر رانا دے اپنے عقیدہ میں صدق دلی سے یقین کرتے

تھے اور زمانہ سازی کی غرض سے کوئی کام نہیں کرتے تھے ورنہ مسلمانوں
اور عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانا ان کے لئے گیا مشکل تھا۔ بلکہ اس عمل سے
پڑھے لکھے آدمیوں میں اور خصوصًا انگریزوں اور براہمو صاحبان میں
اُن کی عزت زیادہ بڑھ جاتی۔ وہ ہندو سوسائٹی کے رسم و رواج کی
تہ میں پہنچتے تھے اور اس کی خوبی پہچانتے تھے مثلاً شرادھ کا رواج یہ ہے
کہ جس تاریخ کو کوئی شخص مرتا ہے آئندہ سال اس تاریخ کو ماہ اسوج
کے پہلے نصف میں اس کے نام پر براہمنوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ اس
بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ تعلیم یافتہ تارک الدنیا اور پاک زندگی والے
براہمنوں کو کھانا کھلایا جائے۔ ہر ایک براہمن خواہ وہ ان پڑھ بیوقوف
دوکاندار۔ یا ملازمت پیشہ ہو شرادھ کے موقعہ پر دعوت کھانے کا مستحق
سمجھا جاتا ہے سناتن دھرمی اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ شرادھ کھلانے
سے اُن کے پتروں (بزرگوں) کو پھل یا فایدہ حاصل ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ
ہندو اس بات کو قبول نہیں کرتے اور ان پڑھ برہمنوں کو کھانا کھلانا
اُن کی نظروں میں سخت نامناسب ہے اس لئے براہمو سماجی اور آریہ
سماجی اور متفرق تعلیم یافتہ ہندو شرادھ کھلانے کے سخت مخالف
ہیں کیونکہ ان کی رائے میں اس رسم کا جاری رکھنا سخت گناہ میں داخل
ہے۔ مسٹر رانا ڈے بھی اس بات کو نہیں مانتے تھے کہ شرادھ کھلانے
سے پتروں کو فایدہ ہوتا ہے مگر وہ سمجھتے تھے کہ جیسے تعلیم یافتہ آدمی
براہمو سماجی یا آریہ سماجی راجہ رام موہن رائے کیشب چندر سین اور
سوامی دیانند سرسوتی کے موت کے دن آئندہ سال جلسے کرتے ہیں

اُن کی خوبیوں کو یاد کرتے ہیں اور حسب توفیق اُس دن کچھ نہ کچھ دان بھی کرتے ہیں اسی طرح ہندوؤں نے بھی شرادھ کھلانے کا طریقہ جاری کیا تھا۔ مسٹر تیلانگ اور راجہ رام موہن رائے کی زندگی پہ جو لیکچر مسٹر رانا دے نے دیا تھا اس میں انہوں نے فرمایا کہ "ہندوؤں میں ایک قدیم اور مفید رواج کے مطابق ماہ اسوج کے پہلے پندرہ دن میں آتے سال ہر شخص اپنے گذشتہ بزرگوں کو یاد کرتا ہے۔ ان پندرہ دنوں میں ہر ایک مرد اور عورت اپنے والدین اور دوسرے بزرگوں کا شکریہ ادا کرتی ہے اور اگرچہ ہماری سماج میں اس رواج پر عمل نہیں ہوتا اور ہم ظاہرا طور پر یہ رسم ادا نہیں کرتے بزرگوں کی محبت اور اپنا فرض ادا کرنے کا خیال جس کی وجہ سے ہزارہا لوگ تمام ملک میں ہر سال اپنے بزرگوں کو یاد کرتے ہیں ایک ایسا امر ہے جس کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے" اِس میں شک نہیں کہ ہماری جہالت نے ہمارے رسم ورواج کو بگاڑ دیا ہے اور ہمارے رواجوں کی بگڑی ہوئی شکل دیکھ کر تعلیم یافتہ آدمی اُن سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اپنے اپنے دایرہ میں قریبًا سب لوگ اسی اصول پر عمل کرتے ہیں جس پر شرادھ کی رسم مبنی ہے۔ ہندوؤں میں صرف بڑے آدمیوں کا ہی سالانہ انسب نہیں ہوتا بلکہ ہر ایک شخص چاہے وہ چھوٹا یا بڑا ہو اپنے ماں باپ دادا پڑدادا کی موت کے دن اچھا کھانا تیار کرتا ہے اور براہمنوں کی دعوت کرتا ہے۔ پہلے زمانہ میں لایق براہمنوں اور رشیوں کو ان دعوتوں میں بلایا جاتا ہوگا جیسا کہ آجکل پنجاب میں ہر ایک آریہ سماجی صدق دل سے چاہتا ہے کہ

لالہ ہنسراج پرنسپل دیانند کالج اس کے گھر پر کبھی کھانا کھائیں۔ مگر چونکہ پرانے فیشن کے ہندوؤں میں اب تعلیم نہیں رہی اس لئے جیسے عقلمند کھانا کھلانے والے لوگ ہیں ویسے ہی عقلمند کھانا کھانے والے براہمن ہیں۔ مسٹر راناڈے کی یہ دانائی تھی کہ انہوں نے اس رسم کی تہ میں پہنچ کر اس کی خوبی سمجھ لی +

مسٹر راناڈے کا مذہبی عقیدہ یہ تھا کہ :۔

۱۔ ہر ایک انسان کی نیچر میں مذہبی یا روحانی جزو موجود ہے اور ہر ایک آتما کی روحانی خواہشات اور احساس ہوتی ہیں جن کے ذریعہ سے اس کا دیگر آتماؤں سے تعلق ہوتا ہے اور وہ پرماتما کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اس مذہبی جزو کا وجود اول اس بات سے ثابت ہوتا ہے کہ سب ملکوں وقتوں اور قوموں میں لوگ مذہبی پرستش کرتے رہے ہیں اور دویم اس بات سے کہ ہر ایک انسان نہایت لاچار اور کمزور بندہ ہے اور ایک زبردست اور پوشیدہ طاقت کے بس میں ہے جس کا راز کسی کو معلوم نہیں ہوتا +

۲۔ مذہبی معاملات میں انسان کی رائے ایسی بے شبہ نہیں ہو سکتی جیسے کہ دو اور دو کا چار ہونا بے شبہ ہے +

۳۔ دنیا کا آغاز۔ انسان کا آغاز۔ دنیا کا پرماتما سے تعلق اور مادی دنیا کا روحانی دنیا سے تعلق یہ ایسے سوالات ہیں جن کا حل کرنا مشکل ہے مگر ان کے متعلق انسان ایسی رائے بنا سکتا ہے کہ جس پر کاربند ہونے سے اس زندگی کا کام چل سکتا ہے +

۴۔ دنیا میں بدی کا آغاز۔ انسان کی نامکمل آزادی۔ روح کا وجود قبل از پیدائش اور بعد از موت۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر گو ہم قطعی رائے قایم کر سکتے ہیں مگر پھر بھی شبہ کی گنجایش رہتی ہے +

۵۔ جوں جوں انسان کی مختلف طاقتیں زیادہ مکمل ہوتی جاتی ہیں پرماتما کے وجود اور ذات کا گیان بھی مکمل ہوتا جاتا ہے +

۶۔ ہماری عقل اور ضمیر۔ زمانہ گذشتہ کے واقعات۔ بیرونی کاینات کا مطالعہ اور انسان کی کانشنس ثابت کرتی ہے کہ اس دنیا کا مالک پرماتما ہے +

۷۔ دنیا میں پرماتما کا وجود سب سے اعلے ہے اس کی طاقت کی کوئی حد نہیں۔ ہر ایک چیز کی حرکت اس کے اختیار میں ہے۔ وہ دانائی نیکی۔ محبت۔ انصاف اور پاکیزگی میں سب سے بہتر ہے اور سب انسانی روحوں کا باپ منصف اور عالم ہے +

۸۔ صرف کسی طاقت یا مادی دنیا کا نام ایشور نہیں اور نہ پانی۔ آگ۔ ہوا سورج۔ چاند۔ ستاروں کو ایشور کہنا چاہئے۔ ایشور ایک ہے ایک سے زیادہ نہیں اور نہ دیوی دیوتا بھوت پریت کا کہیں وجود ہے +

۹۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ پرماتما مادی دنیا کو کس طرح حرکت دیتا ہے۔ نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مادی دنیا پرماتما کے وجود میں سے نکلی ہے اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مادی دنیا کا وجود نہیں۔ نہ ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ کسی زمانہ میں مادی دنیا کا وجود نہ تھا۔ اور نہ ہم یہ خیال کر سکتے ہیں کہ اس دنیا کا وجود اسی وقت سے ہے جب سے پرماتما کا وجود ہے +

۱۰- پرماتما پر بھروسا رکھنا- اس کی عزت کرنا- اور اس سے محبت کرنا- اس کے قانون پر چلنا اس کی طرح نیک بننا پرمیشور کے ساتھ اپنے رشتہ کو اچھی طرح سمجھنا اور اس زندگی سے بہتر زندگی کے لئے تیار رہنا- یہ تعلیم دھرم سے انسان کو حاصل ہوتی ہے +

(۱۱) جتنے انسان ہیں اتنی ہی روحیں ہیں مگر روح کس طرح پیدا ہوئی اس کی خاصیت کیا ہے- اس کا انجام کیا ہے- کیا وہ پرماتما نے پیدا کی ہے یا اُس وقت سے ہے جب سے کہ پرماتما ہے یا ایسے سوالات ہیں جن پر یقین کے ساتھ رائے زنی کرنا مشکل ہے- اس میں شبہ نہیں کہ جس طرح پرماتما ساری دنیا میں سرب بیاپک (حاضر ناظر) ہے اُسی طرح روح کی حرکات بھی پرماتما پر منحصر ہیں +

۱۲- روح فانی نہیں اور جو اعمال اس زندگی میں انسان کرتا ہے ان کے مطابق آئندہ زندگی میں اس کو آرام یا تکلیف نصیب ہوگی- یہ کہنا مشکل ہے کہ کس طریقہ سے یہ آرام اور دکھ دیا جائے گا- مگر چونکہ پرماتما انصاف پسند اور رحیم ہے- اس لئے وہ کسی روح کو ابدی سزا نہیں دیتا-

۱۳- روح پرماتما سے علیحدہ اور غیر مادی شے ہے اور اس کو خوشی اور تکلیف محسوس کرنے اور نیک و بد میں تمیز کرنے کی طاقت ہے +

۱۴- انسان کی مرضی اس قدر آزاد ہے کہ اس کو اپنے اعمال کے نتائج کا ذمہ وار ٹھیرایا جاسکتا ہے- اور وہ اپنی کوشش سے اپنے نقصوں پر قابو پا سکتا ہے- مگر اس میں شک نہیں کہ وہ وقت اور مقام جس میں

کوئی انسان پیدا ہوتا ہے۔ وہ سوسائٹی جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے
اس کی ابتدائی تعلیم اور اس کا مزاج اس کی آزادی کو ضرور کم و بیش
کرتے ہیں۔ آزادی کو روکنے والی طاقت کو کوئی پرالبدھ کہتا ہے
کوئی قسمت کہتا ہے۔ مسٹر راناڈے کا یہ عقیدہ تھا کہ نہ تو انسان بالکل
آزاد ہے اور نہ اسے قسمت یا پرالبدھ نے ایسا جکڑ دیا ہے کہ وہ بالکل آزاد
نہ ہو۔

۱۵۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ آدم یا حوا کے گناہ سے سب انسانوں کی روح
شروع سے ناپاک ہو گئی ہے۔ یہ مسئلہ پرماتما کے انصاف کے خلاف ہے۔

۱۶۔ یہ مسئلہ درست نہیں کہ پرماتما نے بعض شخصوں کو شروع سے ابدی
آرام اور خوشی کا مستحق بنا دیا ہے اور بعض کو ابدی رنج اور تکلیف کا۔

۱۷۔ انسان کو ہر روز پرماتما سے پرارتھنا کرنی چاہیئے کہ پرماتما ہماری
دقتوں میں رہنمائی کرے۔ اور نیکی اور پاکیزگی کے راستہ پر چلنے کے لئے
روشنی عطا کرے۔ اگرچہ پرارتھنا کرنا ہمارا فرض ہے ہم کو اس کا پھل پرمیشور
کی مرضی پر چھوڑنا چاہیئے کیونکہ وہ جو بات مناسب سمجھتا ہے وہی کرتا
ہے۔

۱۸۔ سچی توبہ کرنے سے انسان کی روح پاک صاف ہو جاتی ہے بھوگی
دینک یا موت کے وقت توبہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ توبہ کرنے
کے بعد ہم کو پختہ ارادہ اور سخت کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم سے کوئی گناہ
سرزد نہ ہو۔

۱۹۔ پرارتھنا۔ بشواش بھگتی۔ پرماتما کی محبت۔ انسان کی محبت۔ خدا پرستی

اور نیکی کی بدولت انسان کی نجات ہو سکتی ہے۔ اگر انسان کے دل میں محبت اور بھگتی نہ ہو تو تو بہ۔ ظاہری خیرات۔ تپ جپ۔ گیان اور مذہبی رسوم سے بہت کم فائدہ ہے۔ گو اُن سے نجات حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے ؁

۲۰۔ پرماتما کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ جو شخص پرماتما سے ڈرتا ہے اور نیکی کے راستہ پر چلتا ہے اس سے پرماتما خوش ہوتا ہے ؁

۲۱۔ جس وقت کہ انسان کی روح پاک صاف ہو کر اپنی قیود اور خواہشات پر قابو حاصل کرتی ہے اور پرماتما سے اس کا رشتہ گہرا ہو جاتا ہے اور وہ پرماتما کی پاکیزگی اور موجودگی کو اچھی طرح محسوس کرتی ہے اور اس کو اپنا مالک حاکم اور باپ سمجھتی ہے جس سے پریم کرنا روح کا فرض ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس انسان کی نجات ہو گئی

۲۲۔ یہ خیال کہ پرماتما انسان کی شکل اختیار کرتا ہے اور اوتار ہو کر دنیا میں آتا ہے غلط ہے۔ پرماتما سب نیک آدمیوں کی روح میں اپنا اچھا اثر داخل کرتا ہے مگر وہ لوگ انسان ہی رہتے ہیں پرماتما نہیں بن سکتے۔ اس لئے یہ کہنا کہ فلاں بزرگ مثلاً حضرت عیسٰے انسان کے نطفہ سے پیدا نہیں ہوئے ٹھیک نہیں ؁

۲۳۔ ہر ایک غیر معمولی نیکی اور بہادری۔ دانائی اور شاعرانہ کلام میں پرماتما کی ذات کا ظہور ہوتا ہے۔ اور وہ سچا الہام ہے۔ کتابی الہام کا ویسا رتبہ نہیں ہو سکتا ؁

۲۴۔ مورتی پوجن ایک نہایت ادنٰے درجہ کی پرستش ہے مگر انسان

کو وحشی بننے سے روکتی ہے۔ جس وقت انسان کو پرماتما کا گیان ہو جاتا ہے تو مورتی پوجا کرنے کی ضرورت نہیں رہتی +

۲۵۔ وہ معجزے جن سے کوئی شخص قدرت کا قانون توڑتا ہے قابل اعتبار نہیں اور نہ اُن کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ تمام کائنات اپنے قاعدہ پر چل رہی ہے +

۲۶۔ تپ کرنا۔ جسم کو تکلیف دینا اور تارک الدنیا ہونا ہماری زندگی کے اصلی مدعا کے خلاف ہے۔ دنیا کے کاروبار سے جو تربیت انسان کو حاصل ہوتی ہے وہ چھوٹی عمر میں فقیر بننے سے حاصل نہیں ہو سکتی مگر جو لوگ دنیا کے جدوجہد کے لایق نہیں اگر وہ اس جدوجہد کو چھوڑ کر اپنی زندگی پاکیزگی سے بسر کریں تو نامناسب نہیں۔ بلکہ ایک خاص عمر میں جبکہ ہمارے سب کام ختم ہو چکتے ہیں دنیا کے جدوجہد سے علیحدہ ہونا بااوقات ہمارا عین فرض ہے (جیسا کہ ہندوؤں میں بان پرست اور سنیاس آشرم کا قاعدہ مقرر تھا) عیش پرست سوسائٹی میں ایسے چند شخصوں کا وجود نہایت مفید ہوتا ہے جو عیش و آرام کو چھوڑ کر اور رغبت اغنیا ترک کر کے بے غرضانہ کام میں مشغول ہوں اور اپنی پاک زندگی سے عمدہ مثال قایم کریں +

۲۷۔ چند ہم خیال شخصوں کا ایک جگہ اکٹھا ہو کر پرماتما کی پرستش کرنا نہایت مفید ہے کیونکہ نیک صحبت سے سب کو فایدہ ہوتا ہے بڑے آدمیوں کا غرور کم ہو جاتا ہے اور چھوٹے اور بڑے جو ایک جگہ پرستش کرتے ہیں ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھنے لگتے ہیں +

۲۸۔ دھرم کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ سوسائٹی میں ہمیشہ ایسے شخص موجود رہیں جو اوروں کو دھرم کی تعلیم دیں اور اس فرض کو بڑی کوشش اور لیاقت سے ادا کریں۔ یہ بات کہ یہ شخص کسی خاص ذات کے ہوں یا انتخاب سے مقرر کئے جائیں ہر ایک سوسائٹی کی حالت اور ضرورت پر منحصر ہے +

۲۹۔ عالیشان اور خوبصورت عبادت گاہیں اور مندر۔ سالانہ تب اور تیوہار روحانی ترقی کے کام میں مدد دیتے ہیں +

۳۰۔ پیدائش۔ شادی اور موت کے موقع کو مذہبی رنگ دینا چاہیے پرماتما سے اس شخص کے واسطے جس کی پیدائش شادی یا موت ہو مہربانی کی پرارتھنا کرنا چاہئے۔ اور غریبوں کو خیرات دینی چاہئے۔ اسی لحاظ سے کبھی کبھی مردہ بزرگوں کے نام پر اپنی روح کے فایدے کے لئے شرادھ کرنا بھی مناسب ہے +

۳۱۔ یہ خیال کہ فلاں فلاں مقامات متبرک ہیں عقل پر مبنی ہے کیونکہ نئے نئے مقامات بمقابلہ ان کے جہاں ہم ہر روز رہتے ہیں اپنی خوبصورتی اور تاریخی حالات سے لوگوں کے دل میں دھرم کا بھاؤ آسانی سے پیدا کرتے ہیں۔ اسی غرض سے تیرتھ مقرر کئے گئے ہیں مگر ساتھ ہی تیرتھ جاترا کے فائدے کے خیال کو اعتدال سے نہ گذرنے دینا چاہئے +

۳۲۔ یہ خیال کہ کسی گرو یا پیغمبر کی شفاعت سے ہماری نجات ہو سکتی ہے بالکل غلط ہے۔ گو گرو یا رہنما کی صلاح اور تعلیم سے ہم کو فایدہ ہو سکتا ہے مگر جب تک ہم آپ کوشش نہ کریں کسی دوسرے شخص کی

قربانی یا شفاعت سے ہماری نجات نہیں ہو سکتی۔ شفاعت کا مسلہ پرماتما کے انتظام کے خلاف ہے ؛

۳۳۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی کانشنس کے مشورہ کے مطابق عمل کریں چاہے سوسایٹی کی پولیٹیکل اور سوشل ضروریات کچھ ہی ہوں بشرطیکہ ہمارا عمل اخلاق کے خلاف نہ ہو اور دوسروں کی جایز آزادی اور حقوق کو نقصان نہ پہنچائے۔ کسی آدمی یا آدمیوں کے گروہ کا حق نہیں کہ دھرم کے معاملہ میں اپنی راے کو غلطی سے بری سمجھے۔ ایسا دعوے بالکل جھوٹا ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے لوگ ذہنی غلامی میں پھنس جاتے ہیں ؛

۳۴۔ دھرم کے معاملہ میں عقل اور بشواش میں کوئی تمیز نہیں۔ گو ہم کو پرانی کتابوں بزرگوں اور پیغمبروں کے کلام کی عزت کرنی چاہئے مگر ان کی خاطر اس راستہ کو جس کو عقل سلیم درست قرار دے چھوڑنا مناسب نہیں ؛

یہ خلاصہ مسٹر رانادے کے اُن خیالات کا ہے جو انہوں نے بطور اپنے کانفیشن آف فیتھ کے ظاہر کئے تھے۔ ممکن ہے کہ اس خلاصہ میں مجھ سے کچھ غلطی ہو گئی ہو۔ ممکن ہے کہ اور لوگ چاہے وہ کسی سماج یا سبھا میں ہوں مسٹر رانادے کے عقیدے سے اتفاق نہ کریں مگر اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ مسٹر رانادے کے خیالات بڑے غور اور مطالعہ پر مبنی ہیں اور اس بات کے مستحق ہیں کہ ہم اُن پر بڑے ادب سے غور کریں۔ انہوں نے کہیں کہیں بیان کیا ہے

کہ فلاں معاملہ میں انسان کی رائے شبہ سے بری نہیں ہو سکتی۔ شاید بعض
صاحبان جو زمین و آسمان کے سب معموں کو ایسا ہی آسان سمجھتے ہیں
جیسا کہ دو اور دو کا چار ہونا آسان ہے مسٹر رانا دے سے اتفاق نہ کریں
اور اس بات کا دعوے کریں کہ ہم نے تو پرمیشور کا گیان اچھی طرح
حاصل کر لیا ہے۔ اور کہیں کہ یہ مسٹر رانا دے کی تعلیم کا نقص یا اُن کی
بدقسمتی تھی کہ پرماتما سے اُن کی ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ
مسٹر رانا دے کی یہ خواہش کبھی نہیں ہوئی کہ کوئی شخص ضرور اُن کی رائے
کو قبول کرے۔ ہر ایک شخص کو اختیار تھا کہ اپنی رائے پر قایم رہے
وہ دوسرے کی رائے اپنے خلاف سُن کر کبھی ناراض نہیں ہوتے تھے
بلکہ ہر ایک شخص سے بڑی نرمی سے پیش آتے تھے۔ بمقابلہ اُن کے
بعض لوگوں کا جو مذہبی سبھاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے
خیالات کو دوسرے شخصوں کے خیالات پر ترجیح دیتے ہیں یہ حال
ہے کہ اپنے عقیدے کے خلاف دوسرے کی رائے سُن کر آگ بگولہ
ہو جاتے ہیں اور ظاہر کرتے ہیں کہ گو اُن کا دماغ اعلےٰ درجہ کا ہو
مگر اُن کے دل پر دھرم نے اچھا اثر نہیں کیا۔ ایسے ہی لوگوں نے
گذشتہ زمانے میں مذہب کے نام پر جہاد کئے۔ خون کی ندیاں بہائیں۔
اور مخالفین کو زندہ آگ میں جلا کر مذہب کی پیشانی پر سیاہی کا ٹیکہ
لگایا۔ ممکن ہے کہ ان لوگوں کے مذہبی جوش نے دنیا کے انتظام میں
کچھ فایدہ بھی پہنچایا ہو مگر اس میں شک نہیں کہ انصاف اور محبت
جو مذہب کے ضروری اجزا ہیں ایسے لوگوں میں کم پائے جاتے ہیں

یہ لوگ بجائے اس کے کہ دوسروں کو پریم اور دیا کی مقناطیسی طاقت سے اپنے فرقوں کی طرف کھینچیں صرف عقلی دلایل پر بھروسہ کرتے ہیں اور اُن کے زور سے اور بعض اوقات سخت کلامی سے اپنے ہمراہیوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مسٹر رانا دے ان غلطیوں سے بری تھے اور اپنی زندگی میں انصاف اور محبت کے اعلےٰ اصولوں پر کاربند تھے۔ اسی وجہ سے معاون اور مخالف سب ان کے خیالات خوشی سے سنتے تھے۔ مسٹر تلک کی پارٹی کا اُن سے اتفاق نہ تھا۔ تاہم مرہٹہ نامی اخبار نے جو مسٹر تلک کا اخبار ہے کئی دفعہ افسوس ظاہر کیا ہے کہ گورنر بمبئی نے مسٹر رانا دے کو بمبئی کی یونیورسٹی کا وایس چانسلر نہ بنایا مگر اخبار مذکور نے بڑے فخر سے بیان کیا کہ گو اس بات سے گورنمنٹ کی ناانصافی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر واقعی کوئی نقصان نہیں ہوا کیونکہ جو لیکچر مسٹر رانا دے نے مختلف مضامین پر دئے ہیں وہ ان تقریروں سے جو یونیورسٹی کے وایس چنسلروں نے وقتاً فوقتاً کانوکیشن کے موقعہ پر کی ہیں بدرجہا بہتر ہیں ÷

جس عمدہ طریقہ سے مسٹر رانا دے مذہبی مسایل پر گفتگو کرتے تھے وہی طریقہ درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ عام اخلاق کے علاوہ باقی مسایل ایسے دقیق ہیں کہ باوجود اس بات کے کہ ہزارہا برسوں سے اُن پر غور ہو رہا ہے تاہم عقدہ حل نہیں ہوتا۔ موجودہ تحقیقات کے مطابق ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا میں ایک سورج ہے ایک چاند ہے ایک زمین

ہے اور چند ستارے ہیں۔ مگر دوربین کے ذریعہ سے اہل سائنس جو معلومات حاصل کر رہے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک سورج کیا سینکڑوں سورج اور سینکڑوں چاند دنیا میں موجود ہیں اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اُن کا اصلی حال کب معلوم ہو۔ یہ کیفیت مادی دنیا کی ہے۔ ان واقعات کو مدنظر رکھکر ۱۹۰۵ء میں پروفیسر ڈارون نے انگلستان میں برٹش ایسوسی ایشن آف سائینس کے سامنے اپنا لیکچر ختم کرتے وقت فرمایا تھا کہ "اگر ہم مذکورہ بالا اصولوں کو تسلیم بھی کر لیں تب بھی اس بات کا شافی جواب نہیں ملتا کہ یہ دنیا کیا ہے۔ جو تعداد سورجوں اور چاندوں وغیرہ کی دوربین نے دریافت کی ہے اُس کے سامنے انسان ایک حقیر چیز معلوم ہوتا ہے۔ وہ ایک بہت چھوٹے سیارہ پر جو ایک چھوٹے ستارے (سورج) کے گرد گھومتی ہے رہتا ہے۔ ستاروں اور سیاروں کے متعلق جو واقفیت اس وقت تک انسان نے حاصل کی ہے وہ بیشک حیران کرنے والی ہے۔ مگر جو چیزیں کہ ابھی تک دریافت نہیں ہوئیں۔ اور وہ چیزیں جن کا حال اب تک اچھی طرح معلوم نہیں ہوا اتنی بے شمار ہیں۔ کہ ان پر خیال کرنے سے انسان کا غرور ضرور کم ہونا چاہئے۔ ہمارے بچوں کے بچے تاروں بھرے آسمان کو ہمیشہ حیرانی کے ساتھ دیکھتے رہیں گے مگر کائنات کا معمہ کہ یہ کب پیدا ہوئی۔ کس طرح پیدا ہوئی اور اس کا انجام کیا ہے کبھی حل نہ ہو گا"۔ مذکورہ بالا فقرے پروفیسر ڈارون کی دانائی اور سچی علمیت کو اچھی طرح ظاہر کرتے ہیں جس طرح نیوٹن نے کہا تھا اسی طرح پروفیسر ڈارون نے اقبال کیا ہے۔ کہ

انسان کی معلومات بہت کم ہیں۔ جبکہ مادی دنیا کا یہ حال ہے تو روحانی دنیا میں انسان اپنی معلومات پر کس طرح نازاں ہو سکتا ہے۔ مادی دنیا میں ہم ہر ایک چیز کو حواس خمسہ سے معلوم کر سکتے ہیں مگر روحانی دنیا میں تحقیقات زیادہ مشکل ہے۔ بیرونی ہاتھ آنکھیں کان ناک روحانی معاملات میں بے بس ہیں۔ پرماتما کی ذات ایسی ہے کہ اس کو کان سن نہیں سکتا۔ ناک سونگھ نہیں سکتی۔ آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ پرماتما کی ذات بے حد ہے انسان محدود ہے۔ اُس کی محدود طاقتیں پرماتما کے بے حد وجود کو مکمل طور سے سمجھ نہیں سکتیں۔ ایسی حالت میں دھرم کے معاملہ میں جبر اور نفرت کے کیا معنے۔ چھوٹی سی عقل کے بھروسہ پر ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہنا اور اذیت دینی دھرم کے مدعا کو غارت کرنا نہیں ہے تو کیا ہے۔ مختلف معاملات پر بحث مباحثہ کرنا نامناسب نہیں۔ مگر بحث کا طریقہ ہمیشہ ایسا ہونا چاہئے کہ جس سے سچائی کی دریافت کی خواہش ظاہر ہو نہ کہ یہ ظاہر ہو کہ سب گیان ہمارے ہی حصہ میں آچکا ہے۔ جو شخص ہم سے اتفاق نہیں رکھتے وہ کافر ہیں اور کسی محبت اور مہربانی کے مستحق نہیں ۔

مسٹر رانا ڈے کو اس بات کا افسوس تھا کہ براہمو سماج صرف اس بات پر شاکر ہے کہ پرماتما سب کا باپ ہے اور کل انسان آپس میں بھائی ہیں اور شروع سے اب تک ہادیان براہمو سماج نے ان مشکل معموں کے حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جن کے

سامنے بے بس ہو کر لوگ الہام کی پناہ لیتے ہیں۔ بمبئی کی پرارتھنا سماج صرف اس بات کو کہ پرماتما ایک ہے اور ہندوؤں کی خراب رسموں سے پرہیز کرنا چاہئے اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ یہی حال یورپ اور امریکا میں ہے نئے نئے دھرم اصل میں پرانے مذہبوں کے برخلاف بغاوت کے طور پر پیدا ہوتے ہیں اور اس کوشش میں اوروں کی تنگ دلی دور کرتے کرتے آپ بھی تنگ دلی کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اور دھرم کے اصلی مدعا سے دور ہو کر بجائے اس کے کہ آم کے رس تک پہنچیں آم کے بیرونی چھلکے ہی کو کھا کر خوش ہو جاتے ہیں :۔

راجہ رام موہن رائے کا کام

مسٹر رانا دے نے راجہ رام موہن رائے کے کام کی نسبت مندرجہ ذیل خیالات ظاہر کئے :۔

راجہ رام موہن رائے جانتے تھے کہ ہندوؤں کے رگ و ریشہ میں روحانیت داخل ہے۔ یہ بات اوپنشدوں اور بھگوت گیتا سے ظاہر ہے کہ ہندو قوم نے پرماتما کی وحدانیت کو بہت اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ وہ پرتما کو سب کا پیدا کرنے والا۔ سب کا مالک دوست۔ رہنما اور ماں باپ سمجھتی تھی۔ یہ قومی خیال اور خاصہ رفتہ رفتہ نہایت پختہ ہو گیا۔ نہ صرف پنڈت۔ فلاسفر اور شاستری لوگ ہی اس خیال میں لولین ہیں۔ بلکہ ہر ایک طبقہ کا آدمی یعنے زمیندار۔ سنار۔ حجام۔ دکاندار

جولاہا۔ مالی۔ شکاری اور مچھلی پکڑنے والا بھی اس بات کو یقین کرتا ہے کہ دنیا میں ایک پرماتما کا راج ہے۔ جو ہر ایک غریب امیر آدمی کی حفاظت کرتا ہے اور ہر ایک شخص اگر اپنے دل کو پاک صاف کرے تو اس سے مل سکتا ہے۔ مگر باوجود اس یقین کے ہمارے ملک کے لوگ اپنے اعمال سے ثابت کرتے ہیں کہ وہ پرماتما کو ایک نہیں سمجھے وہ بجائے ایک پرماتما کی پرستش کے بیشمار دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ کوئی درختوں کو پوجتا ہے۔ کوئی دریاؤں کو پوجتا ہے۔ کوئی پہاڑوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ کوئی شراب خوری کو پرستش میں شامل کرتا ہے۔ راجہ رام موہن رائے ہندو قوم کی روحانیت اور اس یقین کے مقابلہ میں جو اس قوم کو پرماتما کی وحدانیت میں ہے اس کے موجودہ اعمال یعنے بت پرستی دیوتا پرستی اور عناصر پرستی کو دیکھ کر جس نے ہندوؤں کو پستی کی حالت میں پہنچا دیا تھا نہایت غمگین ہوتے تھے۔ اس ارادہ سے کہ لوگ ایک پرماتما کی پرستش کرنا سیکھیں اور بت پرستی سے باز آویں۔ انہوں نے برہمو سماج کو ۱۸۲۸ء میں قایم کیا۔ وہ اس سماج کو نو بدھان یا پرماتما کی مرضی کا نیا اظہار نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا مدعا یہ تھا کہ ہندوؤں کے عقیدوں اور اعمال میں اختلاف نہ ہو اور وہ دل سے پرماتما کی پرستش کریں اور اس کی خدمت کے لئے بجائے اپنے مال ومتاع کے اپنی خودی کی قربانی کریں۔ ان کے خیال کی بنیاد میں یا طریق عمل کی تہ میں کوئی بدیسی بات نہ تھی۔ اُن کی خواہش یہ تھی کہ لوگ اپنی قدیمی روحانی خزانوں سے فایدہ اٹھائیں اور

آجکل اپنی ترقی کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ جس زمانہ میں وہ بمبئی کالج کے طالب علم تھے۔ اُنہوں نے ایک جواب مضمون میں سرکار انگریزی کی بڑی مذمت کی اور بمقابلہ اس کے مرہٹوں کی حکومت کی بڑی تعریف کی۔ ان کے کالج کے پرنسپل سر الیگزانڈر گرانٹ کو اُن سے بڑی محبت تھی اور وہ اپنے شاگرد کی لیاقت سے بڑے خوش تھے۔ اُنہوں نے جب مسٹر رانا دے کی یہ تحریر پڑھی تو اُن کو بہت سمجھایا اور کہا کہ جو گورنمنٹ تم کو تعلیم دے رہی ہے اور تمہارے ملک والوں کو اپنا فایدہ پہنچا رہی ہے تم کو اس کی مذمت نہ کرنی چاہئے۔ اس غلطی کے بدلے پرنسپل مذکور نے چھ مہینہ تک ان کا وظیفہ بند کر دیا۔ مسٹر رانا دے اس سزا اور سختی کے باوجود پرنسپل صاحب سے ناراض نہیں ہوئے بلکہ ان کو بڑی عزت اور تعریف کے ساتھ یاد کرتے رہے۔ جوں جوں ان کا مطالعہ اور مشاہدہ وسیع ہوتا گیا ان کی رائے پختہ اور درست ہوتی گئی۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کے مطلب کو اچھی طرح سے سمجھ لیا اور دنیا کی بے انصافی۔ مخالفت اور مایوسیوں کے باوجود وہ اعلےٰ مقصد ان کی نظروں سے کبھی غایب نہیں ہوا۔ ان کی دلی خواہش یہ تھی۔ کہ ہندوستانی صدیوں کے خواب غفلت سے بیدار ہو کر دنیا کی قوموں میں ممتاز ہوں اور صداقت انصاف اور عزت کے راستہ پر چل کر بڑے بڑے قومی کام کریں۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ خدا نے انگریزوں کو ہندوستان میں اس غرض سے بھیجا ہے کہ

خدا نے انگریزوں کو اس ملک میں کیوں بھیجا؟

ہم جہالت اور توہمات کی غلامی سے آزاد ہوں۔ یہ کام کرنے کے لئے
انہوں نے براہمو سماج قایم کیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کام میں کہاں
تک کامیابی ہوئی ہے۔ اگر کامیابی نہیں ہوئی تو راجہ رام موہن رائے
کا کوئی قصور نہیں۔ اگر قصور ہے تو ان کے جانشینوں کا ہے۔ اب بھی
وہی سوال درپیش ہے جو راجہ رام موہن رائے کے زمانہ میں حل
طلب تھا۔ جب لوگوں کے عقیدوں اور اعمال میں اختلاف نہ رہیگا
اور جب پرماتما کی پرستش میں لولین ہو کر ہمارے لوگ بت پرستی اور
دیوتا پرستی سے آزاد ہو جائیں گے۔ تو اس ملک کے ۲۵ کروڑ باشندوں
کا ایسا اتفاق ہوگا کہ جس کو کوئی طاقت توڑ نہ سکے گی +

حب الوطنی اور پولیٹکل خیالات

جو شخص مسٹر راناڈے سے ملتا تھا وہ اُن کی پاک پرجوش اور گہری
حب الوطنی دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ مسٹر گوکھلے فرماتے ہیں کہ دادابھائی نوروجی
کی طرح مسٹر راناڈے اپنے ملک کی ترقی کے خیالات میں دن رات
محو رہتے تھے۔ وہ ہندوستان کی گزشتہ تاریخ پر فریفتہ تھے مگر اُن کی
نظروں میں اس ملک کا موجودہ اور آیندہ زمانہ گزشتہ زمانہ سے
بھی زیادہ ضروری تھا۔ اور اسی واسطے وہ قومی زندگی کے مختلف
پہلوؤں کے سدھار کی کوشش میں ہمیشہ مشغول رہتے تھے۔ اُنہوں نے
اس بات کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا کہ انگریزوں کے عہد میں اہل
ہند کس حد تک ترقی کر سکتے ہیں اور کن کن شرایط کے مطابق ہم کو

کہ ہندوستان ان کی زیر ہدایت موجودہ زوال کی حالت سے نکل کر خوشحالی حاصل کرے۔ باوجود غلط فہمی ناکامیابی اور تکلیف کے ان کا یہ یقین کبھی کمزور نہیں ہوا۔ وہ اپنے ہمراہیوں سے کہا کرتے تھے کہ گو انگریزوں کی حکومت میں چیدہ چیدہ ہندوستانیوں کے لئے اپنا ذاتی حوصلہ پورا کرنا مشکل ہے یعنے کوئی لایق ہندوستانی گورنر جنرل یا کمانڈر انچیف نہیں ہو سکتا یا اپنی خود مختار سلطنت قایم نہیں کر سکتا مگر مجموعی طور پر ہماری قوم کو ترقی کرنے کے لئے بہت گنجایش ہے۔ اور اگر ہم موقعہ کو ہاتھ سے نہ دیں اور اپنی حالت کو سدھارنے کی سخت کوشش کریں۔ تو ناممکن ہے کہ ہماری قوم کا آیندہ زمانہ قابل تعریف نہ ہو۔ اس اعلےٰ بشواس اور یقین کو دل میں رکھکر وہ سب پہلوؤں میں اپنی قوم کو سدھارنے کی کوشش کرتے رہے۔ وہ اور قوموں کی تاریخ کو بھی بڑے غور سے پڑھتے تھے۔ مگر اصلی مطلب یہ تھا کہ جو سبق اور قوموں کی تاریخ سے حاصل ہو وہ اپنے ہموطنوں کو سکھائیں۔ ذاتی رنجش یا ذاتی تکلیف سے ان کے عقیدے میں کبھی فرق نہ آتا تھا۔

مسٹر راناڈے پر سرکار کی خفگی

قریباً تیس سال ہوئے مہاراشٹر میں لوگ گورنمنٹ کی کارروائی سے سخت ناراض تھے۔ پونا کے ایک برہمن واسدیو بلونت نے چند ہمراہیوں کی مدد سے کھلم کھلا مار دھاڑ شروع کر دی۔ مسٹر رچرڈ ٹیمپل

گورنمنٹ نے سمجھا کہ پونا کے بڑے بڑے برہمن واسدیو بلونت
کے طرفدار ہیں۔ یہی شبہ مسٹر رانا دے کی نسبت بھی ہوا۔ یہ خیال
بالکل غلط تھا کیونکہ مسٹر رانا دے خلاف قانون کارروائی کو ہمیشہ ناپسند
کرتے تھے۔ ماہ مئی ۱۸۷۹ء میں پونا کے سرکاری محلات کو کسی نے آگ
لگا دی اور گورنمنٹ نے یہ سمجھ کر کہ مسٹر رانا دے اس فساد کی تہ میں
ہیں اُن کو بمقام دھولیا بدل دیا۔ ان دنوں تعطیل تھی۔ مگر اُن کو حکم دیا
گیا کہ فوراً دھولیا کو چلے جاؤ۔ اس تبدیلی کو ہائی کورٹ نے بھی بہت
ناپسند کیا۔ جب وہ دھولیا میں پہنچے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سرکاری
افسران اُن کے خطوں کو کھول کر پڑھ لیتے ہیں۔ ساتھ ہی اُن کے نام
فرضی چٹھیاں آنے لگیں جن میں ڈاکوؤں کی لوٹ مار کا حال درج ہوتا
تھا۔ یہ کارروائی خفیہ پولیس کی تھی۔ جن کا خیال تھا کہ اگر مسٹر رانا دے
کا تعلق ان ڈاکوؤں سے ہے تو وہ ضرور ان خطوں کا جواب دیں گے
مسٹر رانا دے نے ایسے بہت خطوط دھولیا کی پولیس کو دیدئے اُن کو
سرکار کی اس بدسلوکی سے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ بعد میں واسدیو
بلونت گرفتار ہوا اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مسٹر رانا دے کا اس
اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ دھولیا میں ایک انگریز افسر نے گورنمنٹ کی نامناسب
بدظنی کی نسبت اُن سے بڑا افسوس ظاہر کیا اور اُن کو یقین دلایا کہ اب
گورنمنٹ آپ کی بے گناہی کی قایل ہوگئی ہے۔ اور کوئی شخص اس
بدسلوکی کو یاد کرکے گورنمنٹ کو سخت وسست کہتا مگر جب مسٹر گوکھلے
سے ان کا اس واقع کی نسبت ذکر ہوا تو اُنھوں نے فرمایا کہ دو ملک

کی موجودہ حالت میں ایسی غلط فہمی کبھی کبھی ضرور ہوتی رہے گی۔ علاوہ ازیں ہم کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر گورنمنٹ خود ہم لوگوں کی ہوتی تو ہم لوگ انگریزوں کے مقابلہ میں زیادہ سختی کرتے"۔ یہ نظیر ان کی انصاف پسندی کی ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ باوجود ذاتی تکلیف کے ان کا یہ عقیدہ کہ انگریزی راج بحیثیت مجموعی ہمارے ملک کے لئے مفید ہے۔ کبھی کمزور نہ ہوتا تھا*

کانگرس اور کانفرنس

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے مسٹر رانا دے کا یہ پختہ خیال تھا کہ ہمارے ملک کی ترقی کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی زندگی کے سب پہلوؤں میں ترقی کریں۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ہماری دھارمک سوشل تعلیمی۔ مالی اور پولیٹکل ترقی ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور ساتھ ساتھ ہونی چاہئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم دھرم میں ترقی کریں اور سوشل ریفارم سے غافل رہیں۔ یا صرف سوشل ریفارم تک اپنی کوشش کو محدود کریں اور پولیٹکل ریفارم کی طرف توجہ نہ کریں۔ اس لئے وہ اپنے سب لکچروں میں اس بات پر زور دیتے تھے کہ محبان ملک کو قومی زندگی کے سب پہلوؤں پر غور کرنا چاہئے۔ اسی وجہ سے وہ نیشنل کانگریس کے جلسہ میں ہمیشہ شامل ہوتے تھے اور سوشل کانفرنس کا اجلاس اسی جگہ کرتے تھے جہاں کانگرس ہوتی تھی تاکہ کانفرنس والے کانگرس میں شریک ہو سکیں اور کانگریس کے ڈیلیگیٹ کانفرنس میں آکر اُن کے

حب الوطنی سے بھرے ہوئے لکچروں کو سُنیں۔ ۱۸۹۲ء میں سوشل کانفرنس اور کانگرس
الہ آباد میں ہوئی تھی۔ سوشل کانفرنس میں جو لکچر مسٹر راناڈے نے دیا تھا اُس
سے اُنکی حب الوطنی خوب ظاہر ہوتی ہے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ "ہمارے

اہل ہند کے مخالفین پر نکتہ چینی

بہت سے ہندوستانی اور انگریزی
دوست اس امید کو کہ یہ سالانہ جلسے
(کانگرس کانفرنس وغیرہ) ہمارے ملک کے لئے مفید ثابت ہونگے بالکل
بیہودہ سمجھتے ہیں۔ بعض ہندوستانی دوست کہتے ہیں کہ اس ملک میں اسقدر
مختلف مذاہب اور زبانیں ہیں کہ یہاں کے لوگوں کو قومی اور شخصی
خود مختاری نصیب ہونی ناممکن ہے۔ انگریزی نکتہ چین اپنے آپ کو سب
سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ اُنہیں اس بات کا یقین ہے کہ مشرقی قوموں
کے عروج کا زمانہ گزر گیا۔ اور اب ان قوموں کا یہی کام ہے کہ نکمی زندگی
بسر کرکے مرجائیں اور اپنے سے بہتر قوموں کے لئے جگہ خالی کریں۔ پولیٹکل
ترقی سوشل برائیوں سے آزادی۔ مذہبی یا روحانی روشنی انگریزوں کی
رائے کے مطابق ہندوستانی قوموں کو آیندہ زمانہ میں کبھی حاصل نہ ہوگی۔
اگر ان نکتہ چینوں کے خیالات درست ہوتے تو بیشک ہمارے لئے بڑے فکر
کا مقام تھا۔ خوش قسمتی سے یہ پیشین گوئیاں بالکل غلط ہیں اور یہ ہمارے
ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اس کو جھوٹا ثابت کریں۔ گزشتہ زمانہ کی
تاریخ اور موجودہ زمانہ کا سائنس ان پیشین گوئیوں کے برخلاف ہے۔ اس
بزرگ ملک کی گزشتہ تاریخ بالکل بے معنی ہوتی اگر اس سے یہ امر
ثابت نہ ہوتا کہ باہر کے حملوں سے ہماری پسندیدہ قوم نے ہمیشہ ایک

خاص تربیت حاصل کی ہے اور اُس کے خیالات کا معراج اونچا ہوتا گیا ہے کم سے کم اس کی قابلیت بڑھ گئی ہے۔ باہر کے حملوں سے اس قوم کی حالت ایسی کبھی نہیں ہوئی کہ وہ آیندہ کبھی ترقی نہ کر سکے۔ بلکہ غیروں کے سامنے کچھ عرصہ سر جھکا کر وہ ہمیشہ اپنا سر اونچا اُٹھاتی رہی ہے۔ اور غیروں کے مذہب۔ انتظام سوسائٹی اور تہذیب میں جو چیز اچھی تھی اس کو اپنے خیالات میں جذب کرتی رہی ہے۔ سائنس بھی یہی سبق سکھاتا ہے کہ ہر ایک شخص کی ترقی اس کی سوسائٹی کی حالت کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم اپنی سوسائٹی کی حالت کو بہتر کریں تو ہماری سوشل اور پولیٹکل حالت بھی ضرور بہتر ہو جائے گی۔ ہم کو مایوس ہونے کے لئے کوئی وجہ نہیں اگر ہم سائنس اور گزشتہ تاریخ کے اس سبق کو یاد رکھیں کہ جب تک ہماری کل طاقتوں اور کل حرکتوں یعنے ہماری زندگی کے سب پہلوؤں نے ترقی نہیں کی تو قوم کا ترقی کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے ہم کو سوشل ترقی اور پولیٹکل ترقی کے واسطے ساتھ ساتھ کوشش کرنی چاہیئے" ✤

ہم کو ترقی سب پہلوؤں میں کرنی چاہیئے

۹۳ء میں کانگرس اور کانفرنس لاہور میں ہوئیں۔ وہاں کی کانفرنس کے لکچر میں اُنہوں نے فرمایا کہ "جو شخص مجھ سے واقف ہیں وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ انگریزی حکومت اور انگریزی تعلیم کی بدولت پولیٹکل ترقی کی جو خواہش اہل ہند کے دل میں پیدا ہو گئی ہے میں اس کے خلاف نہیں ہوں۔ پولیٹکل ترقی کے لئے کوشش ایک ایسی بات ہے

جس کی طرف سے اس ملک کے باشندے بہت عرصہ سے غافل رہے ہیں۔ میری رائے میں جو شخص ایک بڑے ملک کے باشندوں کے فرائض سے بے پرواہ ہے وہ انسانی زندگی کی پوری وقعت محسوس نہیں کر سکتا۔ مگر پولیٹکل ترقی کے واسطے کوشش کرتے کرتے ہم کو اخلاقی اصلاح سے بے پرواہ نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم اُن معزز عہدوں کے سنبھالنے کے قابل نہیں ہو سکتے جن کو ہم اپنی پولیٹکل جد و جہد سے حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔ اسی خیال سے ۱۸۹۱ء کی کانفرنس میں اُنہوں نے فرمایا تھا کہ کانگرس اور کانفرنس دونوں بہنیں ہیں اپنی ترقی کے واسطے ان کو ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے۔ ۱۹۰۰ء میں پراونشل سوشل کانفرنس ستارا میں ہوئی تھی۔ وہاں جو لیکچر مسٹر راناڈے نے دیا تھا اس میں انہوں نے فرمایا کہ "اگر انسان کسی وقت نیچے گرا ہوا ہے تو اُس کے اوپر اُٹھنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ اپنی کل جسمانی۔ اخلاقی اور ذہنی طاقت کو استعمال کرے۔ آپ کا یہ فرض کرنا کہ انسان اپنی زندگی کے ایک پہلو کو نظر انداز کر کے دوسرے پہلو میں ترقی کر سکتا ہے ایسا ہی ہے فضول ہے جیسا کہ سورج کی روشنی کو اس کی گرمی سے اور گلاب کی خوبصورتی کو اس کی خوشبو سے علیحدہ کرنا فضول ہے۔ اگر آپ کو پولیٹکل حقوق حاصل نہیں تو آپ کا سوشل انتظام بھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کا سوشل انتظام انصاف اور عقل پر مبنی نہیں تو آپ پولیٹکل حقوق کو اچھی طرح سے استعمال نہیں کر سکتے۔ اگر آپ کے مذہبی خیالات بودے اور پست ہیں تو آپ کے لئے پولیٹکل۔ سوشل اور مالی معاملات میں کامیاب ہونا

مشکل ہے۔ انسان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک دوسرے سے تعلق
اتفاقیہ نہیں ہے بلکہ قانون قدرت کے مطابق ہے۔ اس لئے جو شخص پولیٹکل
معاملات کو سوشل معاملات سے علیحدہ کرتا ہے غلطی پر ہے۔ اور جو شخص
ایک معاملہ میں اپنا فرض پورا کرتا ہے اور دوسرے معاملات میں اپنے
فرض سے غافل ہے وہ اپنے فرایض کو اچھی طرح نہیں سمجھتا اس لئے یہ
رائے کہ سوشل کانفرنس کو پولیٹکل کانگرس سے علیحدہ رکھنا چاہئے اور
کسی دوسرے مقام اور وقت میں اس کا جلسہ کرنا چاہئے۔ درست نہیں۔
علاوہ ازیں ایسا کوئی سوال نہیں جو بالخصوص پولیٹکل ہو۔ اور اس کے سوشل
مالی اور مذہبی پہلو نہ ہوں۔ ہم کو اپنی زندگی کے مختلف معاملات میں ایک
ہی سی پیشبندی۔ ہمت کوشش اور غور کی ضرورت ہے۔ اس لئے یہ کہنا ٹھیک
نہیں کہ پولیٹکل معاملات میں ہمارا راستہ صاف ہے اور دوسرے معاملات میں
نہیں جب ہم پولیٹکل مضامین پر غور کرتے ہیں ہم کو سوشل معاملات پر بھی
دھیان کرنا چاہئے کیونکہ اس وقت بے غرضی کا بہاؤ جوش پر ہوتا ہے۔ اور
چونکہ اپنے برابر والوں سے مل کر ہر ایک انسان کی طبیعت کو خوشی اور رونق
حاصل ہوتی ہے اور ایک ہی جگہ اور وقت میں کام کرنے سے ہر یک
طرح کا فایدہ ہے اس لئے کانگرس اور کانفرنس آئے سال ایک وقت
اور ایک جگہ میں کی جاتی ہیں۔ اگر میرا اختیار ہوتا تو میں ان قومی جلسوں
کے ساتھ اور بھی کئی قسم کے مفید کام شامل کرتا تاکہ یہ جلسے اپنے کام
اور نام میں دراصل قومی بن جائیں"۔ پچھلے فقرہ میں انڈسٹریل کانفرنس
اور نمایش کی طرف اشارہ ہے۔ مسٹر رانا ڈے چاہتے تھے کہ کانگرس

کے ساتھ یہ کام بھی ہوں۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں کانگرس والوں کی آنکھیں نہ کھلیں مگر اُن کے مرنے کے بعد انڈسٹریل نمایش اور کانفرنس کانگرس کے ساتھ ہونے لگی +

مذکورہ بالا خیالات سے ظاہر ہے کہ مسٹر راناڈے ہماری قومی ترقی کے لئے یہ بات ضروری سمجھتے تھے کہ ہم اپنی پولیٹکل بہتری کے واسطے بھی کوشش کریں۔ آجکل جدوجہد کانگرس

کانگرس کی دو پارٹیاں

کے دائرہ میں ہو رہی ہے اس کو مسٹر راناڈے نے بہت عرصہ پہلے سمجھ لیا تھا۔ کانگرس کی ایک پارٹی کہتی ہے کہ ہم کو اپنی تکلیفوں کا حال گورنمنٹ کو سنانا چاہئے۔ گورنمنٹ ایسی منصف مزاج ہے کہ وہ واقف حال ہو کر خود بخود ہماری تکالیف کو دور کرے گی اور مناسب حقوق ہم کو عطا کرے گی۔ ہم کو گورنمنٹ کے انصاف اور نیک نیتی پر کامل بھروسہ رکھنا چاہئے + دوسری پارٹی کہتی ہے کہ ہم کو گورنمنٹ کے انصاف اور نیک نیتی پر قطعی بھروسہ نہیں اور نہ بھروسہ رکھنا چاہئے۔ گورنمنٹ ہماری عرضداشتوں کی طرف توجہ نہیں کرتی اور جو رعایت ہم سے کرتی ہے یا جو حقوق ہم کو دیتی ہے وہ صرف اس وقت جبکہ انگریزوں کا کوئی فایدہ ہوتا ہے۔ صرف ہندوستانیوں کو فایدہ پہنچانے کی غرض سے گورنمنٹ کوئی عمل نہیں کرتی۔ ہندوستانیوں نے تھوڑی تھوڑی تنخواہوں پر ہزاروں تکلیفیں اُٹھا کر سرکار انگریزی کی لڑائیاں لڑی ہیں اور اس کی خاطر اپنا خون بہایا ہے مگر کیا مجال کہ اُن کی وفاداری اور بہادری کے صلہ میں اُن سے کوئی رعایت کی جائے

انگریزی سپاہیوں کی جو خاطر تواضع ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندوستانی سپاہیوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ تجربہ کار سے تجربہ کار دیسی افسر کو فوج میں ایک انگریزی لفٹننٹ کی تنخواہ اور عزت نہیں مل سکتی۔ یوں تو انگریز صاحبان اہل ہند کو لعن طعن کرتے ہیں کہ تم لوگ گھر سے باہر نہیں جاتے ہندوستان سے باہر نکل کر تجارت نہیں کرتے مگر جب ہمارے اہل وطن اپنے ملک کو خیرباد کہکر تلاش معاش کے لئے جنوبی افریقہ۔ آسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ وغیرہ ولایتوں میں جاتے ہیں جہاں انگریزی قوم کے لوگ آباد ہیں تو وہاں اُن پر وہ ظلم اور ستم کیا جاتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں سمندر میں ڈوب مرنا بہتر ہے۔ اگر جرمنی یا فرانس کے علاقہ میں یہ ظلم اہل ہند پر ہوتا تو کچھ شکایت کی جگہ نہ تھی کیونکہ جرمنی یا فرانس کی مہربانی پر ہمارا کوئی حق نہیں مگر انگریزی قوم کے لوگ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں پر ظلم کریں اور انگلستان اور ہندوستان کی گورنمنٹ ان کی ذرا مدد نہ کرے۔ یہ تعجب کی بات نہیں تو کیا ہے۔ ہم کو اپنی گورنمنٹ کی مہربانی اور ہمدردی پر بھروسہ ہو تو کس طرح ہندوستان میں اگر کوئی انگریز کسی ہندوستانی کو جان سے مار ڈالتا ہے یا اس کے برخلاف کوئی اور جرم کرتا ہے تو مجرم کو اکثر کوئی سزا نہیں ہوتی یا نہایت خفیف سزا ہوتی ہے۔ اگر کسی انگریز کے خلاف کوئی ہندوستانی جرم کر بیٹھتا ہے تو اس کو ایسی سخت سزا دیجاتی ہے کہ تمام ملک میں تھلکہ مچ جاتا ہے ایسے انصاف سے کس کو محبت ہو سکتی ہے۔ انگلستان میں ہر ایک بچہ کا تعلیم پانا قانوناً لازمی ہے۔ مگر ہندوستان میں گورنمنٹ کروڑوں روپیہ فوجی انتظام میں خرچ کرتی ہے اور لوگوں کی تعلیم پر بہت کم روپیہ لگاتی ہے

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شہروں سے باہر یعنے دیہات میں تعلیم بالکل نہیں پھیلی۔ جو سلسلہ تعلیم گورنمنٹ نے جاری کیا ہے وہ ایسا سخت ہے کہ طالب علموں کی صحت خراب ہو جاتی ہے اور اُن کی علمی واقفیت بہت کم ہوتی ہے۔ غرضیکہ ہندوستانیوں کے آرام یا ترقی کی ہماری گورنمنٹ پرواہ کم کرتی ہے ورنہ یہ کس طرح ممکن تھا کہ ملک میں قحط ہو اور یہاں کا غلہ یورپ کو جائے۔ اس لئے ہم کو اپنی ترقی کے لئے اپنے زور بازو پر بھروسہ رکھنا چاہئے سرکاری نوکری نہیں کرنی چاہئے۔ سرکار کے کام چلانے میں مدد نہیں کرنی چاہئے۔ اپنے قوم کے بچوں کی تعلیم اپنے ہاتھ میں لینی چاہئے سرکاری عدالتوں میں جانے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مسٹر رانا دے کا ان دونوں

مسٹر رانا دے کا ان پارٹیوں سے اتفاق و اختلاف

پارٹیوں سے کچھ اتفاق تھا اور کچھ اختلاف۔ ان کا خیال تھا کہ گورنمنٹ کو عرضیاں بھیجکر خاموش ہو جانا اور اپنے آپ کچھ نہ کرنا درست پالٹکس نہیں۔ ۱۹۰۰ء میں پراونشل سوشل کانفرنس ستارا میں انہوں نے فرمایا کہ وہ پالٹکس سے صرف یہ مراد نہیں کہ مہربانی اور حقوق حاصل کرنے کے لئے گورنمنٹ کی خدمت میں درخواستیں بھیجی جائیں۔ جب تک کہ ہم اپنی کوشش اور لیاقت سے کسی عطیہ کے مستحق نہ ہوں گورنمنٹ کی مہربانی ہم کو کچھ فایدہ نہیں پہنچا سکتی۔ جو حکم خدا نے انسان کو دیا تھا کہ تو اپنی پیشانی کا پسینہ بہا کر زندگی بسر کرے گا اس کو خدا کی لعنت نہ سمجھنا چاہئے۔ بلکہ وہ انسان کی زندگی اور ترقی کے لئے ضروری شرط ہے۔ ہر ایک معاملہ میں خواہ وہ پولیٹکل۔ دھارمک یا سوشل

ہو یا تجارت ۔ لٹریچر یا سائینس سے تعلق رکھتا ہو انسان کے لئے
ضروری ہے کہ اپنے راستہ سے مشکلات دور کرنے کے واسطے فرداً
فرداً اور دوسرے شخصوں سے ملکر کوشش کرے" ان الفاظ کے
معنے صاف ہیں۔ مسٹر رانا ڈے چاہتے تھے کہ ہم کو کانگرس میں بیٹھکر
ریزولیوشن پاس کرنے کے علاوہ اس بات کی سخت کوشش کرنی
چاہیئے کہ اہل ملک زیادہ لایق ہوں زیادہ ایماندار ہوں زیادہ معتبر بنیں
زیادہ محنت برداشت کر سکیں۔ مسٹر تیلنگ پر جو انہوں نے لیکچر دیا تھا
اس میں چند قومی ضروریات بیان کرنے کے بعد فرمایا تھا کہ "ہمارا یہ بھی
فرض ہے کہ ہم اپنے ہموطنوں کی پولیٹیکل بہبودی میں دلچسپی ظاہر کرنا سیکھیں
اگرچہ بہت سے لوگ اس سبق کو بڑا آسان سمجھتے ہیں لیکن یہ کام بڑا
مشکل ہے اگر ہم ساتھ ساتھ اپنی قومی زندگی کو دوسرے پہلوؤں میں
بھی بہتر کرنے کی کوشش نہ کریں "۔

آجکل بعض لوگوں کا خیال ہے کہ گورنمنٹ ہماری عرضیوں پر توجہ
نہیں کرتی اس لئے گورنمنٹ کی خدمت میں عرضیاں بھیجنا بالکل فضول ہے
مسٹر رانا ڈے کو اس خیال سے اتفاق نہ تھا۔ ان کی رائے میں پولیٹیکل
ترقی کے لئے سب طریقے ضروری ہیں۔ جو کام گورنمنٹ کے اختیار میں
ہے اس کے متعلق گورنمنٹ سے درخواست کرنی چاہیئے۔ جو کام لوگوں
کے ہاتھ میں ہے اس میں لوگوں کو آپ کوشش کرنی چاہیئے۔ اسی اصول
پر انہوں نے قریباً ۲۰ سال تک پونا میں کام کیا اور وہاں ایسے ایسے مدرسے
اور کارخانے کھولے کہ لوگوں کا حوصلہ پہلے سے دس گنا ہو گیا۔ مگر

ان کو دوسری پارٹی سے اس بات میں اتفاق نہ تھا کہ گورنمنٹ سے ہم کو قطع تعلق کرنا چاہئے۔ وہ گورنمنٹ انگریزی کو ہندوستان کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ ان کو اس بات کا پختہ یقین تھا کہ اگر انگریز ہندوستان میں نہ آتے تو ہندوستان کی نہایت خراب حالت ہوتی۔ یہ پرماتما کی خاص مہربانی اس ملک پر ہوئی کہ اس نے عین ضرورت کے وقت انگریزوں کو اس ملک میں بھیجا۔ وہ انگریزی حکومت کے نقصوں کو اچھی طرح سے جانتے تھے اور ان کو بڑے زور سے ظاہر کرتے تھے مگر ساتھ ہی وہ انگریزی قوم کی خوبیوں پر دلدادہ تھے۔ اور اپنے ہموطنوں کو ہمیشہ تلقین کرتے تھے کہ جو کچھ سیکھنا ہے اور جو کچھ ترقی کرنی ہے انگریزوں کے وقت میں سیکھ لو اور کر لو۔ اسی خیال کو مد نظر رکھکر انہوں نے ہمیشہ انتظام سلطنت کے نقص گورنمنٹ پر ظاہر کئے۔ اور ساتھ ہی لوگوں کو تلقین کی کہ لایق۔ بہادر اور منصف مزاج بنو۔ جہاں کہیں ان کو معلوم دیتا تھا کہ گورنمنٹ کسی خرابی کو دور کر سکتی ہے وہ ہمیشہ باقاعدہ طور پر گورنمنٹ سے درخواست کرتے تھے کہ فلاں خرابی دور کرنی چاہئے۔

سرب جنک سبھا پونا اسی وجہ سے انہوں نے سرب جنک سبھا پونا کی جوان کے دوست شری بابا گنیش واسدیو جوشی نے ۱۸۷۰ء میں قایم کی تھی تن من دھن سے خدمت کی اس سبھا کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کی تکلیفوں کا حال گورنمنٹ پر ظاہر کیا جاوے۔ جو کام اس سبھا نے لوگوں کی بھلائی کے لئے کیا اس کا ثانی تمام ملک میں مشکل سے دکھائی پڑتا ہے۔ کانگرس یا کانفرنس میں جمع

ہو کر گورنمنٹ سے کوئی درخواست کرنا ایک اور بات ہے۔ ایسے مجمع
ہیں بہت تھوڑے آدمیوں کی ذمہ واری ہوتی ہے۔ باقی لوگ دوسروں
کی تقریریں سنکر اپنے گھر واپس آجاتے ہیں۔ سرب جنک سبھا ایک ایسی جماعت
تھی جس میں ہر ایک ممبر سبھا کے کام کا ذمہ وار تھا اور تہ دل سے اس کی
ترقی کے لئے کوشش کرتا تھا۔ ہر ایک طبقہ کے لوگ مثلاً سوداگر، ساہوکار
زمیندار۔ جاگیردار۔ گورنمنٹ پنشنر۔ وکیل۔ پروفیسر اور جنوبی مرہٹہ
دیش کے بہت سے سردار اس سبھا کے ممبر تھے۔ اور اس کی ممبری اسی
شخص کو حاصل ہوتی تھی جس کو کم سے کم پچاس آدمی منتخب کریں۔ ہر ایک
ممبر کو داخلہ کا چندہ اور سالانہ چندہ دینا پڑتا تھا۔ ۱۸۷۸ء میں اس سبھا کی طرف
سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری ہوا جس میں سبھا کے کل معاملات درج کئے
جاتے تھے علاوہ ازیں اس میں ملک کی پولیٹکل حالت کے متعلق بڑے
بڑے لایق اور فاضل مضمون چھاپے جاتے تھے۔ اور گورنمنٹ کی کاروائی
پر بڑی آزادی سے نکتہ چینی کی جاتی تھی۔ سبھا کا کام یہ تھا کہ وہ ہر ایک معاملہ
پر جس میں لوگوں کو تکلیف ہوتی تھی اچھی طرح سے واقفیت پیدا کرتی
تھی۔ شہادت اکٹھی کرتی تھی اور پھر بڑے ادب سے اس معاملہ کو معہ
شہادت اور دلایل کے گورنمنٹ کے سامنے پیش کرتی تھی۔ گورنمنٹ نے
شروع شروع میں کم التفاتی کی اور سبھا کو اپنا بدخواہ بھی سمجھا مگر ۱۸۷۶و۷۷ء
کے قحط میں سبھا نے قحط زدہ اضلاع کی وہ مدد کی اور خود روپیہ خرچ
کر کے اور تکلیف اٹھا کر ان کی حالت گورنمنٹ پر ایسی اچھی طرح ظاہر کی
کہ گورنمنٹ نے سبھا کی مدد اور کوشش کا شکریہ ادا کیا اور اس کی نیک نیتی

کی قایل ہوگئی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہند اور بمبئی کی گورنمنٹ سبھا کی عرضداشتوں پر بڑی توجہ اور غور کرتی تھی۔ اور بہت سی باتوں پر اس کی رائے خود دریافت کرتی تھی۔ سبھا کی اس کامیابی اور عزت کا کیا باعث تھا۔ جواب صاف ہے کہ مسٹر راناڈے کی حب الوطنی دور اندیشی اور حسن انتظام اس کامیابی کا جزو عظیم تھے۔ اگرچہ مسٹر راناڈے اس سبھا کے بانی نہ تھے مگر ۱۸۷۱ء سے جبکہ وہ سب جج ہو کر پونا میں گئے ۱۸۹۳ء تک جبکہ جج ہائی کورٹ ہو کر پونا سے علیحدہ ہوئے وہ اس سبھا کے روح رواں تھے۔ قریباً سب وزن دار پیچیدہ اور پرمغز عرضیاں جو سبھا نے گورنمنٹ بمبئی۔ گورنمنٹ ہند اور پارلیمنٹ کی خدمت میں روانہ کیں یا تو مسٹر راناڈے کی خود لکھی ہوئی تھیں یا اُن کے مشورہ سے لکھی گئی تھیں۔ مثلاً (۱) قحط کے حالات (۲) چٹھی بنام کمیشن قحط دربارہ موت قحط زدگان احاطہ بمبئی (۳) چٹھی بنام گورنمنٹ بمبئی جس میں اس رپورٹ پر بحث کی گئی ہے جو کاشتکاروں کی حالت پر ایک سرکاری کمشنر نے لکھی تھی (۴) عرضداشت بخدمت گورنر جنرل ہند متعلق اس مسودہ کے جو ہندوستانی اخباروں کے قانون کی ترمیم کے لئے درپیش تھا۔ (۵) چٹھی بنام گورنمنٹ آف انڈیا اس ایکٹ کے متعلق جو دکن کے زمینداروں کی مدد کے لئے بنایا گیا تھا۔ (۶) چٹھی بنام گورنمنٹ بنسبت واردات ڈکیتی جو دکن میں ہوتی تھیں۔ (۷) چٹھی بنام گائکوار بڑودہ وسر ٹی مادھوراؤ دیوان ریاست بڑودہ بنسبت آئندہ انتظام ریاست مذکور (۸) درخواست جس میں ہندوستانی طالب علموں کو یوروپ میں بھیجنے پر زور دیا گیا تھا (۹) عرضداشت

بخدمت ڈبلیو۔ ای۔ بیکسٹر صاحب ممبر پارلیمنٹ ۔ (۱۰) چٹھی بنام گورنمنٹ آف انڈیا بالنسبت اس مسودہ کے جو ضابطہ فوجداری کی ترمیم کے لئے درپیش تھا ۔ (۱۱) قحط کی کمیٹی کے سرکلر کا جواب (۱۲) عرضداشت بخدمت پارلیمنٹ بنسبت معافی افسران سرکاری جنہوں نے کرافورڈ صاحب کمشنر کو رشوت دی تھی ایسے ہی بہت سے اور مضمون تھے ۔

پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ ۱۸۷۸ء میں سبھا کا رسالہ نکالا گیا یہ بھی مسٹر راناڈے کی تجویز اور صلاح کا نتیجہ تھا وہ اپنے قول اور فعل کے پکے تھے اور ان لوگوں جیسے نہ تھے جو شروع میں اخباروں کو اپنی مدد کا بھروسہ دیکر جاری کرا دیتے ہیں اور بعد میں ان کی کچھ مدد نہیں کرتے ۔ مسٹر راناڈے نے اس رسالہ کو جاری کرا کر اپنی لیاقت اور حب الوطنی کا بہت بڑا ثبوت دیا ۔ وہ اس رسالہ میں برابر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے ۔ ۷۸ء سے لیکر ۹۳ء تک اس رسالہ کا کوئی نمبر ایسا نہ تھا جس میں مسٹر راناڈے کی تحریر کسی نہ کسی مضمون پر موجود نہ ہو ۔ ان مضامین کا نام ذیل میں درج کیا جاتا ہے :۔

(۱) بمبئی احاطہ میں قحط کا انتظام ۔

(۲) فلاسفر سویڈن برگ کی تصنیفات پر دادوبا پانڈورنگ نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان کی نظر ثانی ۔

(۳) زمینداروں کی خراب حالت اور اس کا سدھار ۔

(۴) دکن کے کاشتکاروں کی مدد کے لئے مسودہ قانون پر بحث ۔

(۵) دیسی ریاستوں کا طرز حکومت ۔

(۶) سر رچرڈ ٹمپل گورنر بمبئی کے عہد حکومت پر رائے۔

(۷) ہندوستان کی مالی حالت کی نسبت فاسٹ صاحب کی کتاب پر بحث

(۸) انتقال اراضی کے قانون پر بحث۔

(۹) سر سالار جنگ کا عہد حکومت۔

(۱۰) احاطہ بمبئی میں ہندو اور مسلمانوں کی طرف سے مندروں اور درگاہوں کے لئے جاگیریں۔

(۱۱) دکن میں بندوبست استمراری کے متعلق سر ولیم ویڈربرن اور اس کے نکتہ چینوں کی رائے۔

(۱۲) احاطہ وسط ہند کے قانون مال گذاری و مزارعان کا مسودہ

(۱۳) مسٹر الیٹ کی کتاب موسومہ راجگان بروده پر رائے

(۱۴) ہندوستان کی سڑکوں۔ ریلوں اور سرکاری تعمیرات کی کمیٹی جو پارلیمنٹ نے مقرر کی تھی۔

(۱۵) اگسٹس مانگریڈین کی کتاب موسومہ فری ٹریڈ (آزاد تجارت) اور انگریزی تجارت پر اور سر لوئیس مالٹ کی چھٹی پر رائے۔

(۱۶) قانون اراضی کی اصلاح اور زراعتی بنک۔

(۱۷) پبلک سروس کمیشن سے پیشتر ہندوستانی افسران سرکاری کی تنخواہ وغیرہ پر خط و کتابت۔

(۱۸) پروفیسر سلبی نے بٹلر کے طریقہ اخلاق پر جو کتاب لکھی ہے اس پر رائے۔

(۱۹) دادا بھائی نوروجی نے ہندوستان کی غربت پر جو ایڈیٹر کی چھٹی لکھی

اس کی نظرِ ثانی ٭

(۲۰) ابتدائی تعلیم اور دیسی مدرسے۔
(۲۱) ملک روس میں غلاموں کی آزادی۔
(۲۲) احاطہ بمبئی میں جنگلات کا انتظام۔
(۲۳) میونسپل کمیٹیوں کا انتظام ہندوستان اور انگلستان میں۔
(۲۴) ملک پرشیا میں اراضی کا قانون اور مسودہ قانون مزارعان۔
(۲۵) مالگذاری کی اصلاح۔
(۲۶) اراضی کے متعلق گورنمنٹ کی پالیسی میں تبدیلی کی شکایت۔
(۲۷) گورنمنٹ کی پالیسی متعلق سڑک و تعمیرات سرکاری۔
(۲۸) سر جیمس فرگسن گورنر بمبئی کے عہد حکومت پر رائے
(۲۹) موروثی افسران کے قانون کی ترمیم کا مسودہ۔
(۳۰) انتظام ضلع کی نئی ترتیب پر رائے۔
(۳۱) ہندوؤں میں شادی کی عمر پہ شاستروں کی رائے
(۳۲) ملک جاوا میں زراعت کا سلسلہ۔
(۳۳) ہندوستان میں مزارعان کے چکوتہ کی نئی ترتیب۔
(۳۴) چیچک کا لازمی ٹیکہ۔
(۳۵) ہندوستان کی پولٹیکل ایکانومی۔
(۳۶) سنہ ۹۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ۔
(۳۷) ہندوستان کے صیغہ مال کی تقسیم
(۳۸) ہندوستانیوں کا غیر ملکوں کو جانے کا سلسلہ۔

(۳۹) بی۔ اے۔ ایم۔ اے پاس نوجوانوں میں موت کے سبب۔

(۴۰) ہندوستان کی صنعت اور اس کی ترقی کی امید

(۴۱) تاریخ مرہٹہ کا ایک حصہ جواب تک تحریر میں نہیں آیا۔

یہ فہرست ظاہر کرتی ہے کہ مسٹر رانادے کا خیال کیسا وسیع تھا اور وہ مختلف قسم کے مضامین پر کس قابلیت سے اپنی رائے ظاہر کرتے تھے۔ سبھا کی طرح سبھا کا رسالہ بھی احاطہ بمبئی میں معزز اور زبردست بن گیا ہندوستانی اور انگریزی اخبار اور انگریزی افسر اس کی نسبت بہت اچھی رائے ظاہر کرتے تھے۔ بعض شخصوں کا خیال ہے کہ مسٹر رانادے کو اس وجہ سے کہ وہ سرکاری ملازم تھے سرب جنک سبھا اور اس کے اخبار سے تعلق نہیں رکھنا چاہئے تھا۔ مگر یہ اعتراض بالکل بے معنی ہے۔ یہ اخبار لوگوں پر گورنمنٹ کی خوبیاں ظاہر کرتا تھا اور گورنمنٹ کو لوگوں کی تکلیفوں سے آگاہ کرتا تھا اور جو جو نقص گورنمنٹ کی کارروائی میں ہوتے تھے ان پر نکتہ چینی کرکے ان کو رفع کرانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ سرکاری افسروں کی نہ بیجا شکایت کرتا تھا نہ بیجا تعریف۔ یہ طریق عمل سرکار کی بدخواہی میں داخل نہیں ہے۔

مسٹر رانادے اور ان کے ہم خیال دوستوں کی لیاقت کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نازک کام کو ایسی خوش اسلوبی سے نبھاتے تھے کہ بڑے بڑے معزز شخص ان کی تعریف کرتے تھے اور سبھا اور اس کے اخبار کی رائے کو بڑی قدر اور توجہ سے دیکھتے تھے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ اکثر سرکاری افسر اس بات کو برداشت نہیں کرسکتے ہیں کہ کوئی ہندوستانی شخص یا اخبار ان کی رائے پر نکتہ چینی کرے۔ مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بعض

اوقات ہم نکتہ چینی ایسے الفاظ میں کرتے ہیں کہ دوسرا شخص اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھ نہیں سکتا بلکہ اس کی مخالفت پر آمادہ ہو جاتا ہے مسٹر راناڈے نکتہ چینی بڑی سخت کرتے تھے مگر ان کی تقریر یا تحریر میں ہلکاپن نہ تھا۔ ان کی ہر ایک رائے پر ان کی سنجیدگی۔ علمیت اور ہمدردی کا ایسا رنگ چڑھا ہوتا تھا کہ اس کو سن کر سب خوش ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنی عقلمندی اور میانہ روی سے سربجنک سبھا کو سخت کلامی اور بیضابطہ کارروائی سے بچائے رکھا۔ مگر جب ہمت دکھانے کا موقع ہوتا تھا تو اس حوصلہ سے کام کیا جاتا تھا کہ گورنمنٹ بھی دنگ ہو جاتی تھی ۱۸۷۶و۷۷ء کا قحط بمبئی احاطہ میں ۶۴۰۰۰ مربع میل پر حاوی تھا اور ۹۰ لاکھ آدمیوں پر اس کا اثر تھا۔ سبھا نے صرف یہی نہیں کیا کہ قحط کے متعلق گورنمنٹ کے پاس عرضیاں روانہ کیں اور قحط کی سختی کم کرنے کے لئے تجویزیں پیش کیں۔ سبھا کے کارندے ضلع پونا۔ ستارہ۔ شولاپور۔ احمدنگر اور بیجاپور کے دیہات میں دورہ کرتے تھے اور وہاں دریافت کرتے تھے کہ لوگوں کی کیا حالت ہے۔ ان کے ڈنگروں کی کیا حالت ہے پانی وہاں مل سکتا ہے یا نہیں۔ بارش بالکل نہیں ہوئی یا کم ہوئی۔ لوگ دیہات کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں یا نہیں۔ اُن کے بیانات کبھی ناکافی ہوتے تھے کبھی ان میں مبالغہ ہوتا تھا مگر وہ ان دیہات کی حالت کا اچھا نقشہ کھینچتے تھے۔ جو حالات ان کارندوں نے دریافت کئے ان کی بنیاد پر سبھا نے گورنمنٹ کی خدمت میں قحط کے متعلق اپنی تجویزیں پیش کیں یہ سب مسٹر راناڈے نے لکھی تھیں۔ سبھا نے اس بات پر زور دیا کہ جنگلات

کا کٹ جانا - بے تردد زمینوں کا زراعت میں سے لینا - دو یا تین فصلوں میں متواتر بارش کا نہ ہونا - اور غریب اضلاع میں بندوبست کے ذریعہ سے معاملہ کو بڑھانا قحط کے سبب ہیں - پھر یہ ظاہر کیا کہ گورمنٹ نے قحط زدہ لوگوں کی مدد کے لئے جو کام جاری کئے ہیں ان سے ضرور ان لوگوں کو مدد ملے گی مگر اس کام کے لئے روپیہ اتنا تھوڑا منظور رہوا ہے - اور ہر ایک مرد اور عورت کے لئے مزدوری اتنی تھوڑی مقرر کی گئی ہے کہ بہت سے لوگ اسے منظور نہیں کرتے - اور اس خیال سے کہ شاید کہیں اور اچھی مزدوری ملے بھوکے بچوں اور عورتوں اور ڈنگروں کو لے کر آوارہ پھرتے ہیں - ان ڈنگروں کی ایسی خراب حالت تھی کہ سوائے قصائی کے اور کوئی شخص ان کو خریدنا پسند نہ کرے - اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ جن لوگوں کے پاس اناج یا روپی ہوتی تھی ان کو آوارہ لوگ لوٹ لیتے تھے - اس لئے سبھا نے یہ تجویز پیش کی کہ منجد اور ردھمند کے درمیان ریل کی سڑک بنائی جائے تاکہ وہاں غریب آدمی مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھریں - گورمنٹ نے سبھا کی یہ تجویز پسند کی +

دوسری تجویز سبھا نے یہ پیش کی کہ لوگوں کو گورمنٹ کی طرف سے اس بات کا مشورہ دیا جائے کہ وہ قحط زدہ مقامات سے اٹھ کر صوبجات وسط ہند و برار میں جہاں غلہ کی افراط تھی جائیں +

تیسری تجویز یہ تھی کہ زمینداروں کے ڈنگروں کو قریب کے پہاڑوں پر سرکاری افسروں کی نگرانی میں بھیجدیا جائے تاکہ وہ موت سے بچے رہیں - علاوہ ازیں سبھا کی یہ رائے تھی کہ قحط کے دنوں میں گورمنٹ کو چاہئے

کہ جو غلہ باہر سے قحط زدہ شہروں اور گاؤں میں آئے اسپر محصول چونگی معاف کرے۔ اور ریلوے والوں کو مشورہ دے کہ وہ غلہ پر کم محصول لیں اور جہاں ریل کی سڑک نہ ہو وہاں ریل بنائی جائے۔ ان تجویزوں کے بعد سبھا نے سرکار کا شکریہ ادا کیا اور اس کو یقین دلایا کہ گو سرکار نے رعایا کی کافی مدد نہیں کی تاہم لوگ اس کی نیک نیتی کے مشکور رہیں۔ ایسے ہی کئی عرضیاں سبھا نے وقتاً فوقتاً قحط کے دوران میں گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کیں۔ سبھا کی چند تجویزوں پر گورنمنٹ نے عمل کیا اور سبھا کی کوشش کی تعریف کی۔ قحط دور ہونے کے بعد سرکار کی طرف سے ایک کمیشن اس غرض سے مقرر ہوئی کہ وہ قحط کے سبب دریافت کرکے ان کو رفع کرنے کی تجویزیں پیش کرے اس کمیشن پر قحط کا اصلی حال ظاہر کرنے کی غرض سے مسٹر رانا ڈے نے مئی ۱۸۸۰ء میں سرب جنک سبھا کے رسالہ میں ایک بیباک آرٹیکل لکھا جس میں گورنمنٹ کی غلطیاں بڑے زور سے ظاہر کیں۔ اس کے شروع میں گورنمنٹ کے انتظام کی تعریف کی ہے مگر بعد میں لکھا ہے کہ تعریف کرنے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم انتظام گورنمنٹ کے نقص بھی عوام پر ظاہر کریں۔ اور سرکاری افسران نے اپنے انتظام کی جو حد سے زیادہ تعریف کی ہے اس کی بیہودگی ثابت کریں۔

سر رچرڈ ٹمپل گورنر بمبی نے قحط کی رپورٹ اس مدعا سے لکھی ہے کہ اپنے انتظام کے نقص کو چھپائے اور اس غلط خیال سے کہ زمینداروں کے پاس بہت غلہ موجود ہے اور وہ قحط کی سختی برداشت کر کے

سرکاری مالگذاری بھی ادا کر سکتے ہیں جو جو سختیاں گورنمنٹ نے شرح مزدوری کے کم کرنے ۔ مالگزاری کو معاف نہ کرنے اور مستحق لوگوں کو مدد نہ دینے میں کیں اُن کو بہانہ بازی و جھوٹی دلیلوں سے مناسب ثابت کرے ۔ گورنمنٹ کی کارروائی پر انگریزی اخباروں نے جو کم نکتہ چینی کی ہے اس سے عیاں ہے کہ یہ اخبار نیم سرکاری ہیں ۔ تمام قحط میں یہ اخبار بدقسمتی سے سرکار کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے ۔ ہندوستانی اخباروں نے بہت واویلا کیا مگر ان کی کسی نے پرواہ نہ کی ۔ گورنمنٹ نے کچھ توجہ سرب جنک سبھا کی عرضیوں پر کی کیونکہ سبھا کے کارندے ۔ اور نامہ نگار قحط زدہ مقامات میں دورہ کرتے تھے اور بہت سی جگہ اس کی شاخیں بھی موجود تھیں ''

لاجواب دلایل سے مسٹر رانادے نے ثابت کر دیا کہ گورنمنٹ نے قحط کے متعلق جو اپنی تعریف کی تھی وہ بالکل بے بنیاد تھی ۔ یہ ریڈیکل سرکاری افسروں اور بڑے بڑے آدمیوں نے پڑھا اور ان کے سامنے قحط کے حالات کا وہ پہلو جو گورنمنٹ کی رپورٹوں میں دکھائی نہیں پڑتا تھا اچھی طرح سے ظاہر ہوا ۔

سرب جنک سبھا کی ایسی دلیرانہ کارروائی سے کبھی کبھی اس پر سرکار کی بدخواہی کا الزام لگایا جاتا تھا مگر جو شخص کچھ بھی عقل رکھتے تھے وہ خوب سمجھ گئے کہ سبھا گورنمنٹ کے برخلاف نہیں ہے ۔ ٹائمس آف انڈیا اخبار جو بمبئی سے شائع ہوتا ہے اہل ہند اور اُن کی سبھاؤں کا کوئی خاص دوست نہیں ہے مگر ابھی سبھا کے رسالہ

کے صرف چار ہی نمبر نکلے تھے کہ ٹائمس نے ایک آرٹیکل میں اس کی بڑی تعریف کی اور لکھا کہ "بعض لوگ سرب جنک سبھا کو سرکار کا مخالف بیان کرتے ہیں مگر گزشتہ چار نمبروں سے اس بیان کی تائید بالکل نہیں ہوتی۔ بیشک گورنمنٹ کی کارروائی پر سبھا کی طرف سے بڑے زور سے عمدہ طرح نکتہ چینی کی گئی ہے۔ مگر اس نے کبھی یہ ترغیب نہیں دی کہ لوگوں کو سرکار کی اطاعت نہ کرنی چاہئے۔ ہندوستانی زبان کے اخبارو ں کو سرکار کی نگرانی میں رکھنے کے مضمون پر جو آرٹیکل سبھا کے رسالہ میں شائع ہوا اُس میں بجائے اس کے کہ سبھا کی طرف سے گورنمنٹ کی نسبت دشمنی ظاہر کی جائے گورنمنٹ ہند کو گورنمنٹ روس سے مقابلہ کر کے روس پر ترجیح دی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستان اگر کبھی ترقی کرسکتا ہے تو انگریزی سلطنت میں کرسکتا ہے"۔

لارڈ رے گورنر بمبئی نے اپنے عہد حکومت میں ہندوستانیوں سے عمدہ برتاؤ رکھا تھا۔ جب وہ عہدہ گورنری سے علیحدہ ہو کر ولایت جانے لگے تو سرب جنک سبھا نے ان کی خدمت میں اظہار افسوس کے لئے ایڈریس پیش کیا۔ اس کے جواب میں لارڈ رے نے فرمایا کہ "آپ کی سبھا میری کارروائیوں پر وقتاً فوقتاً نکتہ چینی کرتی رہی ہے۔ میں ایسی نکتہ چینی سے نہیں گھبراتا اگر وہ اُن شرائط کو پورا کرے جو لی وارنر صاحب نے بیان کی ہیں۔ میں ایسی نکتہ چینی کو مفید سمجھتا ہوں اور میں لارڈ ہیرس سے بھی کہوں گا کہ اگر وہ اس سبھا سے اچھا برتاؤ کریں گے تو ان کو بمبئی کی حکومت میں بہت کم دقت ہوگی۔ ایک زمانہ تھا

جبکہ اس سبھا کو نیم خیر خواہ گورنمنٹ سمجھا جاتا تھا مگر اس زمانہ میں گورنمنٹ
کی کارروائی پر نکتہ چینی کرنا ہی گورنمنٹ کی بدخواہی میں داخل تھا مگر
اب ایسی بدگمانی کا نام تک نہیں ۔"

یہ عزت سرب جنک سبھا کو مسٹر راناڈے کی عقل اور ہمت کی وجہ
سے نصیب ہوئی ۔ اس سبھا کا کام صرف لوگوں کی تکلیفوں کو گورنمنٹ
پر ظاہر کرنا ہی نہ تھا ۔ بلکہ اس نے بہت سے نوجوانوں کی طبیعت کا
رنگ بدل کر ان کو اپنی قوم کا پکا خیر خواہ بنا دیا ۔ مسٹر گوکھلے جو بنارس
کانگرس کے پریذیڈنٹ تھے اور کئی دفعہ انگلستان میں جا کر وہاں کے
لوگوں کو ہندوستانیوں کی غریب اور بیکس حالت کی کہانی سنا چکے ہیں
مسٹر راناڈے کے زیر سایہ آکر سرب جنک سبھا کے رسالہ کے اڈیٹر
مقرر ہوئے اور وہاں ان کو مسٹر راناڈے کے صلاح مشورے سے
وہ تربیت حاصل ہوئی کہ جس کی بدولت اس وقت کانگرس لیڈروں
میں ان کو ایک معزز رتبہ ملا ہوا ہے ۔ اسی طرح مسٹر راناڈے نے
اور کئی نوجوانوں کو اخلاقی روشنی دی اور ان میں حوصلہ اور ہمت ڈال
کر ان کی مدد سے پونا میں طرح طرح کے کام لوگوں کے فایدہ کے لئے
جاری کئے ۔ اس قسم کا کام پالیٹکس کا اصلی جزو ہے ۔ جو شخص اپنی
قوم کو زیادہ لایق بناتا ہے اس کے بازوے ہمت کو مضبوط کرتا ہے
اور اس کے سامنے اعلٰے خیالات پیش کرتا ہے ۔ وہ اپنے ملک کا
سچا خیر خواہ ہے ۔ اس معنے میں اور اس کام کا لحاظ کر کے جو مسٹر راناڈے
نے سرب جنک سبھا اور پونا کی دوسری تحریکوں کے متعلق کیا وہ ہندوستان

کے برگزیدہ بالی ٹی شن تھے۔ یاد رہے کہ کانگرس اور کانفرنسوں کی
پیدایش سے پیشتر ہی مسٹر رانادے خیرخواہان قوم کے لئے ایک معقول
پولٹیکل پروگرام قایم کرچکے تھے۔ آجکل چاروں طرف واویلا مچا ہے
کہ ملک کی پولٹیکل سبھائیں عملی کام کچھ نہیں کرتیں۔ تعلیم یافتہ آدمی سب جگہ
موجود ہیں۔ مگر کسی کو کام کرنے کا طریقہ نہیں آتا۔ شروع شروع میں سبھائیں
ذرا جوش خروش دکھاتی ہیں مگر تھوڑے عرصہ کے بعد سب کا زور ہلکا
ہوجاتا ہے۔ ان دنوں میں اس بات کا چرچا ہے کہ ہر ایک ضلع میں
ڈسٹرکٹ ایسوسی ایشن بنائی جائے اور اس کی ذریعہ سے لوگوں
کی مردہ روحوں میں جان ڈالی جائے۔ عملی کام کی ضرورت سب محسوس
کرتے ہیں مگر کام کرنا کسی کو نہیں آتا۔ یہ حال ۱۹۰۸ء کا ہے۔ مسٹر رانادے
نے کانگرس کی پیدایش سے پیشتر یہ سب معمے حل کردیئے تھے۔ سرب
جنک سبھا نے وہ مفید کام کیا اور گورنمنٹ کی اس زور شور سے نکتہ چینی
کی کہ کوئی اور سبھا کیا کرے گی۔ مگر سبھا میں لایق اور محنت کش آدمی موجود
تھے جو سبھا کے مدعا کی کامیابی کے لئے کسی تکلیف سے گریز نہیں کرتے
تھے۔ دیہات میں دورہ کرتے تھے۔ شہادت فراہم کرتے تھے سرکاری
کتابیں اور رپورٹیں پڑھتے تھے گورنمنٹ کا دنداں شکن جواب دیتے
تھے۔ اور سرکاری افسروں کی دھمکیوں سے نڈر تھے۔ اس طریق پر اگر
کوئی سبھا عمل کرے تو ضرور کامیاب ہوگی۔ جو لوگ ماڈریٹ یا اعتدال
پسند پارٹی میں ہیں ان کو سرب جنک سبھا کا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے
مگر باقاعدہ کوشش اور محنت کرنا ہمارے لئے مشکل ہے ؛

مسٹر گوکھلے نے ایک دفعہ مسٹر رانا دے سے کہا کہ سوشل ریفارم کے بہت سے مددگاروں کی یہ رائے ہے کہ سوشل کانفرنس میں بیٹھکر تجویزیں پاس کرنے کا کام بالکل فضول ہے اس سے سوشل ریفارم کو کچھ فایدہ نہیں پہنچتا۔ یہ سنکر مسٹر رانا دے نے جواب دیا کہ یہ کام فضول نہیں صرف ان لوگوں کا ہنوائش فضول ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے یہ فرمایا کہ "چند سال اور ٹھیرو۔ کچھ عرصہ میں لوگ کانگرس کی نسبت بھی ایسے ہی اعتراض کرینگے جیسے کہ وہ اب سوشل کانفرنس کی نسبت کرتے ہیں۔ گو آجکل وہ کانگرس میں بڑی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کی نیچر میں کچھ ایسی بات ہے کہ ہم لوگ لگاتار محنت اور کوشش سے گریز کرتے ہیں"۔

مسٹر رانا دے نے اپنے دل میں اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ عمدہ نتائج حاصل کرنے کے لئے سالہا سال کی سخت محنت کی ضرورت ہے۔ یہ مشورہ وہ ہمیشہ اپنے ہمراہیوں کو دیتے تھے۔ ۹۱ء میں ضلع شولاپور اور بیجاپور میں سخت قحط پڑا۔ سرب جنک سبھا نے ان اضلاع میں اپنے کارندہ بھیجکر بڑی محنت سے وہاں کے لوگوں کے اصلی حالات دریافت کئے اور ان کی تکلیف کا حال گورنمنٹ کے پاس روانہ کیا۔ مسٹر گوکھلے فرماتے ہیں کہ یہ عرضداشت سرب جنک سبھا نے بڑی غور و فکر کے بعد تیار کی تھی۔ اس کے جواب میں گورنمنٹ نے صرف یہ الفاظ لکھے کہ سبھا کی عرضداشت گورنمنٹ نے پڑھ لی ہے۔ مسٹر گوکھلے ان دنوں میں سبھا کے سکرٹری تھے وہ فرماتے ہیں کہ میں اس واقعہ کے بعد

مسٹر راناڈے سے ملا اور میں نے کہا کہ ہم کو اس قدر تکلیف اٹھانے اور گورنمنٹ کی خدمت میں ایسے میموریل بھیجنے سے کیا فایدہ ہے جبکہ گورنمنٹ صرف یہ جواب دیتی ہے کہ ہم نے تمہاری عرضی پڑھ لی ہے۔ مسٹر راناڈے نے فرمایا کہ وہ آپ اس اصلی کام کو نہیں سمجھتے جو تعلیم یافتہ محبان قوم کر رہے ہیں۔ یہ عرضیاں گو ظاہر اطور پر گورنمنٹ کے نام بھیجی جاتی ہیں۔ مگر در اصل مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے لوگ اُن کو پڑھیں اور ان پر غور کرنا سیکھیں۔ پالٹکس کا کام اس ملک میں بالکل نیا ہے اور ہم لوگوں کو گورنمنٹ کی خدمت میں عرضیاں وغیرہ سالہا سال تک بھیجنی چاہئیں بلا اس امید کے کہ ان سے کوئی عمدہ نتیجہ بر آمد ہو۔ علاوہ اس کے اگر گورنمنٹ ہماری عرضیاں پڑھ لے تو اس میں بھی ہمارا فایدہ ہے نقصان نہیں ؟؟

کانگرس کے اجلاس میں انکی شمولیت

گو مسٹر راناڈے کھلم کھلا کانگرس میں یا دوسرے پولٹیکل جلسوں میں لیکچر نہیں دیتے تھے مگر پولٹیکل تحریک سے ان کی ہمدردی سب پر روشن تھی۔ انہوں نے اس غرض سے کہ تمام ملک کے تعلیم یافتہ آدمیوں سے ان کا تعلق قایم رہے۔ اپنی سوشل کانفرنس کو کانگرس کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ جہاں کانگرس ہوتی تھی وہیں کانفرنس ہوتی تھی اور ملک کے معزز لوگوں کو ان کی پر اثر تقریروں سے فیضیاب ہونے کا موقع ملتا تھا۔ گو وہ کانگرس کے مقام پر صرف کانفرنس کے

لئے ہی جاتے تھے مگر وہاں کانگرس کے جلسے میں بھی برابر شریک ہوتے تھے اور بعض اوقات کانگرس کے لیڈران کی مشکل کشائی اپنی سنجیدہ رائے سے کرتے تھے اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسٹر راناڈے اپنے ملک کی پولیٹکل حالت اور ضروریات سے اچھی طرح واقف تھے اور ان کے متعلق انہوں نے اپنی رائے پختہ بنائی ہوئی تھی۔ اور وہ اسے ظاہر کرنے سے کبھی نہیں ڈرتے تھے۔ ۱۸۹۹ء میں مسٹر دادا بھائی نوروجی کی تصویر کسی مقام پر بمبئی میں رکھی گئی تھی اس موقع پر جو جلسہ ہوا اس کے صدر انجمن مسٹر راناڈے تھے۔ انہوں نے وہاں مسٹر نوروجی کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ہر ایک تعلیم یافتہ آدمی کا فرض ہے کہ مسٹر نوروجی کی طرح اپنے آپ کو اپنے ملک پر نثار کرے اور کوئی شخص مہذب کہلانیکا مستحق نہیں جب تک کہ وہ اپنے ملک کی حالت پر کچھ توجہ نہ کرے اور اس کی ترقی کے لئے کوشش نہ کرے۔ یہ کیا۔ بیسیوں موقعوں پر وہ اپنی تحریر اور تقریر میں ملک ہند کے افلاس پر دادا بھائی نوروجی کی طرح نوحہ کرتے تھے۔ اور انگلستان کے مدبروں اور فلاسفروں نے جو غلطیاں ہندوستان کی مالی حالت کے نسبت کی ہیں ان کو ظاہر کر کے ان کی دھجیاں اڑاتے تھے۔

کاش کہ مسٹر راناڈے کانگرس کے سکرٹری ہوتے (کاش کہ مسٹر تیلنگ

جج ہائی کورٹ کا بے وقت انتقال نہ ہوتا اور مسٹر راناڈے پونا میں اپنی ملازمت کی میعاد ختم کر کے سرکار کی تابعداری سے آزاد ہوتے اور کھلم کھلا انڈین نیشنل کانگرس کی کشتی کو اپنے ہاتھ میں لیتے +

جنہوں نے اگست ۱۹۰۴ء کا ہندوستان ریویو پڑھا ہے ان کو مسٹر
اسنڈ چاریو کے آرٹیکل سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ۹۳ء میں ہائی کورٹ
کے جج ہونے سے پیشتر مسٹر راناڈے نے مسٹر چاریو سے وعدہ کیا تھا
کہ میں سرکاری ملازمت سے جلد علیحدہ ہو کر کانگرس کے جنرل سکرٹری
کا عہدہ قبول کر لوں گا۔ اس وقت مسٹر چاریو اس عہدہ پر ممتاز تھے اور
وہ آیندہ اس کو منظور کرنا نہیں چاہتے تھے مگر مسٹر راناڈے کے وعدہ
پر انہوں نے آیندہ سال کے لئے سکرٹری رہنا پسند فرمایا مگر ۹۳ء میں
مسٹر تیلنگ اس دنیا سے کوچ کر گئے اور ان کی جگہ مسٹر راناڈے
جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے۔ سرکاری ملازم رہکر کانگرس کا سکرٹری
بننا مشکل تھا۔ کون نہیں سمجھ سکتا کہ وہ بیش قیمت وقت جو ہائی کورٹ کی
خدمت میں مسٹر راناڈے نے صرف کیا قومی خدمت کے لحاظ سے
بہت بہتر استعمال ہوتا اگر وہ بان پرستی ہو کر اپنی عقل اور ہمت کانگرس
کے کام کو زیادہ مفید بنانے میں صرف کرتے۔ اور بمبئی۔ مدراس کلکتہ
الہ آباد۔ لاہور میں دو دو چار چار مہینہ رہکر وہاں کے لوگوں کو ملک کا سچا
سیوک بناتے۔ آجکل ہندوستان کے پولٹیکل دایرے میں اس بات
کی ضرورت کون محسوس نہیں کرتا کہ ہمارے لیڈر آپس کا لڑنا جھگڑنا اور
ایک دوسرے کو بدنام کرنا چھوڑیں اور مل کر کام کرنا سیکھیں۔ بعض لوگ
اس لڑنے جھگڑنے کو ترقی کا نشان سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے ہماری خانہ
جنگی میں خدا کی کچھ حکمت ہو۔ مگر میرے خیال میں یہ خانہ جنگی ہماری قومی
ترقی کے لئے بالکل ضروری نہیں۔ جو وقت اور زور اس نفسا نفسی

میں صرف ہوتا ہے وہ بہتر کاموں میں استعمال ہو سکتا ہے۔ مگر شاید ابھی تک ہماری قوم کافی طور پر نیچے نہیں گری شاید ہم کو ابھی اور زیادہ ذلت دیکھنی ہے اور اس خراب دن کے دیکھنے کے لئے ہم سب مل کر خوب کوشش کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو ذلیل بنا رہے ہیں۔ اگر مسٹر راناڈے سنہ ۹۳ء میں ملازمت سے علیحدہ ہو کر کانگرس کے سکریٹری بن جاتے تو کانگرس کی کایا پلٹ جاتی۔ وہ ان مضامین پر جس میں کانگرس دلچسپی ظاہر کرتی ہے لائق آدمیوں سے کتابیں تیار کراتے تاکہ ان کتابوں کو پڑھکر ہر ایک شخص پوری واقفیت حاصل کر سکے وہ اس بات کی کوشش کرتے کہ جو شخص جلسہ کانگرس میں تقریر کرنا چاہتا ہے وہ پہلے اپنے مضمون پر اچھی طرح سوچ بچار کرے اور پھر کانگرس میں آکر تقریر کرے۔ سوم وہ اس بات کا انتظام کرتے کہ کانگرس کے خیر خواہ تمام ملک میں ضلع بہ ضلع ایک ایسوسی ایشن (سبھا) قایم کریں اور اس کے ذریعہ سے عوام الناس میں قومی خدمت کا جوش پیدا کریں تاکہ جا بجا سکول اور کارخانے جاری ہوں .... اور ملک سے جہالت اور غربت دور ہو۔ سب سے اچھا کام وہ یہ کرتے کہ اپنی صلح پسند طبیعت کی بدولت وہ کانگرس کے خیر خواہوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑنے سے بچاتے اور ان کو قومی فائدہ کے کاموں میں مشغول رکھ کر اس بات کا موقع نہ دیتے کہ ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ کسی کو تمام ملک میں لکچر دینے کا کام سپرد کرتے۔ کسی کو قومی اخبار کا ایڈیٹر مقرر کرتے کسی کو کتابیں لکھنے پر تعینات کرتے۔ کسی کو ولایت بھیجتے۔ کسی کو چندہ

اکٹھا کرنے پر لگاتے۔ غرضیکہ ہر ایک آدمی کو اس کی عقل اور ہمت کے مطابق کوئی نہ کوئی کام سپرد کرتے۔ اور اپنی محبت اور مشورہ سے اُسکا حوصلہ بڑھاتے رہتے۔ مگر ہماری قوم ایسی خوش قسمت نہ تھی کہ مسٹر رانا ڈے جیسا بے مثال کام کرنے والا اس کو پولٹیکل کشتی کے چلانے کے لئے ملتا۔ ایسے شخص کا ملنا ابھی مشکل ہے۔ مسٹر رانا ڈے کو یاد کر کے ہم دست افسوس ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ ہائی کورٹ کے جج بننے کے بجائے کانگریس کے سکریٹری بنتے۔ گورنمنٹ کو ہائی کورٹ کی ججی کے لئے لائق ہندوستانی وکیلوں یا جوڈیشل افسروں میں سے بہت شخص مل سکتے ہیں مگر ہماری قوم کو مسٹر رانا ڈے جیسا محنت کش۔ فراخ دل اور اعلیٰ دماغ والا جان نثار مشکل سے میسر آتا ہے۔ وہ گورنمنٹ انگریزی کے خلاف نہ تھے بلکہ اس بات کو خدا کی خاص مہربانی سمجھتے تھے کہ اس نے انگریزوں کو ہندوستان میں بھیجا۔ ان کا پکا یقین تھا کہ اگر ہندوستان کبھی اپنی گری ہوئی حالت سے اٹھ سکتا ہے۔ تو انگریزوں کی بدولت ہی اٹھ سکتا ہے کیونکہ حب الوطنی۔ عالی ہمتی۔ وقت کی پابندی۔ تعلیم و تربیت۔ اور ایسی ہی اور خوبیاں ہم کو انگریزی حکومت کی وجہ سے ملی ہیں۔ گو بعض انگریز ہم سے بدسلوکی کرتے ہیں اور اپنے فایدہ کے مقابلہ میں ہمارے فایدہ کی کم پرواہ کرتے ہیں مگر عقلمند آدمی کو چاہئے کہ انگریزوں کی موجودگی سے جس قدر فایدہ اٹھایا جائے اٹھائے۔ ریل۔ تار۔ چھاپہ خانہ۔ اخبار۔ یورپ اور امریکا کا سفر۔ وہاں کے لوگوں کی مثال ہماری مردہ ہڈیوں میں نئی روح پھونک رہے ہیں۔ ان کی بدولت ہماری دھارمک۔ سوشل

تعلیمی اور تجارتی زندگی کی کایا پلٹ رہی ہے ۔ افسوس ہے اگر اس زمانہ میں بھی ہم ترقی نہ کریں ۔ ان خیالات کے ساتھ مسٹر راناڈے کانگرس کے ذریعہ سے ملک کے چاروں طرف روشنی پھیلاتے اور خیر خواہان قوم کی اس طرح قومی خدمت میں مصروف کرتے کہ سب طرف ترقی ہی ترقی نظر آتی ۔

ہندو مسلمانوں کا باہمی نفاق

پالیٹکس کے متعلق مسٹر راناڈے کے مذکورہ بالا خیالات معلوم کرنے کے بعد ہر ایک شخص کے دل میں اس بات کی خواہش ہوتی ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی نسبت جو اُن کی رائے تھی اس سے بھی آگاہی حاصل ہو ۔ ہندو مسلمانوں کے تعلقات کا سوال ایسا پیچیدہ اور مشکل ہے کہ اچھے سے اچھے مدبر اس پر غور کرتے کرتے تھک گئے اور مشکل حل نہیں ہوتی ۔ ذہنی طور پر ہم سب ہندو اور مسلمان اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ دونوں قوموں کے اتفاق کے بغیر ہندوستان کی ترقی نہیں ہو سکتی ۔ نہ ہندو مسلمانوں کو اس ملک سے نکال سکتے ہیں اور نہ مسلمان ہندوؤں کو سرکاری مدرسے دونوں کے لئے یکساں کھلے ہوئے ہیں ایک قوم دوسرے کو پڑھنے سے نہیں روک سکتی سرکار کی طرف سے دونوں پر ایک ہی طرح کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں انگریزوں اور یوریشینوں کے مقابلہ میں دونوں کی یکساں بے قدری ہوتی ہے بڑے بڑے عہدے انگریزوں کو دیئے جاتے ہیں ۔ کیونکہ گورنمنٹ

کی راستے ہیں اہل ہند ان کے مستحق نہیں۔ چھوٹی چھوٹی اسامیوں کی
خاطر ہندو و مسلمان آپس میں لڑتے ہیں۔ اور انگریزوں کی نظروں میں ذلیل ہوتے
ہیں۔ مگر باوجود ان باتوں کو سمجھنے کے عید یا محرم۔ ہولی یا دسہرہ کے موقع
پر ہندو و مسلمانوں میں کسی خفیف معاملہ پر اتنا تنازعہ ہو جاتا ہے کہ گویا وہ
ایک دوسرے کے جانی دشمن ہیں۔ اور ان میں کبھی بھی اتفاق نہیں ہو
سکتا۔ یہ حال صرف ان پڑھ لوگوں کا نہیں ہے پڑھے لکھے بھی اس مرض
میں مبتلا ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ مسلمان انگریزوں کی خوشامد کر کے ترقی کرنا
چاہتے ہیں اور ہندوؤں کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ بلکہ اس خوشامد کی وجہ
سے وہ ہندوؤں کے ساتھ رفاہ عام کے کاموں میں بھی شریک نہیں ہوتے
ان کی پالیسی یہ ہے کہ سرکار کو خوش رکھیں اس لئے وہ سرکاری افسران
کی ناانصافی اور جبر کو بھی افشا نہیں کرتے اور ان کی نکتہ چینی سے بہت
گریز کرتے ہیں۔ یہانتک کہ جو کوشش پولٹیکل ترقی کے لئے ہندو کرتے
ہیں مسلمان اس کو مفسدہ پردازی کا نام دیتے ہیں۔ سودیشی تحریک تمام
ملک کے فایدے کے لئے جاری ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو جو اپنی غربت
کا نالہ ہمیشہ سناتے رہتے ہیں سودیشی تحریک سے فایدہ اٹھانے کی بہت
گنجایش ہے مگر وہ ہندوؤں سے ایسے بیزار ہیں کہ اُن کا اچھا کام بھی
ان کو برا معلوم ہوتا ہے اور وہ سودیشی تحریک کی نسبت اس طرح گفتگو
کرتے ہیں کہ گویا اس تحریک سے صرف ہندوؤں کو ہی فایدہ ہوگا اور
اس کے حق میں کلمہ خیر کہنا ہندوؤں پر بڑا احسان کرنا ہے۔ اگر ہندوؤں
کو کسی معاملہ میں ناکامیابی ہوتی ہے تو مسلمان صاحبان اُن کا مخول اڑاتے

ہیں اور اپنی دانشمندی پر بڑے نازاں ہوتے ہیں۔ ہندو کہتے ہیں کہ مسلمانوں
میں اچھی خاصی تعداد ایسے شخصوں کی ہے جن کے بزرگ کسی زمانہ میں
ہندو تھے اور بعد میں کسی وجہ سے مسلمان ہو گئے اس لئے ان کو مسلمانوں
کی یہ شیخی کہ ہم صدیوں تک ہندوستان کے بادشاہ رہے ہیں اور ہندوؤں
سے جو ہمارے مطیع رہ چکے ہیں مغلوب ہونا نہیں چاہتے بالکل بیجا معلوم
ہوتی ہے۔ ہندوؤں کے ان خیالات کے مقابلہ میں مسلمانوں کی یہ رائے
ہے کہ تعداد۔ تعلیم اور دولت میں ہندو ہم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اگر ان کی
پولٹیکل جد وجہد کامیاب ہو گئی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک میں سب عہدے
ہندو ہی حاصل کر لینگے اور ہم دیکھتے کے دیکھتے رہ جائیں گے۔ اور ہم کو
ان لوگوں کا تابعدار بننا پڑے گا جن پر ہمارے بزرگ کئی صدیوں تک
حکومت کرتے رہے ہے۔ گورنمنٹ کے مقابلہ میں ہندوؤں کی طاقت بہت
کمزور ہے اس لئے ہم کو ہندوؤں سے موافقت کرنے سے کچھ فایدہ
نہیں۔ گورنمنٹ زبردست ہے اور اس کی مہربانی سے ہم کو بیشمار فایدے
پہنچ سکتے ہیں اس لئے ہم کو گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہئے۔ اور
اپنی وفاداری ظاہر کر کے تعلیم اور ملازمت کے معاملہ میں مسلمانوں کو خاص
رعایت دلانی چاہئے۔ اگر سرکاری افسران ہندوؤں سے بدسلوکی یا بے
انصافی کریں تو ہماری بلا سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہندوؤں کی پولٹیکل جدو
جہد کو مفسدانہ کارروائی بیان کریں۔ اگر گورنمنٹ اور اس کے افسران
مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں اور ان کی حق تلفی کریں تو ہم کو زور شور سے
ان کی نکتہ چینی کرنی چاہئے۔ ایسے خیالات ہندو مسلمانوں کے دل میں

وقتاً فوقتاً جوش مارتے ہیں۔ تعلیم یافتہ آدمی اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ قومی
ہندو مسلمانوں کے حقوق ایک دوسرے کے مخالف نہیں اور آج کل
ضرورت اس بات کی ہے کہ دونوں آپس میں اتفاق کریں۔ مگر افسوس ہے
کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کا اعتبار کم کرتی ہیں۔ مسٹر راناڈے ہندو
جاتی کو تہ دل سے پیار کرتے تھے۔ مگر جو محبت ان کو اپنی قوم سے تھی اُسی کی

وجہ سے وہ صدق دل سے چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان آپس میں اتفاق
سے رہیں۔ اُن کو یقین تھا کہ ہندو مسلمانوں کی نااتفاقی غلط فہمی پر مبنی ہے
انگلستان میں رومن کیتھلک بادشاہوں نے سینکڑوں پراٹسٹنٹ لوگوں
کو زندہ آگ میں جلایا اور بعد میں جب پراٹسٹنٹ فرقہ کا زور ہوا تو اس نے
رومن کیتھلک فرقہ پر بڑی سختیاں کیں۔ مگر وہ زمانہ گذر گیا اور آج کل
دونوں فرقے شیر و شکر ہو کر اپنے ملک کی ترقی میں کوشاں ہیں۔ کیا یہ بات
ہندوستان میں ناممکن ہے۔ اس کو ممکن بلکہ غالب ثابت کرنے کے لئے مسٹر
راناڈے نے لکھنو کانفرنس میں اکبر بادشاہ کے زمانہ کی کہانی ہندو اور
مسلمانوں کو سنائی اور اس زمانہ سے موجودہ مشکلات کے واسطے ایسے ایسے
سبق اخذ کئے کہ سامعین کو قایل کر دیا۔ مسٹر راناڈے جانتے تھے کہ ہندو مسلمانوں
میں سخت رنجش ہے اور ان میں بجائے اتفاق کے نااتفاقی بڑھتی جاتی
ہے اور ہر ایک فریق دوسرے کو اس نااتفاقی کا باعث سمجھ کر اپنے آپ
کو بیگناہ اور مظلوم بیان کرتا ہے۔ اس نااتفاقی سے واقف ہو کر لیکچر انہوں
نے ایسے زمانہ کے متعلق دیا جس میں ہندو مسلمانوں کا بڑا اتفاق تھا۔ دوران تقریر
میں اُنہوں نے فرمایا کہ بہت سے ہندو صاحبان اس بات کو یقین کرتے ہیں

کہ مسلمانوں کے زمانہ میں ہندوؤں کی اخلاقی حالت نہایت خراب اور کمزور ہوگئی تھی اور اس زمانے کو ہندوؤں کے لیئے قومی بے عزتی اور مصیبت کا زمانہ سمجھنا چاہیئے۔ مسٹر رانادے نے فرمایا کہ ایسا خیال کرنے والے اشخاص اُن طاقتوں کا جو قوموں کے تنزل اور ترقی کا باعث ہوتی ہیں۔ ٹھیک اندازہ نہیں لگاتے۔ کسی شخص کو آسانی سے یہ فرض نہیں کرنا چاہیئے کہ پرماتما نے ہندوستان کے لوگوں کو کئی صدیوں تک مسلمانوں کے زیر حکومت رکھا اور اس حکومت سے ہندوؤں کو اُن معاملات میں جن میں وہ پہلے بہت کمزور تھے اخلاقی طاقت اور ترقی حاصل نہیں ہوئی۔ ایک بات تو ہم سب کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا پانچسو سال کے بعد خاتمہ ہوا۔ اور اس کی جگہ پنجاب۔ وسطی ہند اور دکن میں ایسی مضبوط ہندو ریاستیں قایم ہوئیں جو بمقابلہ اُن ہندوؤں کے جو پانچسو سال سے پیشتر مسلمانوں کے سامنے بھاگ گئے پھر اگر ستے تھے بدرجہا زیادہ طاقتور تھیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی حکومت سے ہندو قوم واقعی ایسی پست نہیں ہو گئی تھی کہ دوبارہ مضبوط ہو کر اپنا سر نہ اٹھا سکتی۔ اگر ہندو بادشاہ نے مضبوط اور لایق مسلمان قوموں کی حکومت کے اثر سے کچھ بھی فایدہ نہ اٹھاتے تو ان کے لیئے اپنی طاقت کا دوبارہ قایم کرنا مشکل ہوتا۔ ہندوؤں کا نیا زور اور مسلمانوں کا تنزل اٹھارویں صدی کے شروع میں کمال پر پہنچ گیا تھا مگر اس بڑی تبدیلی کے علاوہ اور امور میں بھی اٹھارویں صدی میں ہندوؤں کی ایسی ابتر حالت نہ تھی جیسی کہ مسلمان سیاحوں نے ۱۱۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک

دیکھی تھی۔ اکبر کے زمانہ میں ہندوؤں کی نئی طاقت کا نشوونما ہونے لگا
اُس وقت ہندو مسلمانوں میں غیر معمولی اتفاق تھا۔ اور وہ سب مل کر
ایک متحدہ بادشاہت کو جس میں دونوں کا نفع نقصان برابر تھا قایم کرنا
چاہتے تھے۔ اس وقت سے پیشتر مسلمان ہندوؤں کے مذہب اور
اُن کے رسم و رواج و طریقہ پرستش کو بڑی حقارت سے دیکھتے تھے۔
ویسے ہی مسلمانوں کو ہندو ملیکش سمجھتے تھے اور انہیں چھونے سے پرہیز
کرتے تھے۔ اکبر کے وقت میں جب دونوں قوموں کا اتفاق ہوا تو یہ
آپس کی نفرت دور ہو گئی۔ اکبر پہلا مسلمان بادشاہ تھا جس کو ہندوؤں کی
وفاداری۔ ایمانداری اور اچھائی کا پورا یقین ہو گیا اور جس نے اس بات
کا فیصلہ کیا کہ اگر انتظام بادشاہت میں مسلمانوں کے تعصب کو دخل دیا جائیگا
تو ہندو مسلمانوں کا اتفاق ناممکن ہوگا۔ اس نے شیخ مبارک۔ ابوالفضل
فیضی۔ میرزا عبدالرحیم۔ نظام الدین احمد بدایونی وغیرہ لایق شخصوں کو جمع
کرکے ان کو راماین۔ مہابھارت۔ اور دیگر سنسکرت کتابوں کا ترجمہ کرنیکا
حکم دیا۔ جودھپور اور جے پور کے شاہی خاندانوں کی لڑکیوں کا مغلیہ
شاہزادوں سے بیاہ کر کے اور راجپوت راجاؤں کو مغلیہ فوج میں بڑے
بڑے عہدے دے کر اس نے راجپوتوں کو اپنا دوست بنالیا۔ راجپوت
راجگان اب تک بادشاہ کے دشمنوں میں شمار ہوتے تھے۔ اکبر کے وقت
میں وہ سلطنت مغلیہ کے مددگار بن گئے۔ راجہ بھگوانداس۔ راجہ مان سنگھ
صوبہ دار بنگال اور کابل۔ راجہ ٹوڈرمل مشیر مال۔ اور راجہ بیربل کا بادشاہ
کی نظروں میں ایسا ہی وقار اور اعتبار تھا جیسا کہ مسلمان امرا کا تھا۔ کیونکہ دونوں

کے نفع اور نقصان میں کوئی تمیز نہ تھی۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہمارے انگریز حکام بھی اِن باتوں میں اکبر کی پیروی کریں۔ اور ہندوستانیوں کی بے قدری اور بے اعتباری کرنے کے بجائے ان کی لیاقت کو تسلیم کریں اور ان کو بڑے بڑے عہدے دے کر ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر کریں۔ دونوں قوموں کو متفق کرنے کی غرض سے اکبر نے دینِ الٰہی قایم کیا جس میں ہندو مسلمان اور دوسرے مذہبوں کی خوبیاں جمع کی گئیں۔ نامناسب ٹیکس اور خاص حقوق بند کئے گئے۔ اور تمام بادشاہت میں ہر ایک مذہب کے ساتھ بے تعصبی کے ساتھ سلوک ہونے لگا۔ مسلمانوں کی خاص رعایت نہ رہی چار موقعوں کے سوا بادشاہ نے گوشت کھانا چھوڑ دیا اور جو رسوم بادشاہ کی ہندو رانیاں ادا کرتی تھیں۔ ان میں بادشاہ بھی شامل ہوتا تھا۔ ہندوؤں میں ستی کا رواج قریبًا بند کیا گیا۔ بیوہ کی شادی جایز قرار دی گئی اور سن بلوغ سے پہلے کی شادی کی ممانعت کی گئی۔ ان کے سوا اور طریقوں سے بھی دونوں قوموں کو آپس میں ملانے کی کوشش ایسی کامیابی سے کی گئی کہ قریبًا سو سال آیندہ تک اس سے اچھے نتائج پیدا ہوتے رہے کیونکہ نااتفاقی کی باتوں کو دور کرنے کی کوشش۔ اکبر۔ جہانگیر۔ اور شاہجہان کے زمانہ میں بلا روک ٹوک جاری رہی۔ شاہجہاں کا بڑا بیٹا داراشکوہ اعلےٰ درجہ کا مصنف تھا۔ اس نے اُپنشدوں کا فارسی میں ترجمہ کیا اور ایک کتاب ایسی لکھی جس میں اس نے ہندو اور مسلمانوں کے مذہب کا اتفاق ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ۱۶۵۹ء میں مارا گیا۔ یہ سو برس کا زمانہ ۱۵۵۶-۱۶۵۹ء ہندوستان کی تاریخ میں بڑی رونق کا زمانہ

تھا جس میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بہت درجہ تک آپس کا اتفاق رہا۔ اگر بجائے
اورنگ زیب دارا شکوہ تخت نشین ہوتا تو جو طریق حکومت اکبر نے جاری کیا
تھا وہ زیادہ مضبوط ہو جاتا اور غالباً مغلیہ حکومت کا زوال بہت عرصہ
تک ملتوی رہتا۔ مگر خدا کو یہ بات منظور نہ تھی۔ اورنگ زیب کے تخت
نشین ہوتے ہی ایسا غلط طریق حکومت قایم ہوا جس کا زور اس بادشاہ
کی عمر دراز میں بڑھتا گیا۔ مگر اورنگ زیب کو بھی راجہ جے سنگھ اور جسونت سنگھ
کی مدد لینی پڑتی تھی۔ جب اورنگ زیب نے ہندوؤں پر جزیہ لگایا تو راجہ
جے سنگھ نے بادشاہ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا کہ جو خدا مسلمانوں کا
ہے وہی ہندوؤں کا خدا ہے اور ہندوؤں کے ساتھ وہی سلوک ہونا
چاہیئے جو بادشاہ مسلمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اورنگ زیب نے اس
نصیحت پر عمل نہ کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی زندگی میں ہی مغلیہ بادشاہت کے
ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ دکن میں مرہٹوں نے۔ شمال مغرب میں سکھوں
نے اور راجپوتانہ میں راجپوتوں نے اس زبردست بادشاہت کو ایسا کمزور
کر دیا کہ سوا حیدر آباد دکن۔ بنگالہ اور اودھ کے قریباً تمام ہندوستان میں
ہندوؤں کی حکومت دوبارہ قایم ہو گئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندو قوم
اُن بادشاہوں اور راجاؤں کی مدد سے جو دونوں قوموں کو ایک نظر سے
دیکھتے تھے۔ بجائے کمزور ہونے کے زیادہ مضبوط ہو گئی۔ اس طرح
مضبوط بننے کے علاوہ اور کئی طرح سے ہندوؤں نے مسلمانوں کی
حکومت سے فایدہ اٹھایا۔ اس وقت مسلمان بادشاہ بمقابلہ ہندو راجاؤں
کے آئین سلطنت سے بہتر واقف تھے۔ ان کی بدولت ہندوؤں نے بھی

واقفیت پیدا کر لی۔ مسلمانوں کے آنے سے پیشتر ہندوؤں کو لڑائی کا طریقہ اچھی طرح نہیں آتا تھا۔ مسلمانوں نے توپ خانہ اور بارود کا استعمال ہندوستان میں جاری کیا ان کی مثال سے موم بتی۔ کاغذ۔ شیشہ۔ زین اور گھروں کی آرایش کا سامان ہندوؤں میں استعمال ہونے لگا + انہوں نے گانا۔ علم موسیقی اور یونانی حکمت ہندوؤں کو سکھائی + علم تاریخ لٹریچر اور جغرافیہ کی واقفیت بھی اہل ہند کو اسی وقت ہوئی + مسلمانوں نے سڑکیں۔ نہریں۔ سرائیں۔ اور ڈاکخانے بنائے۔ عمارت کے نئے نمونے ملک میں جاری کئے۔ اور باغات لگانے کے قاعدوں سے اور طرح طرح کے پھل پھول کے علم سے لوگوں کو واقف بنا دیا۔ جو انتظام مالگذاری اکبر کے زمانہ میں ٹوڈرمل نے شروع کیا تھا اس کی پیروی اب تک کی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں دور دراز ملکوں کے ساتھ سمندر کے راستہ سے تجارت کی جاتی تھی جس سے اہل ہند کو معلوم ہو گیا کہ ہمارے ملک سے باہر بھی دنیا بستی ہے۔ ان سب معاملات میں سلطنت مغلیہ جو ہندو اور مسلمانوں کی مدد سے چل رہی تھی مقابلہ ان ہندو ریاستوں کے جو دسویں صدی سے پیشتر ہندوستان میں موجود تھیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ اور اس کی مثال سے ہندوؤں نے بھی ترقی کی۔ پالیٹکس کے میدان کے باہر دھرم کے معاملہ میں بھی دونوں قوموں نے آپس میں ملکر مستفل فایدہ اٹھایا ہے +

مسلمانوں نے ہندوؤں سے تصوف اور مسئلہ تناسخ سیکھ لیا۔ پیروں کی پرستش اور محرم کا طریق ماتم بھی ہندوؤں کی مثال سے مسلمانوں میں

رائج ہوا + ہندوؤں کا ذات پات کی تمیز - بت پرستی - بیشمار دیوی دیوتاؤں
کی پرستش اور ذاتی پاکیزگی کے متعلق مسلمانوں سے بڑا اختلاف تھا مسلمانوں
کی مثال سے ہندوستان کے مختلف حصوں میں یعنے گرونانک نے پنجاب
میں - چیتن دیو نے بنگال میں - سنت تکارام - ایک ناتھ اور نام دیو نے
مہاراشٹر میں اور کبیر پنتھ - دادو پنتھ - ست نامی - وغیرہ فرقوں نے بت پرستی
ذات پات کی تمیز اور دیوی دیوتاؤں کی پرستش اور ذاتی ناپاکی کی سخت
مخالفت کی اور اس بات کا پرچار کیا کہ پرماتما ایک ہے اور سب لوگ
اس کی نظروں میں برابر ہیں - چاہے کوئی شودر ہو چاہے کوئی برہمن ہو اس
پرچار سے ہندو قوم کے خیالات میں جو بہتری ہوئی اس کا آجکل ٹھیک
اندازہ لگانا بالکل مشکل ہے - موجودہ زمانہ کی برہمو سماج اور آریہ سماج
اسی کام کو چلا رہی ہیں جو گرونانک وغیرہ پہلے شروع کر گئے ہیں مسلمانوں
کے ظلم نے آخر زمانہ میں سکھوں کو مسلمانوں کا دشمن بنا دیا اور سکھوں میں
تکلیف اور سختی برداشت کرنے کی طاقت مسلمانوں سے بھی زیادہ پیدا
ہوگئی مگر اور باقی سب فرقے ایسے صلح کل تھے کہ وہ سب سے محبت
کرتے تھے اور کسی سے نفرت کرنا اُن کی طبیعت کے خلاف تھا -
دونوں قوموں کے اس میل سے مسلمانوں کا تعصب کم ہوگیا - ہندو
زیادہ پاک صاف ہو گئے اور دیوی دیوتاؤں کو چھوڑ کر ایک پرماتما کے
بھگت ہو گئے - اگر اورنگ زیب اپنے باپ دادا کے قاعدوں کو چھوڑ کر
ہندوؤں کے ساتھ بے انصافی کا طریقہ اختیار نہ کرتا تو دونوں قوموں
کا اتحاد کامل ہو جاتا - مگر اورنگ زیب کی وجہ سے یہ اتحاد ادھورا رہ گیا

اور رفتہ رفتہ دونوں قوموں میں ایسی کمزوریاں پیدا ہو گئیں جنکو رفع کرنیکے لیئے بہت عرصہ تک انگریزوں کے ماتحت دونوں کو تربیت حاصل کرنیکی ضرورت ہوئی - دونوں قوموں میں امن امان - قاعدے کی پابندی - میونی سپل آزادی اور پبلک کی خدمت کی خواہش کم ہے - دونوں میں کلوں کے استعمال کی لیاقت - علم اور علمی تحقیقات کی محبت - عورتوں کی عزت - مشکلات کو قابو کرنے کا ارادہ اور وہ ہمت جس کی مدد سے انسان طرح طرح کی تکلیفیں برداشت کر کے نئی نئی چیزیں دریافت کرتا ہے بالکل موجود نہیں - دونوں قوموں کی پرانی تہذیب اور تعلیم اس قسم کی نہ تھی کہ ہندوستان کے لوگوں میں مذکورہ بالا خوبیاں نشو و نما پاتیں - اور مغربی یورپ کے باشندوں کی برابر اُن کی لیاقت ہوتی - اس لیئے ضروری تھا کہ ہندو اور مسلمان دونوں مل کر انگریزوں سے تعلیم حاصل کریں اور اپنے نقصوں کو دور کریں - جو نتیجہ زاید از سو سال کی انگریزی تعلیم سے ہندوستان میں پیدا ہوا ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے ؞

موجودہ زمانہ کے لیئے سبق

پرانے زمانہ کے واقعات سے ہم کو یہ سبق سیکھنا چاہیئے کہ جب تک ہندو اور مسلمان آپس میں اتفاق نہ کریں گے اور ان لایق آدمیوں کی مثال کی پیروی نہ کریں گے جو اکبر کے زمانہ میں موجود تھے اور جن کی رائے پر یہ دور اندیش اور منصف مزاج بادشاہ چلتا تھا - اور جب تک وہ اورنگ زیب کی خطرناک غلطیوں سے بچنے کی کوشش نہ کریں گے - ہمارے عظیم الشان ملک کی ترقی

ناممکن ہے۔ اکبر کی یہ خواہش تھی کہ اپنے نفع نقصان کو ایک سمجھکر دونوں
قومیں مل کر کام کریں اور دونوں کے خیالات اور ارادے اس طرح متفق ہو
جائیں کہ چھوٹے چھوٹے اختلاف پر آپس میں جھگڑا نہ ہو اور سب اتفاق
سے رہیں۔ دین الٰہی کی تہ میں بھی یہی اصول تھا۔ آجکل اس بات کی کوشش
ہونی چاہئے کہ ہندو اور مسلمان اپنے نفع نقصان کو ایک سمجھیں۔ اپنے آپ
کو جدا جدا جماعتوں میں تقسیم نہ کریں اور گزشتہ زمانے میں مذہبی تعصب اور ذات
بات کی نفرت نے دونوں قوموں کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کو بھول جائیں۔
مجھے افسوس ہے کہ موجودہ زمانہ کی جد و جہد میں اور جاہ و حشمت حاصل کرنیکی
کوشش میں دونوں قوموں نے اس اصول کو مدنظر نہیں رکھا۔ بعض اوقات
یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ جو فایدہ اکبر اور اس کے بیٹے پوتے کے وقت میں ہندو
مسلمانوں کو آپس کے اتفاق سے حاصل ہوا تھا وہ ہماری نظروں سے غایب
ہوگیا ہے اور ہم اس اتفاق کی ضرورت کو محسوس نہیں کرتے۔ اس کانفرنس
کا یہ کام ہے کہ اس ضرورت کو لوگوں کے سامنے پیش کرے۔ جو جو خرابیاں
ہماری سوسائٹی میں اس وقت موجود ہیں وہ ہماری خود پیدا کی ہوئی ہیں۔ ان کا
دور کرنا بھی ہمارے اختیار میں ہے۔ جو طریقہ ان خرابیوں کی درستی کا اکبر
نے اختیار کیا تھا اس پر غور کرکے ہم کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اکبر نے
ہمارے ان اخلاقی نقصوں کا ٹھیک اندازہ لگایا تھا جن کا درست کرنا
ضروری ہے پیشتر اس کے کہ ہم بہت بڑے معاملات میں دخل دیں۔ آجکل
ہم کو اس بات کی ضرورت ہے کہ اونچے خیالات کی پیروی کریں۔ آپس میں
ہمدردی اور اتفاق سے برتاؤ کریں۔ دوسروں کے ساتھ تعصب سے

پیش نہ آویں اور جو نقص ہماری سوسائٹی میں موجود ہیں ان کو دور کرنے کی تجویزیں سوچیں۔ لوگوں میں یہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم دور دراز فاصلے طے کر کے اس جگہ اکٹھے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اپنے ارادے میں ثابت قدم رہیں تو یقین ہے کہ ہمارا مدعا ضرور حاصل ہو گا۔ ہمارا مدعا یہ نہیں کہ دولت اور رتبے میں ہمیں خاص فایدہ نصیب ہو۔ ہندو اور مسلمانوں کو جو کام کرنا چاہئے وہ سب پر روشن ہے۔ عورتوں کی جہالت۔ شراب خوری۔ ذاتوں اور مذہبوں کے جھگڑے۔ گندے خیالات اور اعمال۔ فحش بات چیت۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت اور بوڑھے مرد سے کم سن لڑکی کی شادی کرنے کا رواج۔ شادی غمی کے موقع پر فضول خرچی بیقاعدہ اور بیفایدہ خیرات۔ وقف شدہ جایداد کی بدانتظامی وغیرہ وغیرہ خرابیاں دونوں قوموں میں یکساں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کے دور کرنے میں دونوں قومیں ایک ہی طریقے سے کام کر سکتی ہیں +

چونکہ ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے اس لئے اُن کو مذکورہ بالا خرابیوں کے علاوہ اور دقتوں کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اور ان کی مختلف ذاتیں اپنی سُدھار میں جدا جدا مشغول ہیں مگر جب تک کہ سب ذاتیں مل کر کام نہیں کریں گی کامیابی حاصل ہونی مشکل ہے اور اس لئے کانفرنس کا اجلاس مختلف مقامات میں اس غرض سے ہوتا ہے کہ جدا جدا کام کرنے والوں کو بتلایا جائے کہ دوسرے آدمی ان کی طرح کیا کام کر رہے ہیں +

ہندوستان کی مالی حالت

ہندوستان کی مالی حالت پر مسٹر رانا دے نے بہت کچھ غور و فکر کی
تھی۔ جو رائیں انہوں نے اس مضمون پر قایم کی تھیں وہ انڈین ایکانومکس
نامی کتاب میں درج ہیں۔ اس مضمون کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے
کئی دفعہ لکچر دیئے۔ اور اخباروں میں آرٹیکل لکھے۔ یہ لکچر اور آرٹیکل اس
کتاب میں موجود ہیں۔ اور ان کے خیالات کو آئینہ کی طرح ظاہر کرتے ہیں۔
ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مسٹر رانا دے اعلےٰ درجہ کے محب قوم تھے اور
گورنمنٹ کی پالیسی پر بخوبی سے نکتہ چینی کرتے تھے۔ انڈسٹریل کانفرنس
کے متعلق انہوں نے جو آرٹیکل جنوری سنہ ۹۰ء میں سرب جنک سبھا کے
رسالہ میں لکھا اس کے شروع میں مفصلہ ذیل الفاظ درج ہیں "ہمارے
ملک کے پولیٹیکل اور جنگی سوالات کے بعد سب سے مشکل سوال جس پر سب
تعلیم یافتہ آدمی غور کر رہے ہیں انڈسٹریل ریفارم سے تعلق رکھتا ہے۔
یہ نظارہ بڑا دردناک ہے کہ گو ہمارے ملک میں قدرت کی فیاضی سے
ہر طرح کا سامان مثلاً لوہا۔ کوئلہ۔ چمڑا۔ اناج روئی وغیرہ اس قدر موجود ہے
کہ کسی ملک میں اس سے زیادہ نہیں اور گو خدا کی مہربانی سے ہمارے ملک
کے موجودہ حالات بوجہ امن امان۔ تعلیم ریل و تار ایسے ہیں کہ ہم کو مالی ترقی
کرنا آسان ہے مگر انگریزوں کے راج میں ہماری مالی حالت ایسی اچھی نہیں
جیسی کہ ہونی چاہئے۔ اور ہر روز بدتر ہوتی جاتی ہے۔ تمام ملک میں اتنا
گہرا اور روز افزوں افلاس ہے کہ تمام دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اگر

بارش اچھی ہوتی رہے توسوائے ملک بہار کے اور کسی حصہ ملک میں خاص تکلیف یا گرانی نہیں ہوتی۔ چونکہ اس بات کا یقین نہیں کہ بارش ہمیشہ اچھی ہوگی اور قحط بار بار ہوتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو سدا یہ ڈر رہتا ہے۔ کہ اگر بارش نہ ہوئی تو لاکھوں آدمی در بدر بھیک مانگتے پھریں گے۔"

کیا ہندوستان میں افلاس کی ترقی ہے

یہ سوال نہایت پیچیدہ ہے۔ کہ انگریزی حکومت میں ہندوستان غریب ہو رہا ہے یا امیر۔ اس میں کلام نہیں کہ ہماری حکمران قوم بڑی مہذب اور طاقتور ہے سائنس کی معلومات اس کے ہاتھوں میں ہیں۔ بیشمار روپیہ اس کے پاس ہے۔ ایسی قوم کے زیر سایہ ہندوستان کے لئے غریب ہونا ناممکن سمجھنا چاہیئے۔ مگر اس بات سے کس طرح انکار ہو سکتا ہے کہ لاکھ پتی امیروں اور بھوکے غریبوں کو ملا کر یہاں کے ہر ایک آدمی کی سالانہ آمدنی ۲۰ سے ۲۷ روپیہ تک ہے۔ قحط بار بار آتا ہے۔ اور ایک فصل کی خرابی سے ملک بھر میں کھرام مچ جاتا ہے۔ لوگ اپنے گھر چھوڑ کر بال بچوں سمیت در بدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ معمولی حالت میں بھی لوگ مشکل سے گذارہ کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قحط کے آتے ہی ان کے ہوش جاتے رہتے ہیں۔ بڑے شہروں کو چھوڑ کر باقی قصبات کی طرف دیکھئے آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت تھوڑے آدمی ایسے ہیں۔ جن کی ماہوار

آمدنی پچاس روپیہ ہے۔ پہلے زمانہ میں ریل نہ ہونے کی وجہ سے یہ بات تھی کہ جس حصہ ملک میں قحط ہوتا تھا وہاں باہر سے مدد بہ مشکل پہنچتی تھی مگر ساتھ ہی یہ بھی ہوتا تھا کہ باقی ملک میں ارزانی رہتی تھی۔ اور جن لوگوں کی آمدنی دس روپیہ ماہوار تھی وہ بھی عمدگی سے گذارہ کر سکتے تھے۔ آجکل ہر ایک حصہ ملک میں ریل کی وجہ سے سب چیزوں کا قریب قریب ایک ہی بھاؤ رہتا ہے۔ مگر ایسا کہ امیر سے امیر نالاں ہیں۔ پچاس یا سو روپیہ کی آمدنی والا اس زمانہ میں امیر نہیں کہلاتا نہ وہ اپنے آپ کو امیر سمجھتا ہے۔ کیونکہ ہر ایک چیز کی قیمت اس قدر زیادہ ہوگئی ہے کہ گھر کا معمولی خرچ چلانا بھی مشکل ہوگیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اب لوگوں کے ہاتھ میں روپیہ زیادہ ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہئے کہ لوگ زیادہ روپیہ کماتے ہیں مگر جو چیز پہلے ایک روپیہ کو آتی تھی وہ اب چار روپیہ کو ملتی ہے اس لئے زیادہ آمدنی لوگوں کی زیادہ دولت کی نشانی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مشترکہ خاندان کا سلسلہ سب کم ہو رہا ہے۔ ہر یک شخص اپنا اور اپنے بچوں کا گذارہ دقت سے کرتا ہے وہ اپنے بھائی بہنوں۔ بھانجوں بھتیجوں کا خرچ کس طرح برداشت کرے۔ اس لئے سب لوگ دوسروں کی مدد کرنے سے کنارہ کشی کرتے ہیں۔ اس اندرونی حالت کو انگریز یا تو بالکل نہیں جانتے یا جان بوجھ کر آنکھیں بند کرتے ہیں ورنہ ہماری اس بیکسی کی حالت کو دولت مندی لکھنا بالکل بے معنی ہے۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ گذشتہ زمانہ کے مقابلہ میں اب ہندوستانیوں کے ہاتھ میں روپیہ زیادہ ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اہل ہند دولت مندی کی چوٹی

پر پہنچ گئے - بمقابلہ اور قوموں کے ہم لوگ نہایت ہی غریب ہیں اور موجودہ حالات ایسے ہیں کہ جو روپیہ ہم کو ملنا چاہئے وہ ہم کو نہیں ملتا - اول تو ہندوستان میں تجارت کم ہے جو کچھ تجارت یہاں ہے وہ سب غیر ملک والوں کے ہاتھ میں ہے - چھوٹی چیز سے بڑی چیز تک جو ہمارے استعمال میں آتی ہے سب غیر ملکوں سے آتی ہے - کاغذ - قلم - دوات - گھڑی - کپڑا - عینک دھاگہ - سوئی - راجرس کا چاقو - کپڑا سینے کی کل - ٹوپیاں - دوائیاں - ڈاکٹری اوزار وغیرہ وغیرہ سب امریکہ اور یورپ کے کاریگروں کی ساخت ہیں - پہلے طرح طرح کا سامان ہندوستان میں بنتا تھا - ایسٹ انڈیا کمپنی کی مہربانی سے ہندوستان کی کاریگری سب نابود ہو گئی - اب انگریزی پڑھکر جو لوگوں کے دل میں امنگ اٹھی اور وہ بھی اپنی اپنی توفیق کے مطابق کپڑا وغیرہ بنانے کے کارخانے کھولنے لگے تو ہمارے گورنمنٹ مسئلہ فری ٹریڈ کی آڑ لیکر ہماری مدد سے گریز کرتی ہے - اور ہم کو شکست دینے کے لئے ہمارے مقابلے میں یورپ کے باعلم اور دولتمند سوداگروں اور کاریگروں کو کھڑا کرتی ہے - جس کا نتیجہ صاف یہ ہے کہ یورپ کے طاقتور سوداگر ہمارے ناتجربہ کار - غریب اور پست حوصلہ لوگوں پر فوقیت حاصل کر لیتے ہیں اور ہماری تجارت کو رونق نصیب نہیں ہوتی - کروڑہا روپیہ کا مال ہندوستان میں یورپ اور امریکہ سے آتا ہے - ہندوستانی لیڈر گورنمنٹ سے بار بار درخواست کرتے ہیں کہ آپ کو یہاں کے کارخانوں کی مدد کرنی چاہئے اور اس غرض سے کہ غیر ملکوں سے مال ہندوستان میں نہ آئے باہر کے مال پر ٹیکس لگانا چاہئے - کیونکہ اگر اس پر ٹیکس لگایا جائیگا

تو اسکی قیمت بڑھ جائے گی اور ہمارے لوگ اس کو آسانی سے نہ خرید
سکیں گے - مگر گورنمنٹ نے فری ٹریڈ کے مسئلہ کو خوب یاد کر رکھا ہے
اور وہ غیر ملکوں کے مال پر ٹیکس لگانے کو خلاف عقل اور خلاف اصول
تجارت بیان کرتی ہے - لوگوں کا خیال یہ ہے کہ فری ٹریڈ سے ولایت
کے سوداگروں کا نفع ہے - اور وہ کھلم کھلا اپنا مال ہندوستان میں بھیجتے
ہیں - اگر فری ٹریڈ کے مسئلہ کو گورنمنٹ چھوڑ دے تو ولایت کے سوداگروں
کا ضرور سخت نقصان ہو ♦

فری ٹریڈ ہندوستان کے لئے مضر ہے

مسٹر راناڈے نے ۱۸۹۲ء میں انڈین پولٹیکل اکانومی کے مضمون پر
لکچر دیا اور اس میں یورپ کے مصنفوں کی رائے سے ثابت کر دیا کہ موجودہ
حالت میں فری ٹریڈ کا مسئلہ ہندوستان کے لئے سخت نامناسب ہے
اور اس سے ہمارے ملک کو بہت نقصان پہنچا ہے - انہوں نے فرمایا کہ
پولٹیکل معاملات میں انگریزوں کی رائے ہے کہ جب تک اہل ہند اپنی
تعلیم و تربیت و دیگر حالات سے اپنی لیاقت ثابت نہ کریں ان کو اپنے حقوق
طلب نہیں کرنے چاہئیں جن کا استعمال ان کو معلوم نہ ہو - انگریز ہمیشہ کہتے
ہیں کہ اگر وہ حقوق جو اہل امریکہ یا اہل یورپ کو حاصل ہیں فوراً اہالیان ہند کو
دیدیئے جائیں تو ان سے بجائے فایدہ کے ملک کو نقصان پہنچنے کا خطرہ
ہے - پولٹیکل حقوق دینے کے لئے لوگوں کی حالت پر ضرور غور کرنا چاہئے
مگر افسوس ہے کہ جو انگریزی افسر پولٹیکل معاملات میں ہم کو یہ مشورہ دیتے

ہیں وہ اس رائے کو پولیٹیکل ایکانامی کے سوالات میں بالکل بھول جاتے ہیں۔ اگر اہل ہند قانون بنانے والی کونسلوں اور کمیٹیوں میں انتخاب کے لایق نہیں۔ اگر وہ اس قابل نہیں کہ ان کو وہ حقوق دئے جائیں جو ملٹن اور برک، مِل اور میکالے ہرایک انگریزی رعایا کو دینا چاہتے تھے تو کیا فری ٹریڈ کے مسلہ پر بلا تغیر و تبدل کے ہندوستان میں عمل کیا جا سکتا ہے۔ اگر پولیٹیکل اور سوشل معاملات میں وقت۔ جگہ۔ لوگوں کی لیاقت۔ ان کی عادات اور رواج۔ اور گذشتہ تاریخ پر غور کرنا ضروری ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ مالی معاملات میں کسی اصول پر ہر وقت ہر جگہ اور ہر طبقہ تہذیب میں ایک ہی طرح عمل کیا جائے۔ اگر پولیٹیکل ایکانومی کے اصول ایسے عالمگیر ہیں کہ ہر جگہ اور ہر وقت میں بلا کسی تبدیلی کے ان پر عمل ہو سکتا ہے تو کم سے کم کل مہذب ملکوں میں تو ان پر عمل ہونا چاہئیے۔ مگر سوائے انگلستان کے یورپ۔ امریکا اور انگریزی بستیوں میں ان کی پیروی بالکل نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ اگر وہ فری ٹریڈ قبول کریں تو ان کا بڑا نقصان ہو۔ جان سٹوارٹ مل کی رائے ہے کہ پولیٹیکل ایکانامی علم کی ایسی شاخ ہے کہ جس کی بنیاد پختہ اور مستقل نہیں اور اس کے اصولوں پر ہر ایک جگہ بلا تبدیلی عمل نہیں ہو سکتا۔ اگر اسکے اصول بلا کم و کاست امریکہ یورپ اور انگریزی بستیوں میں منظور نہیں کئے جاتے تو کیا ہندوستان میں جو تہذیب اور فارغ البالی میں آج کل اُن ملکوں سے بہت کم درجہ پر ہے اُن پر عمل کرنے سے فایدہ ہو سکتا ہے۔ اِس سوال کا جواب دینا مشکل نہیں۔

پولٹیکل اکانومی کے اصول اور ہماری حالت

اس علم کے اصول جن واقعات پر مبنی ہیں ان میں زیادہ ضروری مفصلہ ذیل ہیں:-

(۱) ہر ایک انسان اپنا نفع اچھی طرح سمجھتا ہے اور اس سمجھ کی مطابق عمل کرنے کی اس میں خواہش اور قابلیت ہے +

(۲) ہر ایک انسان دوسرے کے ساتھ معاہدہ کرنے میں آزاد اور دوسرے کے برابر ہے یعنی یوں کہو کہ فریقین معاہدہ میں سے دونوں آزاد اور ایک دوسرے کے برابر ہیں +

(۳) روپیہ اور مزدوری بے فائدہ کام کو چھوڑ کر مفید کام میں لگنے کے لئے تیار رہیں +

(۴) ملک کی آبادی ذریعہ معاش کے مقدار سے زیادہ بڑھتی جاتی ہے +

(۵) ہر چیز کی مانگ اور اس کا بہم پہونچانا آپس میں برابر ہوتے رہتے ہیں - یعنی ہر ایک چیز جس کی ضرورت ہو آسانی سے باہم پہونچائی جا سکتی ہے -

اگر یہ واقعات سوائے انگلنڈ کے امریکہ اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں موجود نہیں ہیں تو ہندوستان میں تو وہ ان سے بھی کم پائے جاتے ہیں - کیونکہ (۱) یہاں ہر ایک شخص کی حیثیت اس کی ذات اور خاندان کی حیثیت پر مبنی ہے - اس کی اپنی لیاقت پر کم مبنی ہے -

(۲) دولت کا پیدا کرنا یا اکٹھا کرنا یہاں زندگی کا اعلےٰ مقصد نہیں سمجھا جاتا (۳) ذات اور قدیمی پیشوں کی وجہ سے دنیاوی کاروبار میں ایک دوسرے کا مقابلہ بہت کم ہے۔ (۴) روپیہ اور مزدور ایسے کام کو جس میں نفع کم ہو چھوڑ کر دوسرے کام میں جس میں نفع زیادہ ہو آسانی سے مشغول نہیں ہوتے (۵) یہاں فریقین معاہدہ عقل تمیز اور آزادی میں ایک دوسرے کی برابر نہیں ہوتے مثلاً زمیندار اور ساہوکار کی عقل میں بڑا فرق ہوتا ہے (۶) قحط اور بیماریوں کی وجہ سے آبادی کم ہوتی جاتی ہے۔ اور ذریعہ معاش کی مقدار سے زیادہ نہیں ہوتی۔ (۷) اشیاء کا تیار کرنا یہاں ترقی پر نہیں۔

ہندوستان میں فری ٹریڈ کا نتیجہ

ان حالات میں پولیٹکل ایکانومی کے اصولوں پر ہندوستان میں کاربند ہونا مضر ہے۔ اور گورنمنٹ ہند نے ان پر عمل کر کے یہاں کی قدیمی صنعت اور حرفت برباد کر دی۔ اور ہزاروں آدمیوں کو بے روزگار بنا دیا۔ کیونکہ یہاں کے کاریگر جن کے اوزار پرانے فیشن کے ہیں۔ اور جن کا کپڑا بننے کا طریق دقیانوسی ہے۔ یورپ کے کاریگروں کا جن کے پاس نئی سے نئی کلیں اور سائینس کی ایجادیں موجود ہیں۔ کس طرح سے مقابلہ کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اپنا قدیمی کاروبار چھوڑنا پڑا اور وہ مزدوری پیشہ یا زراعت پیشہ ہو گئے۔

اس طرح رفتہ رفتہ سب صنعتیں اور پیشے معدوم ہو گئے اور جو موجود ہیں وہ خراب حالت میں ہیں - آجکل کلکتہ - بمبئی وغیرہ بڑے شہروں میں جو کارخانے چل رہے ہیں وہ ایسے ہی ہیں جیسے کہ ریگستان میں کوئی چھوٹی سی سبز جگہ ہوتی ہے - اُن سے آئندہ کے لئے امید ہوسکتی ہے مگر اس وقت لوگوں کا افلاس دور کرنے میں وہ نہایت ہی خفیف مدد دے سکتے ہیں - افسوس ہے کہ انگریز افسر ہندوستان کے افلاس کے قایل نہیں اُن کا خیال ہے کہ اس ملک میں زراعت اور تجارت کی ترقی ہے اور چونکہ ہم دوسرے ملکوں سے چاندی وغیرہ زیادہ منگاتے ہیں اس لئے ہمیں کوئی جائے شکایت نہیں - مسٹر راناڈے نے اپنے آرٹیکل موسومہ انڈسٹریل کانفرنس میں جو سربجنک سبھا کے رسالہ میں شائع ہوا تھا ثابت کیا ہے کہ مذکورہ بالا باتوں میں سے کوئی بھی ہماری ترقی کا نشان نہیں - وہ فرماتے ہیں کہ فری ٹریڈ اور فیشن کی تبدیلی کی بدولت اشیاء تیار کرنے والے قدیم کارخانے برباد ہو گئے اور لوگ ان کو چھوڑ کر زراعت میں لگ گئے - زراعت موجودہ حالات میں کم نفع دیتی ہے اول تو وہ برسات پر منحصر ہے جو کبھی اچھی ہوتی ہے کبھی خراب - دوسرے جوں جوں کسی زمین میں زیادہ ہل چلایا جاتا ہے - اس کی پیداوار کم ہوتی جاتی ہے - مگر ہمارے ملک میں زمین بلا کاشت کبھی چھوڑی نہیں جاتی ساتھ ہی لوگوں میں اتنی لیاقت نہیں کہ زراعت سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے طریقے اختیار کریں +

تجارت کے متعلق اصل حال یہ ہے کہ ہم بمقابلہ اُن چیزوں کے جو

باہر سے ہمارے ملک میں آتی ہیں قریباً دو چند چیزیں غیر ملکوں کو بھیجے ہیں۔ مثل ۹۳-۱۹۹۲ سنہ میں جبکہ مسٹر رانا دے اپنی رائے ظاہر کر رہے تھے ۱۰۱ کروڑ روپیہ کی چیزیں ہندوستان سے باہر گئیں اور ۶۲ کروڑ کی چیزیں ملک میں باہر سے آئیں علاوہ اس کے بڑی دقت کی بات یہ ہے کہ تیس کروڑ روپیہ اس ملک سے انگلستان کو مختلف سرکاری خرچ کی بابت جاتا ہے۔ انگریزوں کی رائے ہے کہ ہندوستان کی عمدہ حکومت کے بدلہ میں اس قدر روپیہ کا ولایت بھیجا جانا کوئی بڑی قربانی نہیں مسٹر رانا دے کے خیال میں یہ رائے درست نہیں کیونکہ ہندوستان کی حکومت تھوڑے خرچ سے بھی ہو سکتی ہے۔ اور جو لڑائیاں سرحدی قوموں کو فتح کرنے کے لئے برپا کی جاتی ہیں بالکل غیر ضروری ہیں علاوہ ازیں اگر اہل ہند کو بڑے بڑے عہدے دئے جائیں تو خرچ کم ہو اور انتظام میں کوئی فرق نہ آئے +

غیر ملکوں سے سونا بہت تھوڑا آتا ہے۔ جس قدر چاندی آتی ہے وہ قریباً ساری کی ساری سرکاری ٹکسال میں خرچ ہوتی ہے۔ اور اس سے روپیہ بنایا جاتا ہے۔ تجارت کے کام میں وہ چاندی بالکل استعمال نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں چاندی بذات خود دولت نہیں بلکہ دولت کا ایک پیمانہ ہے۔ اس کا یہی فائدہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے اشیا کا تبادلہ ہو۔ اس لئے چاندی سے فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جبکہ وہ تجارت میں استعمال ہو مگر آج کل یہ حالت نہیں ہے۔

جو کارخانے یورپین لوگوں نے یہاں جاری کئے ہیں۔ ان سے ہندوستان کی دولت زیادہ نہیں ہوئی۔ ان کارخانوں میں ہندوستانی مزدور ضرور نوکر ہوتے ہیں۔ مگر ان کا نفع ملک سے باہر جاتا ہے۔ ان کارخانوں سے یہ اور نقصان ہے۔ کہ ہندوستانیوں کے کارخانوں کو علاوہ ولایت کے کارخانوں کے ان کا بھی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

ان حالات میں گورنمنٹ کی طرف سے ہندوستان میں فری ٹریڈ پر عمل کرنا خلاف انصاف ہے۔ کیونکہ ان دقتوں کو جو ترقی یافتہ قومیں کم ترقی کرنیوالی قوموں کے راستہ میں ڈالتی ہیں دور کرنے کے لئے آخر الذکر قوموں کی تجارت کی حفاظت ضروری ہے

ہندوستان کے لوگوں کی پست ہمتی

ہندوستان میں اشیا بکثرت پیدا ہوتی ہیں۔ مزدور بمقابلہ مہذب ملکوں کے یہاں زیادہ اور سستے ملتے ہیں۔

مگر چونکہ وہ ناخواندہ اور بے تربیت ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ثابت قدم کفایت شعار اور اچھا کام کرنیوالے نہیں ہوتے۔ ان کی غربت بے ہمتی اور ترقی نہ کرنیوالی عادتیں ایسی ہیں کہ ان کے پاس اس قدر روپیہ نہیں بچتا۔ کہ وہ کارخانے جاری کریں۔ یہاں کے لوگ تھوڑی تھوڑی زمین کی کھیتی میں۔ تھوڑا سودا فروخت کرنے میں۔ اور روپیہ قرض لیکر چھوٹی چھوٹی تجارت کرنے میں مشغول ہیں۔ متوسط

درجہ کے لوگ روپیہ بچانے کی خواہش نہیں رکھتے - ان کے مذہب و رواج نے ان کو تھوڑی آمدنی پر صبر سے گذارہ کرنا سکھا رکھا ہے اور دولت اکٹھا کرنے کی خواہش نابود کردی ہے - ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگ غریب ہیں - ترقی نہیں کرتے اور مالی طور سے خراب حالت میں رہتے ہیں +

گورمنٹ کا کیا فرض ہے

مسٹر رانا ڈے کی رائے میں اس اندھیرے کو دور کرنے والی روشنی انگریزی راج ہے - ان کا یقین تھا کہ یہ روشنی اس اندھیرے کو ضرور دور کرے گی - ہماری مردہ تہذیب میں تازہ روح پھونکے گی اور ہم کو ترقی یافتہ قوموں میں نیک نام کرے گی بشرطیکہ انگریز ہندوستانیوں سے انصافانہ برتاؤ کریں - ہمارے فایدہ پر ولایت کے سوداگروں کے فایدہ کو ترجیح نہ دیں - اور ہم کو تعلیم اور حفاظت جان و مال دے کر چپ نہ ہو جائیں بلکہ ہندوستان کی صنعت و حرفت کو بھی ترقی دیں اور یہاں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں ان کی مدد کرکے ہماری مالی حالت کو بہتر بنائیں +

ہندوستان کی مالی ترقی کس طرح ہو سکتی ہے

اس کے بعد یہ بڑا سوال ہے کہ ملک کی ترقی کے لئے اہل ہند کو کیا کیا کام کرنا چاہئے - پرانی پولیٹیکل ایکانومی والوں کی یہ رائے تھی کہ گرم ملکوں کا یہ کام ہے کہ وہ اشیا کو پیدا کریں اور معتدل آب ہوا والے ملکوں کا یہ کام ہے کہ ان اشیا کو درست کرکے ان کو عمدہ حالت میں تبدیل کریں

ہوتے تھے اس کو بڑی مدد دی۔ خاندانی لوگ اس وقت سیواجی کے بڑے
مخالف تھے مگر اس نے اور اس کے دوستوں نے اِن خاندانی بے ایمانوں
کے ساتھ ایسا سخت سلوک کیا کہ ان کی مخالفت کا نام باقی نہ چھوڑا۔ رفتہ رفتہ
اعلےٰ رتبہ کے لوگ بھی سیواجی کے مددگار بن گئے اور اُن میں سے کئی ایک نے سیواجی
کی زندگی کے آخر زمانہ میں بڑا کام کیا۔ اور اُس کے منصوبوں کو کامیاب کرنے
میں بڑی کوشش کی۔ ان سرداروں کی بہادری اور دانائی سے سیواجی نے
اپنی ہند و بادشاہت مسلمانوں کے مقابلہ میں قایم کی۔ مصیبت اور تکلیف
کے وقت میں اُن میں سے کسی نے اپنے فرض منصبی سے کبھی مونہہ نہ موڑا
کسی نے اپنے آقا سے بے ایمانی نہیں کی نہ اس کے دشمن سے موافقت
کی۔ بلکہ کئی ایک نے اپنی جان دے کر اُس کے لئے فتح حاصل کی۔ ان
واقعات سے ہماری نظروں میں اُن کا رتبہ بڑا بلند ہوتا ہے اور یہ بھی
ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو سیواجی سے اور اس کے خیالات سے بڑی ہمدردی
تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ ان بہادروں کے اٹل ارادوں کے مقابلہ میں کوئی
مخالفت ٹھیر سکتی۔ ان کی لاثانی ہمت نے مرہٹہ قوم کے حوصلہ کو دس گنا
بڑھا دیا اور اس کو اس بات کا یقین دلا دیا کہ مرہٹہ لوگ مسلمانوں کو اچھی
طرح سے شکست دے سکتے ہیں۔ جو علاقہ اور خزانہ سیواجی نے اپنی زندگی
میں حاصل کیا تھا۔ وہ اس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد کے کمزور ہاتھوں
سے نکل گیا مگر مرہٹہ قوم میں جو ہمت اور استقلال اس نے پھونک دیا تھا
وہ بدستور قایم رہا اور جوں جوں مرہٹوں کے دشمنوں کا زور بڑھتا گیا اُن کا
اپنا حوصلہ بھی بلند ہوتا گیا۔ یہ اخلاقی فتح تھی جو مہاراشٹر میں سیواجی نے حاصل کی تھی

پانچویں فصل

درخت میں پتے نکلتے ہیں

اس فصل کا یہ نام بالکل درست ہے کیونکہ پہلی فصلوں میں زمین تیار ہونے اور اس میں بیج بونے کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس فصل میں سیواجی کی فتوحات۔ اس کی حکومت کا قایم ہونا اور اس کی بادشاہت کا انتظام مفصل بیان کیا گیا ہے۔ اس نے ۱۶۴۶ء میں جب کی اس کی عمر ۱۹ سال کی تھی قلعہ ٹورنا کو فتح کیا اور ۳۴ سال کے بعد ۱۶۸۰ء میں وہ مرگیا۔ ان ۳۴ سالوں کو مسٹر رانادے نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ چھ سال کا تھا جس میں اس نے پونا کے اردگرد کے ماول لوگوں اور پہاڑی قلعوں کو اپنے قابو میں کیا۔ یہ کام ریاست بیجاپور اور مغلوں کے ساتھ لڑائی کرنے کے لئے نہایت ضروری تھا۔ دوسرا حصہ دس سال کا تھا یعنے ۱۶۵۲ء سے ۱۶۶۲ء تک۔ اس عرصہ میں وہ ریاست بیجاپور سے لڑتا رہا۔ اور آخرکار ایسا مضبوط اور کامیاب ہوا کہ اس نے علاقہ بیجاپور کے ایک حصہ پر اپنا قبضہ کر لیا اور جو شرایط صلح کی اس نے پیش کیں وہ شاہ بیجاپور کو منظور کرنی پڑیں۔ بیجاپور کے سپہ سالار افضل خان کی کہانی سب کو معلوم ہے۔ افضل خاں سیواجی کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا تھا۔ اس نے بیجاپور کے دربار میں کھلم کھلا کہا تھا کہ میں اس پہاڑی چوہے کو زندہ یا مردہ ضرور گرفتار کرونگا۔ سیواجی کے طرفداروں میں یہ بات مشہور تھی

کہ افضل خاں نے سیواجی کے بڑے بھائی کو قتل کرایا ہے اور کرناٹک میں اس کے باپ کے دشمنوں کی مدد کی ہے۔ اس لئے طرفین میں سخت دشمنی تھی۔ افضل خاں نے اس مہم میں مقام وائی کو جاتے ہوئے تلجاپور اور پنڈھارپور کے مندروں کی بے عزتی کی اور ان کے بتوں کو توڑ ڈالا۔ اس عمل نے اس لڑائی کو مذہبی جنگ بنا دیا۔ سیواجی کو معلوم تھا کہ اگر اس دفعہ شکست کھائی تو زندگی محال ہے۔ اس لئے اس نے افضل خاں کے مقابلہ کے لئے بڑی تیاریاں کیں اور آخر کار اس کو قتل کر کے اس کی فوج کو پسپا کر دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ سیواجی نے افضل خاں کو دغا سے قتل کیا۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں فتح حاصل کرنے کے لئے دغا کرنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں سیواجی کو اپنے حریف کی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا۔ اسے بھی یقین تھا کہ افضل خاں دغا کرے گا۔ اس لئے جب وہ اس سے ملاقات کرنے گیا تو اپنی تلوار جس کا نام بھوانی تھا اپنے کپڑوں میں چھپا کر لے گیا۔ اور جب افضل خاں نے اس کو گردن سے پکڑ کر اپنی بغل میں دبا لیا تو اس نے اپنے آپ کو بچا کر افضل خاں ہی کو قتل کر دیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس وقت افضل خاں کا کچھ قصور نہ تھا اور سیواجی نے دھوکہ سے اس کو قتل کر دیا۔ مگر جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس زمانہ میں دشمن کو شکست دینے کے لئے دغا کرنا روا سمجھا جاتا تھا اور نگ زیب نے عہد و پیمان لیکر سیواجی اور اس کے بیٹے سمبھاجی کو اپنے مہمانوں کی طرح دلی میں بلایا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچ گئے تو اس نے انکو قید کر لیا۔ اس زمانہ کا کیا ذکر ہے۔ اس قسم کی بے ایمانی

آج کل کی مہذب قومیں بھی لڑائی کے موقعہ پر اور بلا لڑائی کے کمزور لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں +

چھٹی فصل

درخت پھل لاتا ہے

اس فصل میں سیواجی کی زندگی کے تیسرے اور چوتھے حصہ کا ذکر ہے۔ ریاست بیجاپور پر غالب ہونے کے بعد اس نے سلطنت مغلیہ سے لڑائی کی۔ اس کی زندگی کا تیسرا حصہ جو ۱۶۶۲ء سے شروع ہو کر ۱۶۷۲ء میں ختم ہوا اس لڑائی میں گزرا۔ یہ جنگ بڑا مشکل تھا کیونکہ بمقابلہ ریاست بیجاپور کے بادشاہ دلی کی فوجیں تعداد میں بہت زیادہ اور بہتر تربیت یافتہ تھیں ان کے ہتھیار اور سپہ سالار بھی اعلےٰ درجہ کے تھے۔ اس لڑائی میں سیواجی نے بڑے بڑے کار نمایاں کئے اور مرہٹوں کی بہادری تمام ملک میں مشہور ہو گئی۔ اول ہی اول اس نے مغلوں کے جرنیل شایستہ خاں کو پونا میں شکست دی اور پھر انگریزوں کی بستی کو سورت میں جا لوٹا۔ مگر ۱۶۶۵ء میں جب اورنگ زیب نے اپنی فوج راجہ جے سنگھ کے ماتحت اس کے مقابلہ کو بھیجی تو سیواجی نے مصلحتاً راجہ جے سنگھ سے صلح کر لی۔ اور شرائط صلح کے مطابق اس نے چند قلعے اورنگ زیب کو دیدیئے اور آپ اسکی فوج میں جرنیل ہونا منظور کر لیا۔ بعد میں وہ اپنے بیٹے سمبھاجی کو لے کر

بادشاہ سے ملنے کے لئے دلی گیا مگر باوجود اس بات کے کہ بادشاہ نے اُن کو حفاظت اور عزت کے ساتھ رکھنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ وہ دلی میں قید کئے گئے۔ سیواجی کا حوصلہ کبھی پست نہ ہوتا تھا وہ چند سپاہیوں کی مدد سے دلی سے بھاگ گیا اور آزاد ہوتے ہی اس نے علاقہ مغلیہ پر مار دھاڑ شروع کر دی اور جو قلعے اس نے راجہ جے سنگھ کی معرفت اورنگ زیب کو دیدیئے تھے وہ پھر فتح کر لئے۔ اب راجہ جسونت والی جودھپور کے ماتحت مغلوں کی فوج سیواجی کو شکست دینے کے لئے روانہ ہوئی۔ اس دفعہ اورنگ زیب کا ایک بیٹا بھی فوج کے ساتھ تھا مگر تھوڑے ہی عرصہ میں مغلیہ فوج نے سیواجی سے صلح کر لی۔ سیواجی کو مرہٹوں کا راجہ تسلیم کیا۔ اس کی جدی جاگیر علاقہ پونا۔ سوپا اور چکان میں اس کو واپس دی گئی۔ بجائے علاقہ احمد نگر اور جونار کے اس کو ریاست برار میں جاگیر عطا ہوئی اور اسکے بیٹے کو مغلیہ فوج میں پانچ ہزاری کا منصب دیا گیا۔ یہ ذکر ۱۶۶۷ء کا ہے اس وقت اورنگ زیب ریاست بیجاپور کے ساتھ لڑائی میں مشغول تھا اور سیواجی سے اس نے یہ صلح اس غرض سے کی تھی کہ وہ بیجاپور کو مدد نہ دے۔ جب مغلوں نے بیجاپور کو فتح کر لیا تو اورنگ زیب سیواجی کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے پھر ایک بڑی فوج اس کو مغلوب کرنے کے لئے روانہ کی۔ اور اپنے بیٹے کو جو دکن کا وائسرائے تھا یہ حکم دیا کہ اگر سیواجی کو گرفتار نہ کیا گیا تو سخت ناراضی کا باعث ہوگا۔ سیواجی ان باتوں سے کب گھبراتا تھا۔ اس کے سرداروں نے یہ فیصلہ کیا کہ سنگھ گڑھ کے قلعہ کو فتح کرنا اپنی حفاظت کے لئے ضروری ہے۔ بہادر تاناجی مالوسرے

اپنے تین سو ماولوں کو لیکر آدھی رات کے وقت قلعہ کی دیواروں پر چڑھ کر قلعہ میں داخل ہوگیا۔ لیکن اندر کی فوج نے اس کو قتل کر دیا مگر جو کام اُسنے اپنا خون بہا کر شروع کیا تھا اس کو اس کے بھائی سوریاجی نے بڑی بہادری سے ختم کیا۔ اور قلعہ کو فتح کر لیا۔ پوراندر۔ مہولی۔ کرنالا۔ لوہاگڈھ اور رجنار بھی اسی طرح مرہٹوں نے فتح کر لئے۔ سیواجی نے خود مغلیہ علاقہ سورت کو دوبارہ لوٹا اور مغلیہ فوج کو شکست فاش دی۔ اُس کے بہادر سردار پرتاب راو گورنر نے صوبہ خاندیش اور برار میں اس کے نام سے چوتھ اور سردیش مکھی ٹیکس جو بادشاہ کا حق تھا وصول کیا۔ اس کے جرنیلوں نے بھی مغلوں کو کئی جگہ شکست دی اور کئی قلعے فتح کئے۔ اس طرح سیواجی کی فوج شمال میں سورت تک۔ جنوب میں ممبئی اور بیدنور تک۔ جنوب مغرب میں کاروار تک۔ اور مشرق میں بیجاپور۔ برار اور گولکنڈہ تک قابض ہوگئی۔ اور مغلوں سے ان کا کچھ بھی مقابلہ نہ ہو سکا۔ اب سیواجی کے سرداروں کو اس بات کا خیال ہوا کہ اس کو دھوم دھام سے گدی پر بٹھایا جائے۔ آخرکار ۱۶۷۴ء میں رائے گڈھ کے قلعے میں ہندو شاستروں کے قاعدے کے مطابق سیواجی راجہ بنایا گیا۔

۱۶۷۴ء سے ۱۶۸۰ء تک اس کی پبلک زندگی کا آخری حصہ تھا اس عرصہ میں مغلیہ فوجیں کسی اور کام میں مصروف تھیں اور سیواجی کو اب اس بات کی فرصت ملی کہ اپنی سلطنت کو مضبوط کرے۔ اور انتظام حکومت میں اصلاح کرے۔ گو ان دنوں میں اس کا مغلوں سے اپنا کوئی خاص جھگڑا نہ تھا مگر ریاست بیجاپور اور گولکنڈہ کی درخواست پر اس نے مغلوں کے

مقابلے کے لیئے اُن ریاستوں کی مدد پر اپنی فوج بھیجی اور کچھ عرصہ تک ان کو بربادی سے بچائے رکھا +

اس کے بعد سیواجی نے صوبہ کرناٹک پر چڑھائی کی اور گولکنڈہ کی فوج اس کی مدد کے لیئے اس مہم پر گئی۔ اس لڑائی میں سیواجی بذات خود شریک تھا اور یورش کرتا ہوا تنجور تک (جو اب مدراس احاطہ میں واقع ہے) جا پہنچا۔ اس نے مقام ویلور کو فتح کیا اور قلعہ جنجی کو مضبوط بنایا۔ میسور کے علاقہ میں سے تمام سڑک پر جنگی چوکیاں بٹھا دیں۔ اس کا منشا یہ تھا کہ دکن میں ایک مضبوط ہندو سلطنت قایم کرے اور گولگنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں سے اتفاق کر کے مغلوں کو دریائے تاپتی کے جنوب میں نہ آنے دے یہ ارادہ اس کے دل میں ہی تھا کہ موت کا پیام آ پہنچا اور ۱۶۸۰ء میں چند دن بیمار رہکر ۵۳ سال کی عمر میں سیواجی اس جہان سے کوچ کر گیا۔ اس کی کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگ سکتا ہے کہ ۱۶۵۴ء میں صرف چاکن اور دریائے نیرا کے درمیان کا علاقہ اس کے ماتحت تھا۔ مگر ۱۶۸۰ء میں دریائے تاپتی سے کاویری تک اس کے نام کا ڈنکہ بجتا تھا اور ہندو اور مسلمان رئیس اس کی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ قریباً اس کی ساری عمر جد و جہد میں گذری اور جب وہ وقت ایا کہ آرام سے اپنی رعایا کی بہبودی کے لیئے عمدہ تجویزیں سوچتا۔ ظالم موت نے آدبایا۔ اور مرہٹہ قوم اور اس کے سردار جنہوں نے دشمنوں کے ساتھ جان توڑ توڑ کر لڑائیاں لڑی تھیں اپنے بہادر راجہ کی بیوقت موت پر ہاتھ ملتے رہگئے

ساتویں فصل میں مسٹر راناڈے نے سیواجی کے انتظام سلطنت

کا ذکر کیا ہے۔ اس انتظام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف فوجی افسر ہی نہ تھا بلکہ بڑا بیدار مغز اور عقلمند حاکم تھا۔ جس نے اپنے ملک۔ رعایا اور وقت کے حسب حال نہایت مناسب طریقہ حکومت جاری کیا۔ جب تک مرہٹہ حاکم اس طریقہ پر چلتے رہے ان کا بول بالا رہا۔ جونہیں انہوں نے اس کی پیروی چھوڑ دی مرہٹوں کی طاقت کمزور ہوگئی۔ وہ طریق انتظام اس غرض سے قایم کیا گیا تھا کہ مرہٹے لوگ غیروں کی حکومت سے آزاد رہیں اور اپنی حفاظت اور دوسروں پر حملہ کرنے کے واسطے آپس میں متفق ہو کر ایک قوم بنے رہیں۔ سیواجی کا یہ مطلب نہ تھا کہ تمام ملک میں اپنی حکومت پھیلائے۔ مغلوں کے علاقہ میں وہ صرف چوتھ اور سردیش مکھی کا ٹیکس وصول کرنا کافی سمجھتا تھا۔ ریاست گولکنڈہ۔ بیدنور اور بیجاپور سے آخر میں اس کا تعلق دوستانہ ہوگیا تھا۔ دراوڑ دیش میں اس کا بھائی وینکوجی اپنے باپ کی جاگیر پر تنہا قابض تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی طاقت کو زیادہ پھیلا کر کمزور کرنا نہیں چاہتا تھا۔

تقسیم اور انتظام علاقہ

خاص اپنے علاقہ کو جس کے شمال میں ناسک۔ جنوب میں میسور۔ مشرق میں احاطہ مدراس اور مغرب میں بحر ہند تھا اس نے چند پرانت یعنے ضلعوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر ایک ضلع کا بڑا افسر صوبہ دار کہلاتا تھا۔ جس کو قریباً سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ صوبہ دار دیوانی اور مال کا کام کرتا تھا۔ ہر ایک ضلع میں دو یا تین تعلقہ یا محل ہوتے تھے جن کے افسر کو محلکاری کہتے تھے

اس کی تنخواہ صوبہ دار سے کم ہوتی تھی۔ سب سے چھوٹا افسر کام وسیاار تھا۔

اشٹ پردھان کونسل

یہ سب افسر (۱) پنت اماتیا (وزیر مال) اور (۲) پنت سچیوا (وزیر خرچ یا اکونٹنٹ جنرل) کے ماتحت تھے۔ دیہات کا حساب ان کے پاس با قاعدہ بھیجا جاتا تھا اور وہ ان کی پڑتال کرتے تھے۔ یہ دونوں وزیر اشٹ پردھان کونسل کے ممبر تھے ان کے علاوہ۔ (۳) پیشوا یعنے وزیر اعظم۔ (۴) سیناپتی (کمانڈر انچیف) (۵) سمنت (فارن سکریٹری یا وزیر صیغہ خارجیہ) (۶) منتری (پرائیویٹ سکریٹری) (۷) پنڈت راو جس کے سپرد دھرم کا انتظام تھا) اور (۸) نیادھیش یعنے عدالتوں کا افسر بھی کونسل مذکور کے ممبر تھے ان سب کے ماتحت اپنا اپنا صیغہ تھا اور ان کے متعلقہ معاملات پر راجہ ہمیشہ ان سے مشورہ کرتا تھا۔ مسٹر راناڈے کی رائے میں یہ کونسل قریب قریب گورنر جنرل ہند کی کونسل کے مشابہ تھی۔ پنڈت راو اور نیادھیش کے سوا اور باقی ممبروں کو لڑائی کے دنوں میں فوجوں کا افسر بھی بنایا جاتا تھا۔ یہ عہدے پشتینی نہ تھے۔ بلکہ حسب ضرورت ان کے لئے لائق آدمی منتخب کئے جاتے تھے سیواجی میں یہ لیاقت تھی کہ اس نے اس کونسل کے ممبروں کے زور کو اعتدال سے بڑھنے نہ دیا۔ ہر ایک ممبر اپنا اپنا کام اس کے ڈر سے اچھی طرح کرتا تھا۔ سیواجی کے مرنے کے بعد پیشوا کا عہدہ پشتینی بن گیا دوسرے ممبران کونسل کی نالائقی سے ان کا زور کم ہو گیا اور رفتہ رفتہ کونسل درہم برہم ہو گئی +

پہاڑی قلعے

سیواجی کے قبضہ میں قریباً ۲۸۰ پہاڑی قلعے تھے۔ مرہٹہ۔ پربھو اور برہمن فرقوں میں سے ان قلعوں کے افسر مقرر ہوتے تھے تاکہ وہ سب خوش رہیں اور ایک دوسرے کی طاقت کو حد مناسب سے بڑھنے نہ دیں ہر ایک قلعہ کا فوجی افسر مرہٹہ ہوتا تھا۔ اس کو حولدار کہتے تھے۔ دیوانی اور مال کا کام برہمن کے سپرد تھا۔ وہ صوبہ دار کہلاتا تھا۔ اور فوجی اسباب اور اناج وغیرہ کا انتظام ایسے شخص کے ہاتھ میں ہوتا تھا جو ذات کا پربھو ہو۔ اس عہدہ دار کو کارخانیس کہتے تھے۔

فوج کا انتظام بھی سیواجی نے بہت عمدہ کیا تھا۔ سپاہیوں اور افسروں کو مقررہ تنخواہ ملتی تھی۔ مگر سال میں آٹھ مہینہ بھر جبکہ وہ لڑائی پر رہتے تھے مغلیہ علاقوں سے چوتھ اور سردیش مکھی ٹیکس وصول کر کے اپنا گذارہ کرتے تھے۔ کسی افسر کو خدمات کے بدلے جاگیر نہیں دے جاتی تھی۔ جاگیریں مندروں اور پاٹ شالاؤں کو دے جاتی تھیں تاکہ پڑھنے والا اور پڑھانے والا دونوں آرام سے گذارہ کریں۔ اس ذریعہ سے تعلیم کی بڑی ترقی ہوئی۔

انتظام ملکی کی خصوصیتیں

سیواجی کے انتظام ملکی میں مفصلہ ذیل خاص باتیں تھیں:-

(۱) پہاڑی قلعوں کو نہایت ضروری سمجھا جاتا تھا۔

(۲) کوئی عہدہ پشتینی نہ تھا یعنی لایق باپ کی جگہ نالایق بیٹے کو کبھی مقرر نہیں کیا جاتا تھا

(۳) کسی افسر کو سرکاری خدمات کے بدلے کوئی حصہ ملک جاگیر میں نہیں دیا جاتا تھا +

(۴) زمین کا معاملہ زمینداروں یعنے نمبرداروں کی معرفت وصول نہیں ہوتا تھا - بلکہ سرکاری افسر خود وصول کرتے تھے +

(۵) معاملہ وصول کرنے کے لئے کوئی حصہ ملک ٹھیکہ پہ نہیں دیا جاتا تھا - سرکاری افسر خود معاملہ وصول کرتے تھے +

(۶) ملک کا انتظام آٹھ وزیروں کی کونسل کے سپرد تھا جس میں ہر ایک وزیر اپنے صیغہ کی بابت راجہ کو جواب دہی کا ذمہ وار تھا +

(۷) جنگی محکمہ سول محکمہ کے ماتحت تھا +

(۸) ریاست کے چھوٹے بڑے عہدوں پہ مرہٹوں - برہمنوں اور پربھو ذات کے لوگوں کو مقرر کیا جاتا تھا تاکہ ان میں سے کوئی فرقہ ناراض نہ ہو یا خود سر نہ ہو جائے +

اس میں شک نہیں کہ جب تک مرہٹوں کی حکومت مہاراشٹر میں محدود رہی - یہ انتظام آسانی سے اور اچھی طرح جاری رہا مگر جب ان کی حکومت مشرق میں کٹک تک - مغرب میں کاٹھیاواڑ تک - شمال میں دہلی تک اور جنوب میں تنجور تک پھیل گئی تو اس انتظام میں تبدیلی ہونی لازمی تھی شاہو کے وقت تک اشٹ پردھان کی کونسل قایم رہی مگر پھر پیشوا زبردست ہو گیا اور پیشواؤں کی لیاقت کے سامنے دوسرے ممبران کونسل ماند ہو گئے - پیشوا سب کام آپ ہی کر لیتے تھے اور دوسرے کسی وزیر کی ان کو ضرورت نہ تھی اس لئے کونسل ٹوٹ گئی اور شہر پونا پیشواؤں کا دارالخلافہ بن گیا - کونسل کے

ٹوٹنے سے مرہٹوں کی حکومت کو بڑا نقصان پہنچا۔ آہستہ آہستہ بڑے بڑے
عہدے بھی پشتینی ہو گئے اور نالائق افسروں کی تعداد بڑھ گئی۔ مگر سب سے
زیادہ نقصان مرہٹہ بادشاہت کو اس بات سے ہوا کہ افسران کو جاگیر میں گاؤں
ملنے لگے۔ ان جاگیرداروں نے اپنے اپنے علاقہ میں بادشاہت قایم کر لی۔
اس طرح سندھیا۔ ہولکر اور گائیکوار خودسر ہو کر پیشوا کی تابعداری سے
آزاد ہو گئے۔ اور اس نااتفاقی سے مرہٹہ قوم کی طاقت نہایت کمزور ہو گئی۔
اس کے علاوہ سیواجی کے وقت میں مرہٹوں۔ برہمنوں اور پربھو ذات
کے لوگوں کا سرکاری ملازمت کے معاملہ میں وزن برابر تھا مگر بعد میں برہمنوں
اور پربھو ذات کے لوگوں کا زور کم ہوتا گیا۔ جب کبھی مرہٹوں کا زور زیادہ
معلوم ہوتا تھا تو برہمنوں کو فوجی عہدے دیکر مرہٹوں کی طاقت کم کرنے کی
کوشش کی جاتی تھی۔ مگر سندھیا اور ہولکر کی فوج کا کوئی برہمن جرنیل مقابلہ نہ
کر سکتا تھا۔ اس طرح مختلف فرقوں میں حسد و عناد پھیل گیا۔ اور مرہٹہ سلطنت
کی بنیاد کھوکھلی ہو گئی۔ ان وجوہات سے مرہٹوں کی بادشاہت انگریزوں
کے آنے سے پیشتر ہی کمزور ہو چکی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ انگریزوں نے
وہی اصول سلطنت اختیار کئے ہیں جو سیواجی کے وقت میں جاری تھے۔
انگریزی راج میں کونسل کے ذریعہ سے حکومت ہوتی ہے۔ کسی خاص شخص
کی مرضی پر حکومت کا حصر نہیں۔ کوئی عہدہ کسی خاندان کے لئے مخصوص نہیں
سرکاری افسر خود معاملہ وصول کرتے ہیں اور رعایا کے سب فرقوں کو ملازمت
میں حصہ ملتا ہے۔

آٹھویں فصل

مرہٹہ دیش کے سادھ سنت

آٹھویں فصل میں مسٹر راناڈے نے مہاراشٹر دیش کے سنتوں اور پیغمبروں کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ جتلایا ہے کہ سیواجی کا عہد حکومت صرف جنگی فتوحات کا ہی زمانہ نہ تھا بلکہ ان سادھ سنتوں کے پرچار سے مرہٹہ دیش کے لوگ اس وقت سوشل اور مذہبی معاملات میں ذہنی غلامی سے آزاد ہو گئے تھے۔ اگر مرہٹہ قوم ذہنی غلامی میں پھنسی رہتی تو ناممکن تھا کہ سیواجی کو کسی قسم کی کامیابی حاصل ہوتی۔ ہندوؤں میں ذات پات کی تمیز کی وجہ سے آپس میں نااتفاقی پھیلتی ہے۔ برہمنوں کی بیحد عزت سے دوسرے فرقوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔ براہمن خود مغرور ہو کر تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اور باقی ذاتیں بھی تعلیم سے محروم رہتی ہیں۔ علاوہ ازیں شاستروں کا زبان سنسکرت میں بند رہنا جہالت کو ترقی دیتا ہے کیونکہ سنسکرت عام فہم زبان نہیں اور ہر ایک آدمی کے لئے سنسکرت جاننا مشکل ہے۔ قوم کی جہالت نے عورتوں کی عزت کم کر دی اور لوگوں کے دل میں یہہ یقین پختہ ہو گیا کہ بہت سی خرابیوں کا باعث عورتیں ہوتی ہیں۔ اسی سبب سے ایک زمانہ میں ہندوؤں نے اس خیال کو زور دیا تھا کہ گرہست کی زندگی سے نفرت کرنی چاہئے اور جنگل میں رہ کر پرماتما کا بھجن کرنا چاہئے کیونکہ بیوی بچوں کی محبت میں پھنسکر پرماتما کی پوجا کرنا مشکل ہے۔ ان خیالات نے

ہندو سوسائٹی کو بڑا نقصان پہنچایا۔ قوم بالکل کمزور ہو گئی۔ بلند ہمتی کا نام نہ رہا۔ دھرم کے معاملہ میں ظاہرداری کا بازار گرم ہو گیا اور اصلی دھرم بالکل گم ہو گیا۔ مگر جیسا کہ کرشن مہاراج نے بھگوت گیتا میں فرمایا ہے کہ جس زمانہ میں دھرم کی بےعزتی اور خرابی ہوتی ہے پرماتما خود اس خرابی کو دور کرنے کے لئے دنیا میں آتے ہیں ہندو سوسائٹی اور دھرم کی گری ہوئی حالت کو . . . .

. . . . درست کرنے کے واسطے تیرھویں صدی سے مہان پرشوں نے آواز بلند کی۔ اور رفتہ رفتہ سیواجی کے زمانہ میں ان کی آواز کا زور اتنا بڑھ گیا کہ قوم اپنی حالت سے شرمندہ ہو کر اُن کے بتلائے ہوئے راستہ پر چلنے لگی۔ ان مہان پرشوں اور سادھ سنتوں میں عورت اور مرد دونوں شامل تھے اور ذات کا کوئی برہمن۔ کوئی شودر۔ مالی۔ کمہار۔ سنار اور کوئی نائی یا موچی تھا۔ بعض ایسے تھے کہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے مگر ہندو دھرم پر بابل تھے۔ ان سنتوں نے مہاراشٹر میں وہی کام کیا جو یورپ میں لوتھر اور اس کے پیروؤں نے کیا تھا۔ لوتھر وغیرہ نے رواجی دھرم کی بیہودگیوں۔ پادری لوگوں کی بیجد حکومت اور لاطینی زبان کے استعمال کے خلاف بغاوت کا جھنڈا اکھڑا کیا تھا اور اس بات کا پرچار کیا تھا کہ پاکیزہ زندگی اور پرماتما پر سچا بشواس فضول رسموں سے بہتر ہے۔ اسی طرح مرہٹہ دیش کے سادھ سنت ہندو دھرم کے بیہودہ رسم و رواج اور ذات پات کی تمیز کے سخت خلاف تھے۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ سب انسان چاہے وہ براہمن ہوں یا شودر پرماتما کی نظروں میں برابر ہیں۔ پرمیشور کا نام لینے سے

اور اس پر بشواش رکھنے سے آدمی کو موکش مل سکتی ہے۔ اور انسان کی
پاکیزہ زندگی کے برابر کوئی پوجا پاٹھ نہیں۔ یہ سنت لوگ خود شادی کرتے
تھے اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ ایک ہی ذات کے مرد
اور عورت کی آپس میں شادی ہو۔ انہوں نے راماین۔ مہابھارت اور
بھگوت گیتا کا عام فہم زبان میں ترجمہ کر کے ان کتابوں کے اعلےٰ خیالات
لوگوں میں پھیلا دیئے۔ سنسکرت کے مطالعہ کی ضرورت کم کر دی اور اپنی
پاکیزہ مثال سے ثابت کر دیا کہ پرمیشور کی بھگتی کے لئے سنسکرت کا جاننا ضروری
نہیں اور نہ اس بات کی ضرورت ہے کہ تپ جپ اور تیرتھ جاترا کی تکلیف
اٹھائی جائے۔ کیونکہ ان سے من کی شدھی نہیں ہوتی۔ مرہٹہ دیش میں قریباً
پچاس سنت تھے۔ ان کے پُرجوش بچنوں نے سیواجی اور اس کے ہمراہیوں
کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ سنت رامداس کو سیواجی نے اپنا گرو بنا لیا۔
ایک دفعہ وہ جوش میں آ کر دنیا کی جاہ و حشمت چھوڑنے کو تیار ہو گیا اور
اس نے اپنا راج پاٹ رامداس کے قدموں پر رکھ دیا۔ رامداس نے
کہا کہ تم کشتری ہو۔ تم کو فقیر بننا مناسب نہیں۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ اپنے
دھرم کے دشمنوں سے لڑائی کرو۔ اس سے تمہارے دھرم کی فتح ہوگی
یہ حکم سن کر سیواجی اپنے ارادہ سے باز رہا۔ جو لوگ اپنے دھرم پر پکا یقین
رکھتے ہیں وہ اس کو قایم رکھنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار رہتے
ہیں۔ پنجاب میں گرو گوبند سنگھ نے سکھوں کو پرمیشور کا سچا پریم سکھا کر
بزدلوں سے بہادر بنا دیا۔ اور اپنے دھرم کے رکشا کے لئے انہوں نے
جو قربانیاں کیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ اسی طرح سیواجی کے زمانہ کے سنتوں

نے مرہٹہ قوم کو پرچار کیا کہ اپنے دھرم کی رکشا کرو۔ اور پرمیشور پر بھروسہ کر کے کسی سے مت ڈرو۔ اس پرچار نے مرہٹوں کو شیر نر بنا دیا اور ان کی باہمی نااتفاقی کو دور کر کے ایک ایسی زبردست قوم مرہٹہ بنا دی کہ جس نے اورنگ زیب کی چالوں کو شکست دے کر قریبًا تمام ہندوستان پر قبضہ کر لیا +

نویں فصل

سنبھاجی کی موت سے شاہوجی کی تخت نشینی تک مغلوں سے بیس سال کی لڑائی

نویں فصل میں مسٹر رانا دے نے یہ بیان کیا ہے کہ سیواجی کو اورنگ زیب کے منصوبے اچھی طرح سے معلوم تھے وہ جانتا تھا کہ اورنگ زیب دکن کو فتح کرنا چاہتا ہے اُس سے ایک نہ ایک دن ضرور سخت مقابلہ ہوگا۔ اس لئے اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں سے اتفاق کر لیا اور ان ریاستوں نے اس کو کئی لاکھ روپیہ سالانہ اس غرض سے دینا منظور کیا کہ وہ مغلیہ فوجوں کے حملے سے اُن کو بچائے۔ علاوہ اس کے دریائے کاویری کے متصلہ علاقہ کو اُس نے بہت مضبوط بنا لیا تاکہ ضرورت کے وقت وہاں جا رہے۔ سہیادری پہاڑ میں جتنے قلعے تھے اُن سب کی اسنے

درست کرادی۔ بری فوج کے علاوہ اس کی بحری فوج بھی بڑی طاقت ور تھی۔ مگر سب سے زیادہ مضبوط اس کے ہمراہی تھے جن کو اپنی مثال سے اس نے ایسی تربیت دی کہ وہ اس کی خاطر جان دینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ان کا حوصلہ بڑا بلند تھا اور ان کو اس بات کا پکا یقین تھا کہ سیواجی کو شکست کبھی نہیں ہو سکتی۔ مرہٹہ قوم کی تاریخ میں پہلا بڑا نازک وقت وہ تھا جبکہ ۱۶۶۶ء میں راجہ جے سنگھ کے ساتھ صلح کر کے سیواجی نے اورنگ زیب کی اطاعت قبول کی اور جب وہ دہلی پہنچا تو باوجود اپنے وعدوں کے بادشاہ نے اس کو قید کر لیا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیا ہوا۔ سب کو ڈر تھا کہ اب سیواجی کا زندہ رہنا مشکل ہے۔ مگر سیواجی نے ایسی چال کھیلی کہ بادشاہ دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا اور آپ دن دناتا ہوا دکن میں آموجود ہوا۔ اورنگ زیب بھی مان گیا کہ یہ مرہٹہ بہادر غیر معمولی آدمی ہے

سیواجی کی ناگہانی موت سے سب کام درہم برہم ہو گیا۔ اس کا بیٹا سمبھا جی ایسے وقت میں مرہٹوں پر حکومت کرنے کے لایق نہ تھا۔ وہ سخت بد چلن اور شراب خور تھا اور طبیعت کا ایسا بیرحم تھا کہ سیواجی کے وقت کے سب سردار اس سے سخت ناراض ہو گئے اس کی سوتیلی ماں بھوکی مر گئی اپنے بوڑھے پیشوا سیجوا اور سمنت کو اس نے قید کرا دیا اور سیواجی کے زمانہ کے مکرٹری کو قتل کر دیا۔ جب تک وہ تخت نشین رہا یہ ظلم ہوتے رہے اور سیواجی کے سب قاعدے قواعد خاک میں مل گئے۔ اورنگ زیب نے اس بد انتظامی کے موقع کو غنیمت سمجھا اور تین لاکھ آدمی کی فوج لے کر دکن پر ٹوٹ پڑا۔ گولکنڈہ اور بیجاپور کو فتح کرنے کے بعد

اس نے سمبھاجی کو قید کر لیا اور بعد میں قتل کروا دیا۔ اور اس کی بیوی اور بچے کو اپنی حراست میں کر لیا۔ اس فتح کا یہ نتیجہ ہوا کہ نربدا سے تنگبھدرا تک تمام ملک اورنگ زیب کے قابو میں آ گیا۔ اس کے دل کی امیدیں بر آئیں۔ اس وقت یہ معلوم ہوتا تھا کہ اورنگ زیب کے خلاف جو کوشش سیواجی نے اپنی عمر میں کی تھی وہ سب عبث تھی اور اب مرہٹوں کا ستارہ پھر کبھی چمک نہیں سکتا۔ مرہٹہ قوم کی تاریخ میں یہ دوسرا نازک وقت تھا۔ مگر خوش قسمتی سے اس مصیبت نے مرہٹوں کے حوصلہ کو دوبالا کر دیا اور انہوں نے اس بات کا پختہ ارادہ کر لیا کہ مغلوں کو پھر پسپا کیا جائے سیواجی کا چھوٹا بیٹا راجہ رام اپنے باپ کا لائق بیٹا تھا وہ سمبھاجی کے بیٹے شاہو کو راجہ تسلیم کر کے اس کی طرف سے آپ مرہٹوں کا سردار ہو گیا سیواجی کی طرح راجہ رام بہادر ذکی۔ نیک چلن اور رحیم الطبع تھا اور گو اس وقت اس کی عمر ۲۰ سال کی تھی سب لوگ اس کی لیاقت کے قائل تھے۔ اس کے صلاح کار پرہلاد نیراجی۔ رگھوناتھ۔ پنڈت ہنمنتے۔ اور نیلو مورپیشور تھے۔ ان کی بے غرضی۔ بہادری اور بلند ہمتی کو انگریز تاریخ نویس بھی مانتے ہیں وہ راجہ رام کو لے کر قلعہ جنجی میں جو علاقہ تنجور میں تھا چلے گئے ان کی طرف سے مہاراشٹر میں سب سے بڑا عہدہ دار رام چندر پنت اماتیا تھا اس پر راجہ رام پورا اعتبار کرتا تھا۔ اس کو اجازت دی گئی کہ جو انتظام مناسب سمجھے کرے۔ ان کے علاوہ اور کئی براہمن مرہٹے اور پربھو ذات کے بڑے بڑے سردار راجا رام کے تابعدار اور مددگار تھے اور جو احکامات جنجی کے قلعے سے جاری ہوتے تھے ان کے مطابق

اپنی جان ہتھیلی پر رکھکر مغلوں سے لڑتے بھڑتے تھے۔ گو راجا رام اور اس کے ہمراہیوں کے پاس روپیہ۔ فوج۔ قلعے۔ اور کسی قسم کا سامان موجود نہ تھا مگر انہوں نے لڑائی کا ایسا طریقہ اختیار کیا کہ فتح اُن کی ہمرکاب بن گئی۔ یہ کامیابی ان کو آسانی سے نصیب نہیں ہوئی بلکہ اپنے راجہ کی قتل کا بدلہ لینے کے لئے انہوں نے جان توڑ توڑ کر مغلوں کا مقابلہ کیا اور اپنی لاثانی ہمت اور بہادری سے اورنگ زیب کو مرہٹوں کے فوقیت تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ ۱۶۹۱ء میں اورنگ زیب نے قلعہ جنجی کا محاصرہ کرایا مگر آٹھ سال کے بعد جب قلعہ فتح ہوا تو معلوم ہوا کہ راجہ رام قلعہ میں نہیں ہے۔ مرہٹوں کی فوج نے چاروں طرف سے مغلوں کے ناک میں دم کر دیا۔ ابھی یہ آزادی کی لڑائی ختم نہ ہوئی تھی کہ ۱۷۰۰ء میں راجہ رام مر گیا مگر اسکے بہادر جرنیلوں نے راجہ رام کے بیٹے کو اپنا بادشاہ تسلیم کر کے آزادی کی لڑائی بڑے زور شور سے جاری رکھی۔ آخر کار اورنگ زیب بھی تنگ آگیا اور اپنی ناکامیابی پر افسوس کرتا ہوا ۱۷۰۷ء میں بمقام احمد نگر مر گیا اس کے مرتے ہی شاہو آزاد ہو گیا اور ۱۷۰۸ء میں تخت نشین ہو کر اسنے سیواجی کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر دس سال کے اندر بالاجی وشوناتھ پیشوا اور کھانڈے راؤ داباڈے نے بادشاہ دہلی سے چوتھ۔ سردیش مکھی اور سوراجیہ (وہ علاقہ جو سیواجی کے زیر حکومت تھا) کی بابت باضابطہ سندیں حاصل کر لیں ✦

سنبھاجی کی موت کے بعد شاہو کی تخت نشینی تک جو معرکہ آرائی مرہٹوں اور مغلوں میں ہوئی اس کو مسٹر راناڈے نے آزادی کے لئے

بیس سالہ لڑائی کا نام دیا ہے۔ اس لڑائی کے نتائج مرہٹوں کے واسطے ایسے مفید ہوئے کہ یہ بیس سال کا عرصہ مرہٹہ قوم کی تاریخ میں بڑی رونق کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ سیواجی کو اورنگ زیب کی تمام فوج کا کبھی مقابلہ کرنا نہیں پڑا بلکہ ایک دفعہ اس نے مجبور ہو کر راجہ جے سنگھ کے ساتھ صلح کی تھی۔ اس کے وقت میں بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستیں رونق پر تھیں اور وہ انکو اپنی طرف کر کے مغلوں کا مقابلہ کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ اپنے پہاڑی قلعوں پر قابض تھا۔ اور جب کبھی میدان میں اس کو شکست کا ڈر ہوتا تھا تو ان قلعوں میں پناہ جا لیتا تھا۔ مگر سنبھاجی کی موت کے بعد جب مرہٹوں نے آزادی کی لڑائی شروع کی تو گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستیں معدوم ہو چکی تھیں اور پہاڑی قلعے اورنگ زیب کے قبضہ میں آگئے تھے۔ ایک طرف اورنگ زیب اپنی تمام فوج لے کر دکن کی فتح کے لئے لڑ رہا تھا دوسری طرف مرہٹوں میں سیواجی جیسا کوئی جرنیل موجود نہ تھا جو مقناطیس کی طرح اورونکو اپنی طرف کھینچتا۔ سنبھاجی کے وقت میں بہت سے تجربہ کار سردار قتل ہو چکے تھے۔ شاہو قید میں پڑا تھا مگر باوجود ان وقتوں کے ان بہادروں نے فوج فراہم کی۔ قلعے فتح کئے اور سیواجی کا علاقہ واپس لے لیا۔ اور مغلوں کے علاقہ دکن اور کرناٹک میں چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا حق حاصل کیا۔

اگر اورنگ زیب دکن پر حملہ نہ کرتا تو مرہٹوں کی ایک چھوٹی سی ریاست مغربی حصہ مہاراشٹر میں قایم ہو جاتی اور اس کا سردار دہلی کے بادشاہ کا ایک معتمد بن جاتا۔ جو تحریک سیواجی کے کارناموں سے مرہٹوں میں پیدا ہوئی تھی وہ تھوڑے عرصہ میں نیست و نابود ہو جاتی۔ اور ایک بڑی مرہٹہ قوم کا وجود

میں آنا ناممکن ہوتا ۔ مگر اورنگ زیب دکن کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ اور اس مطلب کے لئے جو لڑائی اس نے مرہٹوں سے کی اس کی وجہ سے مہاراشٹر کے باشندوں کی کایا پلٹ گئی اور ان کی حب الوطنی اور قومی جوش ایسے پختہ ہو گئے کہ شاہو کی تخت نشینی کے بعد تین پشتوں تک وہ تمام ہندوستان کو فتح کرتے پھرے۔ اس لحاظ سے یہ بیس سال کی لڑائی مرہٹہ قوم کے لئے بمقابلہ اُس جدوجہد کے جو سیواجی نے اپنی عمر میں کی تھی زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ اورنگ زیب کے مقابلہ میں معمولی لیڈروں اور ڈاکوؤں کو ایسی کامیابی ملنی مشکل تھی۔ ایک اعلےٰ اخلاقی طاقت نے ان لوگوں میں غایت درجہ کی بہادری۔ تکلیف برداشت کرنے کی طاقت ۔ لیاقت انتظام ۔ بلند حوصلہ جو کسی شکست سے پست نہ ہو۔ پکا بشواس جو کبھی ڈھیلا نہیں ہوتا تھا۔ ایک اعلےٰ معراج کی پیروی جو وقت ۔ مقام اور شخصیت پر محدود نہ تھی ۔ برادرانہ ہمدردی۔ قربانی کی نیت ۔ اور اپنے مشن کی کامیابی میں پکا یقین کیونکہ وہ دھرم کا مشن تھا پیدا کر دئے تھے۔ ان اعلےٰ صفات کی بدولت ان بہادروں نے سمبھاجی کی موت کے بعد بیس سال تک سخت لڑائیاں لڑ کر شاہو کو تخت نشین کر دیا اور اپنے دیش کو ایسے خطرے سے بچا یا کہ جس کے سامنے ہندوستان کی اور سب قومیں سرنگوں ہو چکی تھیں ۔ چونکہ اس بیس سال میں مرہٹہ قوم نے ان صفات کو کمال پر پہنچا دیا تھا اور مناسب تربیت حاصل کی تھی اس لئے یہ بیس سال کی لڑائی کا زمانہ مرہٹہ قوم کی تاریخ میں نہایت دلچسپ ہے ۔

دسویں فصل

شاہو کا عہد حکومت

دسویں فصل میں یہ بیان ہے کہ جس وقت شاہو گدی پر بیٹھا بڑے بڑے مرہٹوں اور براہمن سردار جنھوں نے اورنگ زیب کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا تھا آپس میں لڑنے جھگڑنے لگے۔ پہلے وہ اورنگ زیب سے ڈرتے تھے اور اس سے بچنے کی غرض سے آپس میں اتفاق سے کام کرتے تھے مگر اس کے مرنے کے بعد سب کا ڈر جاتا رہا اور ہر شخص اپنے اپنے فایدے کے واسطے کوشش کرنے لگا۔ علاوہ ازیں شاہو کے مقابلہ میں راجہ رام کے بیٹے اور بیوی تارابائی کی پارٹی بن گئی تھی۔ چند سردار شاہو کی طرف ہو گئے۔ چند تارابائی کے مددگار بن گئے۔ اور چند نظام حیدرآباد کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ اور وہ حب الوطنی بلند خیالی اور دھارمک جوش جس نے مغلوں کے مقابلہ میں ان کو ایک متحدہ مرہٹہ طاقت کا جان نثار بنایا تھا اب ان کی خودغرضی ...... کے سامنے پست ہو گئے۔ شاہو کی ذاتی صفات نے ان دقتوں کو دوبالا کر دیا۔ اس نے اپنا لڑکپن اور شروع جوانی مغلوں کی قید میں بسر کی تھی اس لئے وہ مسلمان امرا کی طرح جن کی سوسائٹی میں اس نے پرورش پائی آرام طلب ہو گیا تھا۔ سیواجی اور سمبھاجی کو جو قومی نفرت مغلوں سے تھی اس کا شاہو کی طبیعت میں نشان تک بھی نہ تھا۔ اس کا میلان طبع یہ تھا کہ اگر سلطنت مغلیہ کے امرا کی طرح اس کی عزت ہو تو بادشاہ

ہلی کے ساتھ صلح کرے ۔گو وہ بہادر اور بلند ہمت تھا مگر اس میں لیاقت انتظام اور محنت کرنے کی طاقت نہ تھی ۔وہ سیواجی کی طرح ہر ایک کام کو محنت اور غور کی ساتھ کرنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا ۔مغلوں کی فوجیں گو شکست کھا چکی تھیں مگر حملہ کے لئے تیار تھیں ۔ایسے وقت میں کامیابی کی تجویز سوچنا اور بلا کسی کی مدد کے دشمنوں کے خلاف فتح حاصل کرنا شاہو کی لیاقت سے باہر تھا ۔اس وقت لوگوں میں حوصلہ اور بہادری تو موجود تھی مگر ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی دانا منتظم مرہٹوں کی اندرونی نااتفاقی کو دور کر کے ان میں دوبارہ ایسی حب الوطنی پیدا کرے کہ وہ خودغرضی چھوڑ کر اپنا تمام زور ایک متحدہ راج کو مضبوط کرنے میں لگائیں ۔اور اس اعلےٰ مشن کی تکمیل کے لئے کوشش کریں جس پر سیواجی ہزار جان سے عاشق تھا ۔خوش قسمتی سے شاہو کو بالاجی شونا تھ ایسا دانا منتظم مل گیا اور وہ تھوڑے ہی دنوں میں پیشوا کے عہدے پر ممتاز ہوا ۔اس نے اپنی لیاقت اور حب الوطنی سے ایسا کام کر دکھایا جو ظاہرا ناممکن معلوم ہوتا تھا ۔اول تو اس نے بڑی عقلمندی سے اُن ڈاکوؤں کا زور کم کیا جنہوں نے تمام ملک میں لوٹ مار مچا رکھی تھی ۔اس نے کسی کو دھمکی دیکر ڈرایا کسی کو لڑائی میں شکست دی ۔کسی کو انعام کی امید دے کر اپنی پارٹی میں داخل کیا اور ملک میں امن امان قایم کر دیا ۔بعد ازاں اس نے بڑے بڑے مرہٹہ سرداروں کے ساتھ جن کو لڑائی میں فتح کرنا مشکل تھا موافقت کی ۔ان کو بتایا گیا کہ اگر تم ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ رہو گے آپس میں لڑتے رہو گے تو سب کے سب برباد ہو جاؤ گے اور اگر باہمی اتفاق سے رہو گے

تو دشمن بھی تمہاری عزت کرے گا۔ کھانڈے راؤ دابھاڈے۔ پرسوجی
بھونسلے۔ اوداجی پوار۔ فتح سنگھ بھونسلے۔ اور گوبند راؤ چٹنویس وغیرہ
سردار بالاجی کی بات مان گئے اور ان کو شاہو کے ماتحت اعلےٰ عہدے
دیئے گئے۔ مگر جو علاقے انہوں نے خود فتح کئے تھے وہ ان کے ہی
قبضہ میں رہے۔ بالاجی وشوناتھ نے اس طریقہ سے دس سال کے اندر
مرہٹہ قوم کی طاقت مضبوط اور متحد کردی۔ اشٹ پردھان کونسل جو سیواجی
نے قایم کی تھی سنبھاجی کے وقت میں ہی درہم برہم ہو گئی تھی۔ اس کی موت
کے بعد شاہو کی تخت نشینی تک لڑائیاں رہیں اس وقت بھی کونسل کا قایم
رہنا ناممکن تھا۔ بالاجی وشوناتھ نے شاہو کے دربار میں تو اشٹ پردھان
کونسل قایم کردی مگر وہ تاڑ گیا کہ جو علاقے مرہٹہ سرداروں نے اپنے زور
بازو سے فتح کئے ہیں ان میں شاہو کی کونسل کا حکم کوئی نہ مانے گا۔ اس لئے
یہ تجویز کی کہ ان علاقوں کے مالک جو انتظام مناسب سمجھیں وہاں جاری
کریں مگر مرہٹہ قوم کے دشمنوں کے مقابلہ میں سب کے سب آپس میں
اتفاق کریں اور شاہو کے دربار کے مشورہ پر عمل کریں۔ یہ انتظام آیندہ
سو سال تک جاری رہا اور اس کی بدولت مرہٹوں نے ہندوستان کے
مختلف حصوں میں بڑا عروج حاصل کیا۔ انہوں نے گجرات۔ مالوہ۔ بندیل
کھنڈ۔ اوڑیسہ۔ گونڈوانہ۔ نیمار اور کرناٹک کو دریا تنگ بھدرا کے کنارے
تک فتح کر لیا۔ راجپوتانہ کی ریاستوں میں اور دہلی کے دربار میں ان کا زور
بڑھ گیا اور وہاں وہ جس کو چاہتے تھے بادشاہ بناتے تھے۔ اودھ اور
بنگال کے نواب بھی اُن کے اختیار میں تھے۔ انہوں نے اہل بنگال

کو بیبن سے نکال دیا اور انگریزوں سے دو لڑائیوں میں برابر رہے ۔ گو پانی پت میں انہوں نے شکست کھائی ۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد وہ پھر دہلی اور شمالی ہند میں زور دوں پر ہو گئے ۔ بالاجی وشوناتھ نے یہ انتظام مفصلہ ذیل طریقوں سے مضبوط کیا تھا ۔ (۱) تمام سردار سیواجی کے کارناموں کو بڑے ادب سے یاد کرتے تھے اور اس کے پوتے شاہو کی بڑی عزت کرتے تھے ۔ شاہو چالیس سال تک گدی نشین رہا ۔ اس عرصہ میں ہر ایک سردار اس سے ایسے محبت کرتا تھا جیسے کہ قریبی عزیز رشتہ دار سے کرتے ہیں ۔ تمام ریاست میں اس کے نام سے سندیں جاگیریں اور خطاب دیئے جاتے تھے ۔ سکہ اس کے نام پر چلایا جاتا تھا ۔ دشمن سے صلح اس کے نام پر ہوتی تھی اور ہر یک مہم کی رپورٹ اس کے دربار میں بھیجی جاتی تھی (۲) سب سرداروں کے اختیارات سندوں اور اقرار ناموں سے تعین کئے گئے تھے کسی کو مجال نہ تھی کہ دوسرے کو نقصان پہنچائے جب ان میں کبھی تکرار ہو جاتی تھی ، تو شاہو مصالحت کرا دیتا تھا ۔ (۳) جب مرہٹوں کو علاقہ مغلیہ میں سردیش مکھی اور چوتھ وصول کرنے کا حق حاصل ہوا تو مختلف سرداروں کو اس کے وصول کرنے کی ڈیوٹی دی جاتی تھی ۔ یہ ڈیوٹی اس طرح مقرر کی جاتی تھی کہ آپس میں تنازعہ نہ ہو اور شاہو کے فائدے کو سب اپنا فایدہ سمجھیں ۔ (۴) بڑے بڑے سرداروں کو جاگیریں اور زمینیں خاص شاہو کے علاقے میں دی ہوئی تھیں اور اگرچہ ان کی اپنی اپنی ریاستیں وہاں سے دور تھیں وہ شاہو کے علاقہ کی حفاظت کرنا اپنے لئے مفید اور ضروری سمجھتے تھے ۔

(۵) ان سب ریاستوں کا فرض تھا کہ اپنا حساب جدا جدا شاہو کے خزانہ

میں پیش کریں۔ وہاں ان کے حساب کی پڑتال کا محکمہ مقرر رہتا۔ (۶) ہر ایک ریاست اور قلعہ دار کے ساتھ شاہو کے دربار کی طرف سے چند افسر رہتے تھے جو ان کی آمدنی و خرچ کا حساب رکھتے تھے اور ان کے اندرونی انتظام کی رپورٹ دربار میں بھیجتے تھے۔ ان کی موقوفی اور تبدیلی شاہو کے حکم سے ہوتی تھی +

جب تک یہ انتظام جاری رہا شاہو کا دربار اپنے زور سے اس کی تعمیل کراتا رہا۔ اس انتظام کی خوبی یہ تھی کہ قریباً سو سال تک اس سے مرہٹوں کو بڑی فتح حاصل ہوئی اور چونکہ یہ انتظام بالاجی وشوناتھ نے جاری کیا تھا وہ سیواجی کی طرح مرہٹہ راج کو مضبوط کرنے والا سمجھا جاتا ہے +

گیارھویں فصل

چوتھ اور سردیش مکھی

گیارھویں فصل میں بیان کیا گیا ہے کہ مرہٹوں نے بڑی کوشش سے چوتھ اور سردیش مکھی ٹیکس وصول کرنے کا حق حاصل کیا۔ سردیش مکھی ٹیکس مالگذاری کا دس فیصدی حصہ ہوتا تھا اور مالگذاری وصول کرنے کے بدلہ میں دیا جاتا تھا جیسے کہ آجکل حق نمبرداری و ذیلداری ہے۔ چوتھ کل مالگذاری کا چوتھا حصہ ہوتا تھا اور ملک کی حفاظت اور امن و امان کی قایمی کے عوض عطا ہوتا تھا۔ ۱۶۶۸ء میں ریاست بیجاپور نے تین لاکھ روپیہ اور

ریاست گولکنڈہ نے پانچ لاکھ روپیہ بطور سردیش مکھی اور چوتھ کے سیواجی
کو دینے کا اقرار کیا۔ اس کے صلہ میں سیواجی نے اقرار کیا کہ مرہٹوں کی فوج
ان ریاستوں کی حفاظت کرے گی اور مغلوں کے برخلاف ان کی مدد کریگی۔
بیدنور کا راجہ اور سونڈا کا رئیس بھی اسی قسم کا خراج سیواجی کو دیتا تھا۔ ۱۶۷۴ء
میں علاقہ کانکن میں جو بستیاں اہل پرتگال کی تھیں انہوں نے بھی سردیش
مکھی اور چوتھ کی بابت سیواجی کو نذرانہ دیا۔ ۱۶۷۶ء میں جب اس نے
کرناٹک پر حملہ کیا تو یہ ٹیکس وہاں بھی وصول کئے۔ مگر بادشاہ دہلی نے
باوجود وعدوں کے یہ ٹیکس اپنے علاقہ دکن سے دینا منظور نہ کیا۔ اس کے
بعد کئی دفعہ بادشاہ کے صوبہ داروں نے اقرار کیا اور کئی دفعہ انکار کیا۔ آخر کار
۱۷۱۹ء میں محمد شاہ بادشاہ دہلی نے سردیش مکھی اور چوتھ اور سوراجیہ (وہ علاقہ جو سیواجی
فتح کر چکا تھا) کی سندیں بالاجی وشوناتھ کو شاہو جی کے واسطے عطا کیں۔
مذکورہ بالا ٹیکس علاقہ بیرار۔ خاندیش۔ اورنگ آباد۔ بیدر۔ حیدرآباد اور
بیجاپور سے جو بادشاہ دہلی کے ماتحت تھے شاہو کو لینے کا اختیار دیا گیا
چوتھ کے بدلہ شاہو کا اقرار تھا کہ ان علاقوں کی حفاظت کے لئے اس کی
طرف سے پندرہ ہزار فوج رکھی جائیگی جو بادشاہ دہلی کی خدمت کے واسطے
ہمیشہ تیار رہے گی۔ ان علاقوں کی سالانہ آمدنی ۱۸ کروڑ روپیہ تھی جس میں
سے دس فیصدی بطور سردیش مکھی اور پچیس فیصدی بطور چوتھ مرہٹے وصول
کرتے تھے۔ ۱۷۲۰ء میں بالاجی وشوناتھ مرگیا اور ان ٹیکسوں کے وصول
کرنے کا کام اس کے بیٹے باجی راؤ کو کرنا پڑا۔ بادشاہ نے سندیں تو دیدیں
مگر دکن کے صوبہ دار نظام الملک نے بادشاہ کے حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا

باجی راؤ نے اس کو شکست دے کر ۱۷۳۲ء میں اس سے شاہو کے واسطے مذکورہ بالا چھ مغلیہ صوبوں سے سردیش مکھی اور چوتھ وصول کرنیکا حق تسلیم کرایا۔ ۱۷۴۳ء میں مرہٹوں کی نظام صلابت جنگ سے لڑائی ہوئی۔ مرہٹوں نے فتح پائی اور علاقہ کھاندیش اور ناسک شاہو کو مل گیا۔ ۱۷۶۰ء میں احمدنگر کے قریب کا بہت سا علاقہ مرہٹوں نے نظام سے چھین لیا۔ ۱۷۹۰ء میں ضلع شولاپور اور بیجاپور کا زیادہ حصہ پیشوا نے سلطنت مرہٹہ میں شامل کیا۔ کرناٹک کے نوابوں سے پیشوا باجی راؤ اور اس کے بیٹے بالاجی نے لڑائیاں کیں اور بیجاپور۔ بلگام اور دھاروار کے اضلاع فتح کئے۔ نوابوں کے بعد میسور میں حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان سے اُن کے جنگ ہوئے۔ مرہٹوں نے کامیاب ہوکر اپنے علاقہ کو دریائے تنگ بھدرا تک بڑھا دیا۔ ان فتوحات کی وجہ سے سواراجیہ صرف سیواجی کے مقبوضات کا ہی نام نہ رہا بلکہ اُس سب علاقہ کو سواراجیہ کہنے لگے جو مرہٹوں نے چاروں طرف فتح کر لیا تھا۔ اسی طرح سردیش مکھی اور چوتھ کے حقوق دکن کے چند صوبوں کے علاوہ گجرات۔ کاٹھیاواڑ۔ مالوا۔ راجپوتانہ۔ بندھیل کھنڈ۔ نیمچ۔ گونڈوانہ۔ سمبل پور۔ اوڑیسہ۔ آگرہ۔ دہلی۔ اودھ اور بنگال سے بھی وصول ہونے لگے۔

بارھویں فصل

جنوبی ہند میں مرہٹوں کی حکومت

بارھویں فصل میں اُن مقبوضات کا ذکر ہے جو جنوبی ہند یعنے مدراس احاطہ میں مرہٹوں نے حاصل کئے تھے۔ سیواجی کے باپ شاہاجی اور بھائی وینکوجی نے علاقہ تنجور میں اپنی بادشاہت کی بنیاد ڈالی اور ۱۶۷۵ء سے ۱۸۵۵ء تک وہ قایم رہی۔ اگرچہ اس وقت کے بعد یہ ریاست سرکار انگریزی کے قبضہ میں آگئی مگر اب تک اس خاندان کی رانیاں تنجور میں رہتی ہیں۔ ان کو معقول جاگیر ملتی ہے اور بڑی بھاری جایداد ان کے قبضہ میں ہے تنجور کے راجگان لایق اور تعلیم یافتہ آدمیوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان میں سے بعض خود شاعر اور عالم فاضل تھے۔ ان کی خیرات کی کچھ حد نہ تھی۔ اسی وجہ سے مدراس احاطہ میں تنجور کا ضلع علم و ہنر میں مشہور رہا ہے۔ وہاں کی لائبریری لاثانی ہے۔ جب تنجور کی راجدھانی اوٹھ گئی تو لایق آدمی وہاں سے جا کر ریاست ٹراونکور میں آباد ہو گئے اور ان کی رونق بڑھ گئی۔ کمبھا کونم کے شہر میں بھی بہت سے ممتاز مرہٹہ خاندان ہیں جن کے رکن اعظم مرحوم سر ٹی (تنجور) مادھو راو۔ دیوان بہادر رگھوناتھ راو۔ وینکاسوامی راو۔ گوپال راؤ وغیرہ اپنی علم و فضیلت کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مشہور ہیں۔ ریاست ٹراونکور اور میسور میں مرہٹہ نسل کے مدبروں نے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچکر بڑی نیکنامی حاصل کی ہے۔ ریاست ارکٹ کے نواب کے ماتحت

بہت سے مرہٹے ملازم تھے اور اب بھی ایک برہمن سردار ارکٹ کے علاقہ اسنی پر قابض ہے جو اس کے بزرگوں کو دو سو سال ہوئے بیجاپور کے بادشاہ کی طرف سے فوجی خدمات کے بدلے عطا ہوا تھا۔ ضلع بلاری میں ایک چھوٹی سی ریاست جس کا نام سونڈا ہے اب تک مرہٹوں کے قبضہ میں ہے۔ اسی طرح ریاست پدہ کوٹا میں پہلے مرہٹوں کا زور تھا اور اب بھی مرہٹوں کی آبادی وہاں موجود ہے۔ اضلاع مدراس کے علاوہ جس میں دو لاکھ تیس ہزار مرہٹے ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے وقت آباد تھے۔ جنوبی کنارا۔ مالا بار۔ کوچین اور ٹراونکور میں بھی اس وقت قریباً ڈیڑھ لاکھ مرہٹے بستے تھے +

اس سے ظاہر ہے کہ مرہٹے ایک وقت میں ایسے زبردست تھے کہ انہوں نے اپنے گھر سے نکل کر جنوبی ہند کے بہت سے مقامات میں اپنی ریاست قایم کر لی۔ سیواجی کا باپ شاہجی ریاست بیجاپور کی طرف سے سپہ سالار ہو کر ۱۶۳۸ء میں جنوبی ہند کو گیا تھا اس نے میسور۔ ویلور اور جنجی کے علاقہ کو فتح کر لیا۔ ان فتوحات کے عوض میں بیجاپور کی طرف سے اس کو ۱۶۴۸ء میں میسور کے علاقے بنگلور۔ کولر۔ کٹا اور کئی مقامات بطور جاگیر دیئے گئے۔ اپنے مرتے دم تک یعنی ۱۶۶۴ء تک شاہجی اس جاگیر پر قابض رہا۔ بنگلور اس کا دارالخلافہ تھا۔ اس کے بیٹے وینکوجی نے علاقہ تنجور ۱۶۷۴ء میں فتح کر کے اپنا صدر ۱۶۷۵ء میں بنگلور سے تنجور میں بدل لیا۔ ۱۶۷۶ء میں سیواجی نے اپنے باپ کی جاگیر کا حصہ لینے کے لئے کرناٹک پر حملہ کیا اور وینکوجی کو پسپا کر دیا۔ وینکوجی فقیر ہو نے

کو تیار ہو گیا اس بیٹے سیواجی نے گل جاگیر اس کو بخش دی مگر وینکوجی
نالایق تھا۔ اس نے شہر بنگلور تین لاکھ روپیہ میں ریاست میسور کے
ہاتھ بیچ دیا۔ اور خود ۱۶۸۷ء میں مرگیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے پوتے
وغیرہ گدی نشین ہوئے اور چونکہ مہاراشٹر کے سرداروں سے ان کا میل
نہ تھا اُن کے پڑوسی مسلمان ریاستوں اور انگریزوں فرانسیسیوں نے
ان کو کمزور کر دیا آخرکار انیسویں صدی کے نصف میں راجہ لاولد مرگیا۔ اور
اس کی ریاست آخرکار انگریزی کے قبضہ میں آگئی +

آخری فصل

آخری فصل میں مسٹر تیلانگ کی اس تحقیقات کا خلاصہ درج ہے جو
انہوں نے مرہٹوں کی سوشل اور دھارمک حالت کے متعلق کی تھی +
مسٹر تیلنگ نے بڑے غور و مطالعہ کے بعد تحریر کیا ہے کہ مرہٹہ قوم
کے راجا ہندو شاستروں کی خلاف ورزی کرنے والوں سے حکماً پراسچت
کرانے تھے۔ ایک دفعہ ایک براہمن مسلمان ہو گیا تھا اور چند آدمیوں
نے اس کو پھر براہمن سوسائٹی میں داخل کر لیا۔ راجہ کے حکم سے سب کو
پراسچت کرنا پڑا۔ برہمنوں کو حکم تھا کہ پربھو ذات کے لوگوں کی شادی
غمی کے موقعہ پر شاستروں کے مطابق رسوم ادا کریں۔ راجا نے یہ حکم
بھی دیا تھا کہ ضلع وائی میں کوئی براہمن روپیہ لے کر اپنی لڑکی کی شادی
نہ کرے۔ روپیہ لینے والا۔ روپیہ دینے والا اور ان کا سودا کرانے والا

سخت جرمانہ کا دینزدار ہوتا تھا +

سیواجی نے نہ صرف مندروں کی حفاظت کے لئے سرکار سے
روپیہ دیا بلکہ مسجدوں اور مسلمان پیروں کی خانقاہوں کے واسطے جو
روپیہ پہلے سے دیا جاتا تھا اس کو بدستور قایم رکھا +

بدچلنی کے لئے بھی سخت سزا دیجاتی تھی۔ تلیگام میں ایک برہمن
عورت کی ایک مسلمان سے آشنائی تھی۔ وہاں کے برہمنوں نے پیشوا سے
شکایت کی۔ اس کے حکم سے برہمن عورت کو جلاوطن کیا گیا اور اس کے
مسلمان آشنا کو قتل کرایا گیا +

اس وقت کی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ برہمنوں میں شاستروں
کی واقفیت بہت کم تھی۔ پرشرام بھاؤ پٹوردھن جو پیشواؤں کے زمانہ میں
بڑا زبردست افسر گذرا ہے اپنی ۷ سالہ بیوہ لڑکی کی دوبارہ شادی کرنا
چاہتا تھا۔ رام شاستری جو اس وقت بڑا مشہور پنڈت تھا اس لڑکی
کے دوبارہ بیاہ کے حق میں تھا۔ بنارس کے پنڈتوں کی بھی یہی رائے
تھی۔ مگر بعد میں پرشرام بھاؤ اپنے ارادہ سے اس وجہ سے باز آیا کہ بدھوا
بواہ ہندو سوسائٹی کے رواج کے خلاف ہے۔ رگھوبادا پیشوا کی طرف
سے دو شخص سفیر ہو کر انگلستان گئے تھے جب وہ واپس آئے تو وہ پرایشچت
کر کے سوسائٹی میں داخل ہو گئے۔ پیشواؤں میں سے کئی نے بہت چھوٹی
عمر میں شادی کی تھی۔ اور لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ بیواؤں کا پونا میں
سر منڈوایا جاتا تھا۔ شادی کے موقع پر رنڈیوں کا ناچ ہوتا تھا۔ اور جب
کوئی شخص مرجاتا تھا تو اس کی بیاہتا عورتیں اور آشنا عورتیں دونوں اس کی

ساتھ ستی ہوتی تھیں۔ دھرم شاستروں کی پابندی اس وقت زیادہ ہوتی تھی +

مسٹر رانادے کا تعلیمی کام

مسٹر رانادے کا طریق زندگی ایسا اچھا تھا کہ وہ کبھی بیکار نہ بیٹھتے تھے بلکہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی عمدہ خیال ان کے دماغ سے نکلتا رہتا تھا۔ گورنمنٹ نے ان کو ہائیکورٹ کا جج بنا دیا۔ بہت سے آدمی اس عہدہ پر پہنچکر کسی اور کام کے لائق نہیں رہتے۔ مگر مسٹر رانادے نے ججی کا کام بھی لیاقت سے کیا اور رفاہ عام کے معاملات میں بھی بڑی دلچسپی ظاہر کی۔ وہ بمبئی یونیورسٹی کی سینیٹ کے ممبر تھے۔ (۱) تعلیم کے کام کو ترقی دینے کی غرض سے انہوں نے یونیورسٹی میں یہ تحریک شروع کی کہ عام فہم زبانیں بھی مختلف امتحانوں کے کورس میں داخل کی جائیں۔ ۱۸۵۹ء میں بمبئی یونیورسٹی کے امتحانات شروع ہوئے تھے۔ اس وقت سے بعد یہ قاعدہ جاری تھا کہ طالب علم انگریزی زبان کے علاوہ احاطہ بمبئی کی ایک دیسی زبان بھی امتحانوں کے لئے پڑھ سکتے تھے۔ مگر ۱۸۷۰ء میں دیسی زبانیں یونیورسٹی کے اعلےٰ امتحانوں سے خارج کر دی گئیں۔ اس کی وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ ان زبانوں میں سنسکرت اور عربی جیسا لٹریچر موجود نہیں۔ اس نئے حکم کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ نوجوان انگریزی زبان میں لکھنا اور گفتگو کرنا اچھی طرح سے جانتے تھے مگر اپنی مادری زبان کو درستی اور آسانی کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے

تھے - ان میں ایسے بہت کم تھے جنہوں نے کسی ورنیکولر زبان میں کوئی عمدہ
کتاب لکھی ہو - یہ حالت دیکھکر بہت سے خیرخواہان ملک کی یہ رائے ہوئی
کہ یونیورسٹی کے اعلےٰ امتحانوں میں عام فہم زبانوں کو بھی داخل کرانا چاہئے تاکہ
اُن زبانوں کی ترقی ہو - وزیر ہند نے بھی گورنمنٹ بمبئی کو یہی مشورہ دیا
مگر یونیورسٹی کے ممبروں میں ایسے آدمیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو
اس رائے کے خلاف تھے - اس لئے یہ تجویز کہ بی - اے سے پہلے امتحان
میں جواب مضمون ورنیکولر میں ہوا کرے نامنظور ہوئی - اس شکست سے
مسٹر رانادے کا حوصلہ پست نہیں ہوا - انہوں نے - ورنیکولر زبانوں کی
تائید میں اپنی کوشش برابر جاری رکھی اور اپنی دانائی سے اس کوشش کو ایسا
باقاعدہ بنا دیا کہ آخر کار ان کی تجویزیں ایک حد تک منظور ہوگئیں - اس کامیابی
کو حاصل کرنے کے لئے انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ یونیورسٹی کے ۴۶ ممبروں
کی طرف سے سنڈیکیٹ (یونیورسٹی کی انتظامیہ کمیٹی) کی خدمت میں ایک
درخواست بھیجی کہ بی - اے اور ایم - اے کورس کے اختیاری مضمونوں
میں ورنیکولر زبانیں بھی داخل کی جائیں - اور یہ اجازت دی جائے کہ ان
امتحانوں کے لئے سنسکرت اور فارسی کی جگہ طالب علم کوئی ورنیکولر زبان
لے سکیں - جس وقت سنڈیکیٹ میں اس درخواست پر بحث ہوئی مسٹر رانادے
نے بڑی لیاقت سے اس کی تائید کی - مخالف اور موافق رائیں آپس میں
برابر تھیں مگر چونکہ جلسہ کے پریزیڈنٹ نے درخواست کے برخلاف رائے
دی اس لئے درخواست مذکور نامنظور ہوئی - یہ نتیجہ سن کر مسٹر رانادے
نے فرمایا کہ اگرچہ فی الحال یہ سوال خاطر خواہ طور پر فیصلہ نہیں ہوا مگر ہمت ہارنے

کی کوئی وجہ نہیں ہے یہ سوال پھر یونیورسٹی کے روبرو پیش کیا جائیگا۔ اپنے
ہمراہیوں کے خیالات مضبوط کرنے کی غرض سے انہوں نے مرہٹی زبان
کی ایک تاریخ لکھی اور اس میں ثابت کیا کہ یہ ایک دیہاتی زبان نہیں بلکہ
اس میں نظم کی اعلےٰ قسم بھی موجود ہے۔ نثر کی کتابیں گو اس زبان میں کم ہیں مگر
سنسکرت کا بھی یہی حال ہے۔ اس لئے یہ اعتراض معقول نہیں۔ مسٹر راناڈے
نے معاملہ زیر بحث میں دوبارہ درخواست دلوائی اور اس دفعہ سنڈیکیٹ نے
مسٹر راناڈے۔ مسٹر مہتا۔ اور ڈاکٹر میکیکن کی ایک سب کمیٹی مقرر کی تاکہ وہ
اس مضمون پر اپنی رائے دیں کہ آیا ایم۔ اے امتحان کے کورس میں مرہٹی
اور گجراتی زبانوں کو داخل کرنا چاہئے یا نہیں۔ انہوں نے بہت کچھ تحقیقات
اور غور کے بعد یہ رپورٹ کی کہ انگریزی کورس کے ساتھ بجائے سنسکرت
اور فارسی کے مرہٹی یا گجراتی زبان کا کورس پڑھنے سے فایدہ ہوگا کوئی نقصان
نہیں ہو سکتا۔ اس رپورٹ میں یہ بھی جتلایا گیا کہ مرہٹی اور گجراتی زندہ زبانیں
ہیں اور ان کی ترقی اور تبدیلی کے حالات مردہ زبانوں کی تاریخ سے زیادہ
دلچسپ ہیں۔ یہ رپورٹ نہایت مدلل ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو
سکتا کیونکہ اس کمیٹی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ قدیمی زبانوں کو ایم۔ اے سے
پہلے سب امتحانوں میں بدستور لازمی رکھا جائے۔ صرف ایم اے کے
امتحان میں ورنیکلر زبانوں کو داخل کیا جائے۔ مگر پھر بھی ان کو لازمی مضمون
نہیں بنایا صرف طالب علم کو اختیار دیا ہے کہ خواہ وہ سنسکرت یا عربی
پڑھے یا مرہٹی گجراتی پڑھے + یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ورنیکلر زبانوں
کے مطالعہ پر اس وجہ سے زور نہیں دیا گیا کہ وہ قدیمی زبانوں جیسی عمدہ

اور نفیس ہیں۔ بلکہ اس غرض سے کہ طالب علموں کو اپنی مادری زبان آسانی اور درستی سے لکھنے اور پڑھنے کی مہارت ہو جائے۔ تا کہ انگریزی لٹریچر اور فلاسفی کے مطالعہ سے جو نئے خیالات ان کو ملتے ہیں وہ اُن عام فہم زبانوں میں داخل ہوں اور ورنیکلر لٹریچر زیادہ مفید اور وسیع ہو جائے۔

یہ رپورٹ جس کا بہت سا حصہ مسٹر رانا دے کا لکھا ہوا ہے ولیسی زبانوں کے حق میں ان کی آخری کوشش کا اظہار تھی۔ کیونکہ پیشتر اس کے کہ یہ رپورٹ سینٹ کے روبرو پیش ہوتی مسٹر رانا دے دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کے مرنے کے بعد ۲۹ جنوری ۱۹۰۱ء کو سینٹ نے یہ رپورٹ منظور کی اور گجراتی اور مرہٹی کے علاوہ کناری زبان بھی ایم اے امتحان کے کورس میں داخل کی۔ امید ہے کہ اب کوئی اور شخص اس بات کی کوشش کرے گا کہ ان زبانوں کو ایم اے کے علاوہ اور امتحانوں میں بھی داخل کیا جائے۔ مگر یہ کوشش اُس جوش۔ صبر۔ حوصلہ۔ صبر۔ استقلال اور دانائی سے ہونی چاہئے جس سے کہ مسٹر رانا دے اپنا کام کیا کرتے تھے۔ یہ کوشش نہایت ضروری ہے کیونکہ سوائے کالجوں اور سکولوں کے نوجوانوں کے پاس ورنیکولر زبانوں کے سیکھنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں اور اگر ورنیکولر زبانوں کی تعلیم کے متعلق یہ اعتراض نہ ہو سکے کہ ان سے طالب علموں کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے یا یہ کہ ورنیکولر کورس بمقابلہ سنسکرت اور عربی کورس کے آسان ہے تو امید ہے کہ ورنیکولر زبانوں کو سب امتحانوں کے کورس میں داخل کرانے کی کوشش ضرور کامیاب ہوگی۔ کاش کہ یہ کوشش تمام ہندوستان میں کیجاتی آجکل ہم سب لوگ انگریزی زبان کے عاشق ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہمارے

حکام کی زبان ہے اور حکام کی ہر ایک چیز محکوم کو ہمیشہ اچھی معلوم ہوتی ہے۔
دوئم انگریزی زبان صدیوں سے منجھتی چلی آتی ہے اور اب ایسی خوبصورت
ہوگئی ہے کہ اس کو لکھنے پڑھنے اور بولنے سے واقعی بڑا لطف حاصل
ہوتا ہے کیونکہ اس میں ایسے عمدہ خیالات موجود ہیں کہ ہر ایک شخص اسکے
سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگ
انگریزی کتابیں اور اخبار پڑھتے ہیں انگریزی میں ایک دوسرے سے
خط و کتابت کرتے ہیں اور ورنیکولر کتابوں اور اخباروں کی طرف بالکل
توجہ نہیں کرتے۔ اس واسطے ورنیکولر لٹریچر کی ترقی نہیں ہوتی۔ اور تعلیم یافتہ
لوگوں کے خیالات عوام الناس تک نہیں پہنچتے۔ انگریزوں کے ملک میں
بھی ایک زمانہ میں یہی حال تھا۔ نارمن قوم نے جب انگلستان کو فتح کیا تو
لاطینی زبان کا استعمال وہاں زور سے رائج ہوگیا۔ عدالتوں کی کارروائی
لاطینی میں ہوتی تھی پادری لوگ پرستش کا کام لاطینی زبان میں کرتے تھے
ہر شخص جو جنٹلمین بننا چاہتا تھا لاطینی زبان سیکھتا تھا کیونکہ اسی زبان کی
تعلیم کا رواج تھا۔ اس غیر زبان کے استعمال سے اہل ملک کا دماغ کمزور رہو گیا
اور وہ بہت تھوڑی کتابیں لاطینی زبان میں لکھ سکے۔ مگر جب تیرھویں صدی
میں عدالتوں۔ عبادت گاہوں اور مدرسوں میں لاطینی زبان کا استعمال
لازمی نہ رہا تو انگریزی زبان کا بول بالا ہوگیا۔ عدالتوں میں انگریزی زبان
کا استعمال شروع ہوا۔ سکولوں اور کالجوں میں انگریزی زبان پہ توجہ ہونے
لگی۔ رفتہ رفتہ عالم لوگ اس زبان میں کتابیں لکھنے لگے۔ یہ سلسلہ چاسر کے
زمانہ سے شروع ہوکر شیکسپیر کے وقت تک پہنچا۔ جس نے اپنی تصنیفات سے

انگریزی زبان کو نہایت اعلےٰ درجہ پر پہنچا دیا۔ شیکسپیر کے بعد انگریزی
لٹریچر ترقی کرتا رہا۔ مگر انیسویں صدی میں بیشمار مصنف ایسے پیدا ہوئے
جن کے نام عرصہ تک لوگوں کی زبان پر رہینگے۔ ان کی تصنیفات نے انگریزی
زبان کو نئی جلا دیدی۔ اور اب وہ نہایت ہی خوبصورت معلوم ہوتی ہے
اور دنیا کے باشندوں کی بہت زیادہ تعداد اس کو استعمال کرتی ہے۔ اہل
ہند کا بھی یہی فرض ہے کہ اپنی مادری زبانوں کو ترقی دیں۔ اہل بنگال۔ اہل
مہاراشٹر۔ اہل مدراس نے اپنی زبانوں کو بہت کچھ ترقی دی ہے ناول قصہ کہانی
اور ڈراما ناٹک۔ تاریخ اور سوانح عمری ان کی زبانوں میں لکھی جا رہی ہیں مگر ابھی
بہت مرحلہ طے کرنا باقی ہے۔ جوں جوں ہماری زبان کی حالت بہتر ہوگی
ہمارے دماغ آسانی سے کام کرینگے اور انگریزی زبان میں ہر ایک علم
پڑھنے کی ضرورت اور دقت دور ہو جائیگی۔ کیونکہ غیر زبان میں علم حاصل
کرنا واقعی نہایت مشکل کام ہے یہی وجہ ہے کہ ہم لوگ ۱۵ یا ۱۶ برس تک انگریزی
زبان پڑھنے کے بعد بھی اس کو اچھی طرح سے استعمال نہیں کر سکتے۔ انگریزی
زبان کی تعلیم ہماری ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ انگریزی
ایک زندہ اور زندگی بخش زبان ہے۔ اس کو پڑھکر مردہ سے مردہ آدمی
کے خون میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر ہمارے لئے یہ بھی ضروری ہے
کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ اپنی مادری زبان کو بھی اچھی طرح پڑھیں اور
لکھیں تاکہ رفتہ رفتہ ہماری زبان بھی ویسی ہی زبردست اور خوبصورت
ہو جائے جیسی کہ آجکل انگریزی زبان ہے۔ مبارک تھے مسٹر راناڈے
کہ انہوں نے یہہ ضرورت محسوس کی اور اپنی عمر کا آخری حصہ اس کوشش

ہیں صرف کیا۔ جو تحریک انہوں نے قایم کی وہ اب تک زندہ ہے اور ضرور کامیاب ہوگی ÷

۲۔ ورنیکولر زبانوں کی وکالت کے علاوہ مسٹر رانادے نے بمبئی یونیورسٹی کے امتحانوں کے متعلق یہ قاعدہ جاری کرانے کی کوشش کی۔ کہ اگر کوئی طالبعلم کسی امتحان میں چند مضمونوں میں پاس ہوجائے اور باقیوں میں پاس نہ ہو تو آیندہ صرف ان مضمونوں میں اس کا امتحان ہونا چاہیئے جن میں وہ ناکامیاب ہوا تھا کُل مضمونوں میں اس کا امتحان نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ اصول انصاف اور عقل پر مبنی ہے۔ ولایت کے امتحانوں میں اس اصول پر عمل ہوتا ہے باوجود یکہ وہاں امتحان صرف تین تین مہینہ کے بعد ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں سال بھر سے پہلے کوئی امتحان نہیں ہوتا اور چونکہ یہاں بار بار کل مضامین میں امتحان دینا پڑتا ہے طالب علموں کو بعض اوقات ایک امتحان پاس کرنے میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ ایک سال وہ کسی مضمون میں ناکامیاب ہوتے ہیں دوسرے سال کسی اور مضمون میں ناکامیاب ہوجاتے ہیں۔ اس طریقہ سے طالب علموں کو بہت نقصان ہوتا ہے۔ اور کئی نوجوان مایوس ہو کر لکھنا پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ہندوستان کے امتحانوں میں کامیابی کے لئے بمقابلہ ولایت کے زیادہ نمبر حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لئے جو طالب علم ہندوستان کے امتحانوں میں ناکامیاب ہوجاتے ہیں وہ درحقیقت سب نالایق نہیں ہوتے بلکہ یہاں کے طریقہ تعلیم کی غلطیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ ولایت جاکر وہی لوگ آسانی سے بڑی بڑی یونیورسٹیوں کی ڈگری حاصل کر لیتے ہیں۔ مگر ہر ایک شخص اتنا امیر نہیں ہوتا کہ ولایت کی

تعلیم کا خرچ برداشت کر سکے۔ اس لئے بہت سے نوجوان یہاں کے امتحانوں میں چند سال ناکامیاب ہو کر ادھوری تعلیم کے ساتھ کالج سے رخصت ہوتے ہیں۔ کوئی یونیورسٹی اس دقت کے دور کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ مسٹر راناڈے نے اس دقت کو محسوس کیا اور بڑے زور شور سے اس کے خراب نتائج بیان کئے۔ انہوں نے ظاہر کیا کہ یہ دقت انگلینڈ۔ سکاٹ لینڈ اور مدراس احاطہ میں موجود نہیں اور پھر بھی وہاں کی تعلیم بہت اچھی ہوتی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ بمبئی احاطہ میں طالب علموں کا دوبارہ ان مضمونوں میں بھی امتحان لیا جائے جن میں وہ پہلے کامیاب ہو چکے ہیں۔ موجودہ طریقہ تعلیم اور طریقہ امتحان سے کریم (طوطے کی طرح حفظ یاد کرنے کی عادت) کو بڑی مدد ملتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ انگریزی افسر اور انگریزی اخبارات کے اڈیٹر جو ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگوں کی نالائقی پر ہمیشہ بڑا زور دیتے ہیں۔ مسٹر راناڈے کی تجویز کے خلاف ہو گئے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ درحقیقت عمدہ طریقہ تعلیم کو اس ملک میں جاری کرنا نہیں چاہتے۔ وہ ورنیکولر زبانوں کو اعلٰے امتحانوں میں داخل کرنے کے خلاف یہ اعتراض پیش کرتے تھے کہ طالب علموں کو زیادہ مضمون پڑھنے پڑینگے۔ تجویز زیر بحث کے خلاف وہ یہ اعتراض کرنے لگے کہ اگر طالبعلموں کو باقساط امتحان پاس کرنے کی اجازت ہو گئی تو امتحان آسان ہو جائینگے اور ہر ایک نالائق شخص بھی امتحانوں کو پاس کر سکے گا۔ یہ اعتراض بالکل بیہودہ تھا کیونکہ امتحان کی غرض یہ ہے کہ کسی مضمون میں طالب علم کی واقفیت کا اندازہ لگایا جائے۔ مسٹر راناڈے کی تجویز سے یہ غرض گم نہیں ہوتی تھی۔

مگر خوئے بد را بہانہ بسیار - انگریزی اخباروں نے اس تجویز کی سخت مخالفت
کی اور گورنمنٹ نے یہ تجویز منظور کر لی تھی - مگر گورنر بمبئی نے بحیثیت چانسلر
اسے نامنظور کر دیا - اور اپنے عمل سے لوگوں پر ثابت کر دیا کہ انگریزی افسر
ہندوستانیوں کی دقتوں کو بالکل محسوس نہیں کرتے - ورنہ مسٹر راناڈے کی
تجویز میں ایسی کیا غیر معمولی اور خلاف عقل بات تھی کہ چانسلر اس کو منظور کرنے
سے گریز کرتا تھا - مسٹر راناڈے جیسے عقلمند اور لایق شخص کی وکالت اس
بات کے لئے کافی تھی کہ ان کی تجویز پر فوراً عمل کیا جاتا - اگر چار پانچ سال کے تجربہ
کے بعد کوئی خاص نقص ظاہر ہوتا تو اس پر غور ہو سکتا تھا - اس عمل سے
لوگوں کو اطمینان ہو جاتا کہ ہمارے حکام ہماری تکالیف کو دور کرنے کی کوشش
کرتے ہیں - مگر بدقسمتی سے ہندوستانیوں کی رائے اور دلی خواہش کی
قدر کم ہوتی ہے - اس لئے مسٹر راناڈے اس معاملہ میں ناکامیاب رہے ؛

۳ - آجکل ہم کو تمام علوم انگریزی زبان میں پڑھنے پڑتے ہیں - جغرافیہ -
تاریخ - حساب مساحت - الجبرا - اقلیدس - سائنس - فلاسفی وغیرہ کی کتابیں
انگریزی میں موجود ہیں اور مڈل کی جماعتوں سے لیکر ایم - اے تک انگریزی
میں سبق پڑھے جاتے ہیں - اور امتحانوں میں جواب بھی انگریزی زبان میں
ہی دیئے جاتے ہیں - پیشہ ڈاکٹری - وکالت اور انجنیری کا بھی یہی حال ہے -
لکھنا پڑھنا سوال اور جواب سب انگریزی زبان میں ہوتا ہے - چونکہ یہ
زبان بڑی مشکل ہے - اس لئے ان امتحانوں میں کامیاب ہونے کے لئے
طالب علموں کو بڑی سخت محنت کرنی پڑتی ہے - اس محنت سے طالب علموں
کے جسم پر بڑا خراب اثر پڑتا ہے - اس کے علاوہ ایک اور دقت یہ ہے

کہ ہر ایک امتحان میں طالب علموں کو کئی کئی مضامین کا پڑھنا ضروری ہے اس وجہ سے محنت کا بوجھ زیادہ ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی امتحانوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ پنجاب میں وکالت کے لئے پہلے تین امتحان تھے۔ ابتدائی امتحان۔ مختاری اور وکالت + اب ابتدائی امتحان جاتا رہا ہے مگر بہت سے نوجوانوں کا روپیہ اور وقت کئی سالوں تک ضائع کرنے کے بعد + ڈاکٹری میں دو امتحان ہیں ابتدائی اور آخری۔ حالانکہ ابتدائی امتحان پاس کرنے سے کسی قسم کا رتبہ حاصل نہیں ہوتا + کالجوں میں فسٹ آرٹس کا امتحان کوئی خاص مطلب حل نہیں کرتا۔ ولایت میں یہ ایک معمولی امتحان ہے جس کو طالب علم گھر پر مطالعہ کرنے کے بعد یا کالج میں چھ ماہ پڑھنے کے بعد آسانی سے پاس کر لیتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے امتحان انٹرنس کے برابر شکل ہوتا ہے + مگر ہندوستان کے فرسٹ آرٹس میں طالب علم صرف اس وقت شریک ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد دو سال تک کسی کالج میں پڑھ چکے اور امتحان اکثر ایسا مشکل ہوتا ہے کہ باوجود دو سال کی محنت کے بھی بہت سے طالب علم ناکامیاب رہ جاتے ہیں ولایت میں بی۔ اے کے امتحان کے لئے صرف ایک مضمون پڑھنا پڑتا ہے۔ مگر ہندوستان میں تین مضمون پڑھنے پڑتے ہیں۔ حالانکہ ولایت میں تعلیم انگریزوں کی مادری زبان میں ہوتی ہے تاہم امتحان پاس کرنے کے لئے وہاں ہر ایک قسم کی سہولیت دیجاتی ہے۔ مگر ہندوستان میں طالب علموں کے راستہ میں بشمار دقتیں ہیں۔ غیر زبان کی تعلیم۔ امتحانوں کی کثرت۔ امتحانوں کے مضمونوں کی زیادتی اور قاعدوں کی سختی۔ یہ سب

مل کر بیچارے ہندوستانی طالب علم کی زندگی تلخ کر دیتے ہیں۔ باوجود ان دقتوں کے ہمارے ہزاروں نوجوان بڑی عمدگی سے امتحان پاس کرتے ہیں۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ اگر یہ دقتیں موجود نہ ہوتیں تو تعلیم کو ہمارے ملک میں بہت زیادہ ترقی ہوتی۔ جو نوجوان اب امتحان پاس کر کے کالجوں سے نکلتے ہیں ان کی جسمانی حالت اچھی نہیں ہوتی۔ کسی کا پھیپھڑا خراب ہوتا ہے کسی کی بینائی خراب ہوتی ہے کسی کا دماغ چکراتا ہے۔ اُن میں سے بہت تو اس بات کی قسم کھا لیتے ہیں کہ کالج میں خوب مغز خالی کر لیا اب کتاب کی شکل نہیں دیکھیں گے۔ باوجود اس نیت کے یہ لوگ دس پندرہ برس تک دنیا کا کاروبار کر نیکے بعد کمزور ہو جاتے ہیں اور کسی کام کے لائق نہیں رہتے صرف چند آدمی ایسے ہوتے ہیں جو کالج سے نکل کر بھی کتاب بینی کا شوق جاری رکھتے ہیں۔ ایسے آدمی بہت ہی کم ہیں جنہوں نے کوئی کتاب لکھی ہو کیونکہ کتاب وہی شخص لکھ سکتا ہے جس میں کچھ قابلیت ہو۔ اگر آپ کا مطالعہ اور واقفیت بہت کم ہے تو آپ کے لئے کسی عمدہ کتاب کا تصنیف کرنا نہایت مشکل ہے۔ ہمارے ملک میں اس وقت ہزاروں ایم۔ اے بی۔ اے ہزاروں وکیل اور ڈاکٹر ہیں مگر اُن میں سے کتنے آدمیوں نے کوئی قابل قدر کتاب لکھی ہے۔ اس کمی اور نقص کو انگریز اور ہندوستانی سب محسوس کرتے ہیں۔ میری رائے میں انگریز صاحبان کو کوئی وجہ شکایت کی نہیں۔ ہندوستان کا موجودہ سلسلہ تعلیم انہوں نے ہی جاری کیا ہے۔ کالجوں میں بڑے بڑے تنخواہ دار انگریز پروفیسر تعلیم دینے کے لئے مقرر ہیں۔ یونیورسٹیوں میں جو کچھ ہوتا ہے انگریزی ممبروں کی رائے کے مطابق ہوتا ہے۔ باوجود

اس بات کے اگر ہندوستانی تعلیم یافتہ لوگ نالایق رہتے ہیں تو انگریزوں کا قصور ہے ہندوستانیوں کا قصور نہیں۔ کیونکہ ہندوستانیوں کی نیچر میں ایسا کوئی نقص نہیں ہے جو ان کو لایق بننے سے روکے۔ ولایت میں لایق ہندوستانیوں نے انگریزوں کے برابر اور کبھی کبھی اُن سے بہتر کامیابی حاصل کی ہے اس لئے اگر ہندوستان کا سلسلہ تعلیم ہندوستانیوں کو لایق نہیں بناتا تو اُن کا قصور ہے جنہوں نے یہ سلسلہ تعلیم جاری کیا اور جن کے ہاتھ میں ہماری تعلیم ہے۔ اور جو واقف کار اہل ہند کی نکتہ چینی کی قطعی پرواہ نہیں کرتے انگریزوں کی نکتہ چینی اکثر اوقات اس نیت سے ہوتی ہے کہ ہندوستانی طالبعلموں کی نالایقی ثابت ہو۔ اہل ہند کی نکتہ چینی اس غرض سے ہوتی ہے کہ موجودہ نقص دور کئے جائیں۔
ڈاکٹر بھنڈارکر صاحب بمبئی احاطہ میں سنسکرت کے مشہور فاضل ہیں۔ وہ پہلے سرکاری کالج میں سنسکرت زبان کے پروفیسر تھے۔ اب پنشن پاتے ہیں گورنمنٹ ان کی بڑی قدر کرتی ہے اور گو مسٹر رانا ڈے کو گورنمنٹ نے یونیورسٹی کا وایس چانسلر نہ بنایا۔ مگر ڈاکٹر بھنڈارکر کو یہ عالی رتبہ دیا گیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی رائے ہمیشہ گورنمنٹ کی رائے کے مطابق ہوتی ہے اور وہ اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ گورنمنٹ کی کارروائی کی نکتہ چینی سے پرہیز کر کے سوشل ریفارم اور دھارمک ریفارم کی طرف متوجہ ہوں۔ انہوں نے ۱۸۹۴ء میں بہ حیثیت وایس چانسلر بمبئی یونیورسٹی کی کانوکیشن کے موقعہ پر جو تقریر کی اس میں فرمایا کہ گو ہندو تعلیم یافتہ لوگوں میں بہ مقابلہ پارسیوں کے زیادہ موتیں ہوتی ہیں مگر اس کا سبب تعلیم کی سختی نہیں ہے جیسا کہ لوگوں کا عام خیال ہے بلکہ یہ زیادہ موتیں اس وجہ سے ہوتی ہیں کہ ہندوؤں کے

رواج خراب ہیں۔ ان کی خوراک اچھی نہیں اور وہ تازہ ہوا میں ورزش کرنے کے بجائے اس بات کے عادی ہیں کہ ہمیشہ اپنے گھروں میں چپ چاپ بیٹھے رہیں۔ ڈاکٹر بھنڈارکر نے یہ بھی شکایت کی کہ بمبئی کے تعلیم یافتہ آدمی امتحان پاس کرنے کے بعد کسی خاص مضمون کا مطالعہ نہیں کرتے اور ان کو کتابی کام سے کچھ دلچسپی نہیں ہوتی۔ مسٹر راناڈے ڈاکٹر بھنڈارکر کے دوست تھے اور ہمیشہ یونیورسٹی تعلیم کے فایدے اور نقصان پر غور کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر بھنڈارکر کے اعتراضات پر غور کرنے کے بعد ۱۵ اپریل ۹۴ء کو بمبئی کی گریجوئیٹس ایسوسی ایشن میں ایک سپیچ دی جس میں انہوں نے تعلیم کے مسلہ پر اپنی رائے بڑے زور شور سے ظاہر کی اور نکتہ چینیوں کے اعتراضات کا اچھی طرح جواب دیا +

مسٹر راناڈے نے اپنی تقریر ان الفاظ سے شروع کی تھی :-

دو صاحبان۔ بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ گریجوئیٹس ایسوسی ایشن جیسی سبھائیں حکام وقت کے نقص ظاہر کرنے کی زیادہ کوشش کرتی ہیں مگر اپنی کمزوریوں سے بالکل ناواقف ہیں۔ ایک وایسرائے صاحب نے فرمایا ہے کہ ملک میں نافرمانی اور بےچینی کے خیالات پھیل رہے ہیں۔ مغربی تعلیم سے اہل ہند کا سر پھر گیا ہے اور تعلیم یافتہ لوگوں کا دماغ ٹھکانہ پر نہیں رہا۔ کلکتہ مدراس اور الہ آباد یونیورسٹی کے سالانہ جلسوں میں بھی وایسرائے صاحب کی مذکورہ بالا رائے کی تائید ہوئی ہے۔ ہمارے ایک سندھی دوست شکایت کرتے ہیں کہ ہندوستان کے سکول اور کالجوں میں طالب علموں کی زندگی ویسی دلچسپ نہیں ہوتی جیسی کہ انگلستان میں ہے۔ بمبئی کے ایک فصیح

پادری صاحب نے فرمایا ہے کہ جو لوگ آزادی چاہتے ہیں۔ مگر قانون کی پابندی کرنا نہیں چاہتے وہ سراسر غلطی پر ہیں کیونکہ قانون کی پابندی ایک ضروری شرط آزادی کی ہے۔ ڈاکٹر ملر صاحب جو مدراس کے لایق پادری اور وہاں کے عیسائی کالج کے پرنسپل ہیں فرماتے ہیں کہ ہندوستانیوں کا کیریکٹر کمزور ہے۔ کیونکہ ہم اہل ہند چھوٹی عمر میں تابعداری کی سخت تربیت حاصل کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ بمبئی یونیورسٹی کے لایق وایس چینسلر (ڈاکٹر بھنڈارکر سے مراد ہے) مشورہ دیتے ہیں کہ ہم کو انگریزی پالیٹکس کے خوشنما الفاظ کے جادو سے بچنا چاہئے تاکہ یہ نہ ہو کہ خیالی باتوں کے تعاقب میں مشغول ہو کر ہم اپنے کیریکٹر کو مضبوط کرنے سے رہ جائیں اور اپنی کمزوریوں سے غافل ہو جائیں۔ میری رائے میں یہ سب نیک نیت نکتہ چین ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں اور اُن کے مشورہ کے مطابق اس موقع پر ہم پالیٹکس کو چھوڑ کر اپنی اندرونی حالت پر غور کریں گے۔ جو خطرے ہمارے راستہ میں حایل ہیں ان پر نظر ڈالینگے اور جو واقعات ہماری امیدوں کو بڑھانے والے اُن کا بھی ذکر کرینگے۔" اس تمہید کے بعد مسٹر رانادے نے فرمایا کہ "ڈاکٹر بھنڈارکر نے بحیثیت وایس چینسلر جو لیکچر دیا ہے وہ ایسا دلچسپ ہے کہ تمام تعلیم یافتہ لوگ اس کا چرچا کر رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس لیکچر پر یاس اور ناامیدی کا رنگ چڑھا ہوا ہے اور فاضل لیکچرار نے اس میں چند ایسے متنازعہ مضامین پر (اہل ہندوستان کی پولٹیکل جدوجہد سے مراد ہے) بحث کی ہے۔ جن کا کانوکیشن ایڈریس میں ذکر کرنا بالکل نامناسب تھا"۔ بڑی شکایت ڈاکٹر بھنڈارکر کی یہ تھی کہ ہندوؤں کے رسم و رواج ایسے خراب ہیں کہ تعلیم یافتہ

ہندو جلد مرجاتے ہیں اور تعلیم یافتہ لوگ دنیا کے کاروبار میں داخل ہونے
کے بعد مطالعہ کا شوق قایم نہیں رکھتے۔ مسٹر راناڈے نے چار سو دوستوں
کو خط لکھے اور اُن سے دریافت کیا کہ ڈاکٹر بھنڈارکر کی شکایت کہاں
تک درست ہے۔ ۱۴۰ شخصوں نے اُن کے خط کا جواب دیا۔ یہ جواب
گودھرا۔ برودا۔ شولاپور۔ رتناگری۔ بھونگر۔ احمدآباد۔ اندور۔ بیلگام
۔امراوتی۔ بمبئی۔ پونا۔ کولہاپور۔ کراچی۔ جوناگڑھ۔ دھولیا۔ ہوشنگ آباد۔
دھارور۔ گوالیار۔ اوجین۔ اور شکارپور وغیرہ مقامات سے آیا تھا جہاں کہ
خیرخواہان تعلیم نے عام جلسوں میں مشورہ کرنے کے بعد مسٹر راناڈے کے
سوالات کا جواب دیا تھا۔ اور اپنی رائے کی تائید میں واقعات پیش کئے
تھے۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ڈگری یافتہ لوگوں میں کتنے فیصدی آدمی بوقت
(یعنے ۲۰ سال کی عمر سے ۴۰ سال کی عمر تک) مرتے ہیں مسٹر راناڈے نے بمبئی
یونیورسٹی کے شروع سے سنہ ۹۳ء کے آخر تک یعنے تیس سال کے مختلف
ڈگری یافتہ اشخاص کی موت کا۔ عیسائیوں۔ مسلمانوں اور سندھیوں کو چھوڑ
کر ایک نقشہ بنایا۔

اس نقشہ سے ثابت ہے کہ سب سے کم موتیں ایل سی ای کی ڈگری
والوں (یعنے اسسٹنٹ انجنیروں) میں ہوئیں۔ بی۔ اے والوں میں ۷ فیصدی
ایل۔ ایم۔ ایس والوں میں ۷½ فیصدی۔ ایل۔ ایل۔ بی والوں میں ۸ فیصدی
موتیں ہوئیں۔ ایم۔ اے کی ڈگری والوں میں ۱۶ فیصدی اور ایم۔ اے ایل
ایل بی کی ڈگری والوں میں ۳۳ فیصدی موتیں ہوئیں۔ (۲) مرہٹوں اور
پارسیوں کے مقابلہ میں گجراتیوں کی موتیں بہت کم ہیں۔ اُن میں سنہ ۹۳ء تک کوئی

ایم۔ اے نہیں مرا حالانکہ ایم۔ اے پارسیوں میں ½ ۱۲ فیصدی موت تھی
(۳) کل موت کا اوسط پارسیوں میں ۴ فیصدی گجراتیوں میں ۵ فیصدی
اور مرہٹوں میں ۱۰ فیصدی تھا۔ (۴) مرہٹوں میں موت کا اوسط بہت زیادہ
تھا۔ ڈاکٹری میں ۱۹ فیصدی ایم۔ اے میں ۲۴ فیصدی۔ بی۔ اے میں
۹ فیصدی۔ ایل۔ ایل بی میں ½ ۸ فیصدی۔ کل اوسط ۱۰ فیصدی ہوا۔

مسٹر راناڈے کی رائے میں ڈاکٹر بھنڈارکر کا یہ کہنا کہ پارسیوں میں
اس وجہ سے موتیں کم تھیں کہ وہ کھلی ہوا میں ورزش زیادہ کرتے ہیں درست
نہ تھا کیونکہ پارسیوں میں ورزش اور کھیل کود کی عادت گذشتہ ۲۰ سال سے
جاری ہوئی ہے اور سنہ ۹۳ء میں بمبئی کے براہمنوں اور پارسیوں میں موت
برابر تھی یعنے ۲۳ فی ہزار۔

اس سے ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ مرہٹوں میں جو بہت زیادہ موت
ہوئی ہے اس کا سبب کوئی خاص بات ہونی چاہیئے۔ نہ کہ رسم و رواج
کا فرق اور ورزش کی عادت۔ مسٹر راناڈے کی رائے میں مرہٹہ ڈگری
یافتہ لوگوں کی بے وقت موت کا باعث (۱) ان کا غیر معمولی افلاس ہے۔
مرہٹہ برہمنوں کے لڑکے تعلیم حاصل کرنے کی بڑی کوشش کرتے ہیں مگر
بمقابلہ گجراتیوں اور پارسیوں کے وہ زیادہ غریب ہوتے ہیں۔ گجراتیوں
میں غریب برہمن تعلیم کی طرف کم توجہ کرتے ہیں اور جو لوگ تعلیم حاصل
کرتے ہیں ان کی مالی حالت اچھی ہوتی ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے
مرہٹے برہمن زیادہ غریب ہوتے ہیں اور نصف سے زیادہ ڈگری یافتہ
مرہٹوں کی قبل از وقت موت صرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ چھوٹی عمر میں

وہ نہایت غریب تھے اور ان کے جسم کی پرورش اچھی طرح نہیں ہوئی۔ ساٹھ مرہٹہ گریجوئیٹس کی موت اوسطاً ۳۵ سال کی عمر میں ہوئی جس سے ظاہر ہے کہ وہ لوگ کالج چھوڑنیکے دس سال کے اندر مر گئے۔ اگر ان ساٹھ موتوں کو نظر انداز کیا جائے تو گجراتیوں اور مرہٹوں میں موتوں کی تعداد قریباً برابر معلوم ہوتی ہے *

(۲) غربت کے سوا غیر زبان میں سخت امتحانوں کا پاس کرنا بھی طالب علموں کی صحت کو بہت خراب کرتا ہے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں مگر ان کی رائے میں امتحانوں کا سخت ہونا اس لئے ضروری ہے کہ طالب علموں کو اپنے کورس کی بہت اچھی واقفیت ہو۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس بات پر غور نہیں کرتے کہ یورپ میں بی۔ اے کے پاس ڈگری کا امتحان سخت نہیں ہوتا۔ صرف آنرز کے امتحان میں خاص خاص مضمون میں زیادہ واقفیت کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ پاس ڈگری کے لئے اعلےٰ درجہ کی واقفیت ضروری نہیں سمجھی جاتی۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں امتحان معمولی طور پر سخت ہوتے ہیں اور پھر بھی اگر چھ مضامین سے ایک مضمون میں کوئی طالب علم فیل ہو جائے تو جن پانچ میں وہ پاس ہوا ہے۔ انکی بابت اس سے کوئی رعایت نہیں کیجاتی بلکہ سال بھر کے بعد کل چھ مضمونوں میں دوبارہ اسکا امتحان لیا جاتا ہے یہ قاعدہ بھی امتحانوں کی سختی کو بڑھاتا ہے۔ اور کتابوں کو حفظ یاد کرنیکی عادت کو ترقی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر یک مضمون کے کورس میں کتابوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ نہ طالب علم ان کو وقت مقررہ میں اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں اور نہ پروفیسر ان کو خاطر خواہ طور پر پڑھا سکتے ہیں۔ ہر ایک شخص اس سختی کی شکایت کرتا

ہے اور احاطہ بمبئی کے کالجوں میں جس قدر ہندوستانی پروفیسر ہیں اس شکایت کی تصدیق کرتے ہیں +

(۳) سخت امتحان ۔ زیادہ امتحان ۔ زیادہ مضامین اور زیادہ کتابیں ہر ایک طالب علم کے ہوش اُڑا دیتی ہیں ۔ اور چونکہ طالب علم کالجوں ہی میں تھک جاتے ہیں وہ کالج چھوڑنے کے بعد دنیا کے کاروبار میں داخل ہو کر کتابوں کا مطالعہ جاری نہیں رکھتے ۔ لوگ استادوں کی شکایت کرتے ہیں ۔ استاد طالب علموں کی شکایت کرتے ہیں مگر سچ پوچھو تو دونوں میں سے کسی کا قصور نہیں قصور طریقہ تعلیم کا ہے جو طالب علموں کو ذرا بھی آرام لینے نہیں دیتا ۔ تعلیم کے نگہبانوں کا یہ خیال ہے کہ طالب علم یونیورسٹی کے واسطے بنائے گئے ہیں یونیورسٹی طالب علموں کے آرام اور فایدے کے لئے نہیں بنائی گئی ۔ اور نہ یونیورسٹی کا یہ فرض ہے کہ طالب علموں کی ضروریات کے مطابق اپنے قاعدوں میں تبدیلی کرے ۔ اس انتظام کا نتیجہ یہ ہے کہ طالب علموں پر یونیورسٹی اتنا بوجھ ڈالتی ہے کہ وہ اس بوجھ کو اپنے سر سے اتارنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں ۔ اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کالج سے نکلکر پھر کتابوں کی شکل نہ دیکھیں ۔ مسٹر راناڈے نے فرمایا کہ ہندوؤں کے رسم و رواج اور عادات میں جو نقص ہیں اُن کو ہر ایک شخص خوشی سے تسلیم کرتا ہے مگر ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی دماغی کمزوری کا باعث زیادہ تر طریقہ تعلیم کی سختی ہے باوجود ان نقصوں کے ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی کامیابی قابل قدر ہے ۔ درحقیقت تعجب یہ نہیں کہ مطالعہ اور تحقیقات کے معاملہ میں وہ کم کوشش کرتے ہیں ۔ تعجب یہ ہے کہ باوجود اتنی مشکلات کے ہمارے ڈگری یافتہ آدمیوں میں

کتنے ہی ایسے ہیں جنہوں نے خاص مضامین کا مطالعہ کر کے دنیا میں شہرت حاصل کی ہے ان میں سے مرہٹہ قوم کے وہ لوگ جنہوں نے عمدہ کتابیں لکھی ہیں خاص عزت کے مستحق ہیں ÷

موجودہ نتائج پر غور کرنے کے بعد بہت سے صاحبان کی یہ رائے ہے کہ غریب لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے سرشتہ تعلیم کی بھی یہی رائے ہے۔ مگر ہندوستان کے باشندوں کی یہ رائے نہیں۔ اس ملک میں ہمیشہ سے غریب آدمی تعلیم کے مستحق سمجھے گئے ہیں اور انہوں نے تعلیم حاصل کر کے ملک کو بڑا فایدہ پہنچایا ہے ÷

آیندہ کے لئے تجویز

(۱) افلاس دور کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی طالب علم اپنی تعلیم ختم کرنے سے پیشتر شادی نہ کرے۔ اس غرض سے کنوارے طالبعلموں کو وظیفے دیئے جائیں تو بہتر ہے۔ علاوہ ازیں سب طالب علموں کو بورڈنگ ہوس میں رہ کر حصول تعلیم کے ساتھ ورزش بھی کرنی چاہئے اور جو طالبعلم تعلیم اور ورزش میں اچھے رہیں ان کو انعام ملنا چاہئے۔

(۲) امتحانوں کی تعداد اور سختی اور ان کے کورس کے مضامین اور کتابیں کم ہونی چاہئیں۔ موجودہ سختی نے نہایت خراب نتائج پیدا کئے ہیں۔ اور اگر ہم آیندہ ترقی کرنا چاہتے ہیں تو موجودہ طریقہ تعلیم میں تبدیلی کرنا نہایت ضروری ہے ÷

(۳) اس کے سوا یونیورسٹی کو اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ اپنے

گریجویٹس سے تعلق قایم رکھے - بی - اے اور ایم - اے لوگ مختلف مقامات میں کاروبار کرتے ہیں یونیورسٹی کو چاہیئے کہ وہ ایسی لائبریری قایم کرے جہاں سے وہ لوگ تھوڑے خرچ پر عمدہ عمدہ کتابیں مطالعہ کے واسطے لے سکیں +

(۴) آخری تجویز مسٹر رانادے کی یہ تھی کہ پرانے بی - اے اور ایم - اے صاحبان کو چاہیئے کہ گجراتی اور مرہٹی زبان میں تصنیفات کی تعداد بڑھانے کے لئے ایک کمیٹی بنادیں اور نوجوان مصنفوں کی مدد کریں - اور ان کو خطاب وغیرہ عطا کریں - یہ تجاویز پیش کر کے مسٹر رانادے نے فرمایا کہ سب خیر خواہان ملک کو ان تجاویز پر غور کرنی چاہیئے کیونکہ جن معاملات پر انہوں نے بحث کی تھی وہ ایسے تھے جن کے ساتھ ملک کا نفع نقصان اچھی طرح سے وابستہ ہے +

موجودہ طریقہ تعلیم کی نسبت یہ خیالات مسٹر رانادے کے تھے - ہر ایک حصہ ملک میں اس مضمون پر غور ہو رہی ہے - شاید ہی کوئی شخص ہو جسے مسٹر رانادے کے خیالات سے اختلاف ہے - کیونکہ ہر ایک مضمون پر اُن کی رائے بڑی سوچ اور فکر کے بعد قایم ہوتی تھی - مسٹر رانادے سوشل ریفارم کے خلاف نہ تھے بلکہ ان کی تمام عمر اس کوشش میں گذری کہ ہندو سوسائٹی کے رسم و رواج بہ تدریج بدل کر ایسے ہو جائیں کہ ہندو سوسائٹی آسانی سے موجودہ جد و جہد میں ترقی کر سکے - اُن کو ڈاکٹر بھنڈارکر سے اس بات میں اختلاف نہ تھا کہ ہندوؤں کے رواج میں تبدیلی ضروری ہے اسی وجہ سے انہوں نے اپنی مذکورہ بالا سپیچ میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ امتحان سخت ہوتے ہیں طالبعلموں

کو اپنی تعلیم ختم کرنے سے پیشتر شادی سے پرہیز کرنا چاہئے۔ مگر وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف تھے کہ یونیورسٹی کے کارکن اپنے اعلےٰ رتبہ کے زعم میں ملک کے حالات نظر انداز کرتے ہیں۔ طالب علموں کی اصلی ضروریات پر توجہ نہیں کرتے اور نہ اس بات کی پرواہ کرتے ہیں کہ طالب علموں کی ترقی کے راستہ سے ناجائز رکاوٹیں دور ہوں۔ بلکہ ان کی یہہ کوشش ہوتی ہے کہ طالب علم آسانی سے ترقی نہ کریں۔ اس میں شک نہیں کہ انگلستان میں چند امتحان مشکل بھی ہوتے ہیں۔ مگر جو شخص خاص عزت چاہتا ہے اس بات کی شکایت نہیں کر سکتا کہ اسے سخت امتحان پاس کرنا پڑتا ہے۔ ہر ایک آدمی اس بات کا مستحق ہے کہ چند سال یونیورسٹی میں رہ کر اور اس کی آب و ہوا اور تہذیب کا رنگ لیکر دنیا میں داخل ہو مگر ہر شخص کو سخت امتحانوں میں شامل ہونے پر مجبور کرنے سے یہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے انگلستان میں بہت لایق طالبعلموں کیلئے مشکل امتحان مقرر ہیں۔ الا اوسط درجہ کی لیاقت کے طالبعلموں کیلئے معمولی امتحان ہیں۔ جو شخص زیادہ مشکل امتحان پاس کرتا ہے اسکی زیادہ عزت ہوتی ہے اور دوسروں کی معمولی عزت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں سب کیلئے ایک ہی طرح کے سخت امتحان مقرر ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باوجود اچھی محنت کے ۲۰ یا ۲۵ فیصدی سے زیادہ طالبعلم بی۔ اے امتحان میں پاس نہیں ہوتے۔ گورنمنٹ پرائیویٹ کالجوں پر اعتراض کرتی ہے کہ ان کے سٹاف پر لایق پروفیسر مقرر نہیں ہوتے گورنمنٹ کالجوں میں گو لایق انگریز پروفیسر ہوتے ہیں اور ان کی تنخواہیں بھی بڑی بڑی ہوتی ہیں مگر ان کا نتیجہ اکثر ویسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ پرائیویٹ کالجوں کا۔ اکثر پرائیویٹ کالج انکو شکست دیدیتے ہیں۔ چونکہ گورنمنٹ کالجوں کے

پروفیسروں کو امتحانوں کے خراب نتیجہ پر سرزنش نہیں ہوتی وہ اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ طریقہ تعلیم میں سے نقص دور ہوں +

لاہور میڈیکل کالج کا سالانہ امتحان کئی سال سے جون کے مہینہ میں ہوتا رہا ہے۔ جون میں لاہور کی گرمی زوروں پر ہوتی ہے طالب علموں کو اس مہینہ میں امتحان کی تیاری کرنا وبال جان ہے۔ انہوں نے بہتیرا سر پٹیا کہ بجائے جون کے مارچ یا اپریل میں امتحان ہوا کرے مگر چونکہ انگریزی پروفیسروں کو جون کے امتحان کے بعد رخصت مل جاتی تھی وہ آسانی سے ولایت یا دوسرے مقامات میں چلے جاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے طالب علموں کی عرضداشت کی سخت مخالفت کی۔ طالب علموں کو تکلیف ہوتی رہے مگر پروفیسروں کو تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ اب سنا گیا ہے کہ بجائے جون کے میڈیکل امتحان مئی کے مہینہ میں ہوا کریں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہندوستان میں انگریزی پروفیسر صاحبان اپنے شاگردوں کے آرام کی بہت کم پرواہ کرتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ امتحانوں کی سختی دور کرانے کی کوشش نہیں کرتے حالانکہ یونیورسٹی کا کل انتظام قریب قریب اُن کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ بسا اوقات ہندوستانی طالب علموں کی نالائقی کی شکایت کرتے ہیں۔ ان بیچاروں پر طریقہ تعلیم کی سختی کا ویسا ہی اثر ہوتا ہے جیسا کہ گنے پر کلہاڑی میں ڈالنے سے ہوتا ہے۔ تمام رس اس کا نکل جاتا ہے اور صرف بیجان اور نکمی لکڑی باقی رہ جاتی ہے۔ اس حالت کو مسٹر رانا ڈے اچھی طرح جانتے تھے اور اس وجہ سے انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ طریقہ تعلیم کی سختی کم کی جائے +

(۴) مذکورہ بالا کوشش کے علاوہ مسٹر رانا ڈے نے تعلیم کے کام کو

اور کئی طرح سے فایدہ پہنچایا۔ سر منگل داس نتھو بھائی جو بمبئی کے مشہور ساہوکار تھے وصیت کر گئے کہ ان کی جایداد میں سے بمبئی یونیورسٹی کو بہت سا روپیہ دیا جائے۔ سر منگل داس کے وارثان اس وصیت کو ناجایز ثابت کرنے کے لئے مقدمہ بازی کرنا چاہتے تھے۔ مگر مسٹر راناڈے نے ان کی ایسی دلداری کی اور ان کو ایسی خوش اسلوبی سے سمجھایا کہ انہوں نے خوشی سے ۳½ لاکھ روپیہ سر منگل داس کی جایداد میں سے یونیورسٹی کو دیدیا۔ اور اس روپیہ میں سے ان طالب علموں کے لئے جو صنعت وحرفت سیکھنے کے لئے یورپ جانے کو تیار ہوں وظیفے مقرر کئے گئے۔

(۵) بمبئی کے مشہور پارسی تاجر مسٹر ٹاٹا نے ۳۰ لاکھ روپیہ گورنمنٹ کو اس غرض سے دیا ہے کہ سایئنس کی مختلف شاخوں میں تحقیقات کرنے کے لئے ایم۔ اے یا بی۔ اے کی ڈگری یافتہ نوجوانوں کو وظیفے دیئے جائیں اور ایک بڑا درس گاہ قایم کیا جائے جہاں وہ نوجوان لایق استادوں کی زیر ہدایت سائنس کی تحقیقات میں مشغول ہو کر اپنی معلومات بڑھائیں۔ مسٹر راناڈے اس تجویز کے بڑے مددگار تھے ان کی خط وکتابت دیکھنے سے پتہ لگتا ہے کہ جتنا شوق مسٹر ٹاٹا اور ان کا سکرٹری مسٹر پادشاہ اس درس گاہ کے متعلق ظاہر کرتے تھے۔ ویسی ہی سچی دلچسپی مسٹر راناڈے کو اس (تجویز) سکیم سے تھی۔ گو یہ درس گاہ ابھی تک قایم نہیں ہوئی اور مسٹر راناڈے اور مسٹر ٹاٹا اپنی آنکھوں سے اس کو سرا بھرا نہ دیکھ سکے مگر امید ہے کہ گورنمنٹ ہند بہت جلد مسٹر ٹاٹا مرحوم کی دلی خواہش کو پورا کرنے میں کامیاب ہوگی۔ مسٹر راناڈے کی رائے میں ہندوستان میں ایسی درس گاہ کی بڑی سخت ضرورت تھی۔ مگر ان کو ایسا

کوئی سخی نہیں ملتا تھا جو ایک کثیر رقم اس ضرورت کو رفع کرنے کے لئے قوم کی خدمت میں پیش کرے۔ یوروپ اور امریکا میں امیر آدمی ایسے کام کے لئے لاکھوں روپے دیکر بڑے بڑے کالج قایم کرتے ہیں۔ مگر ہندوستان کے لوگ اکثر غریب ہیں اور ان میں سے جو امیر ہیں وہ شادی غمی کے موقع پر بیشمار روپیہ خرچ کرتے ہیں مگر تعلیم کے لئے دان دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ اس لئے مسٹر ٹاٹا کی ہمت اور بلند خیالی دیکھکر مسٹر راناڈے نہایت خوش ہوئے اور انہوں نے مسٹر ٹاٹا کے نیک ارادہ کو پختہ کرنے میں بڑی مدد دی +

اپنے ہموطنوں کی تعلیم بہتر کرنے کے لئے جو تجویزیں مسٹر راناڈے نے یونیورسٹی کے روبرو پیش کیں ان کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ مسٹر راناڈے صرف اوروں کو نصیحت کرنے والے ہی نہ تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیفات سے علمی تحقیقات کا اعلےٰ نمونہ اپنے ہموطنوں کے سامنے پیش کیا۔ ان کی تاریخ مرہٹہ اور راناڈین ایکانیمکس ان کے لیکچر جو سوشل کانفرنس میں دیئے گئے تھے اور آرٹیکل جو سروجنک سبھا کے اخبار میں شایع ہوئے ان کی وسیع واقفیت قابلیت۔ ذہانت اور محنت کو اچھی طرح ثابت کرتے ہیں۔ مرہٹہ تاریخ کی دوسری جلد لکھنے کے لئے وہ اپنی عمر کے آخری ۲ یا ۳ سال میں شاہو راجہ کے عہد کے شروع سے باجی راؤ دوم کے عہد کے آخر زمانہ تک کی ڈایریاں (روزنامچے) پڑھتے رہے۔ یہ امر اس دیباچہ سے ثابت ہوتا ہے جو ان ڈایریوں کے متعلق انہوں نے رایل ایشیاٹک سوسایٹی بمبئی کے روبرو پڑھا تھا۔ ان ڈایریوں کا پڑھنا بڑا مشکل کام تھا کیونکہ انگریزی خلاصہ کے ساتھ مل کر ان کی ضخامت دو ہزار صفحہ سے کم نہ تھی۔ مگر مسٹر راناڈے

اس محنت میں خوشی سے مشغول رہے۔ انہوں نے ۱۸۰۶-۱۸۰۸ء کا زمانہ اپنے مطالعہ کے لئے پسند کیا تھا اور مرہٹہ قوم کے عروج کا یہ سب سے اچھا زمانہ تھا۔ اگر وہ ۲ یا ۳ سال اور زندہ رہتے تو مرہٹہ تاریخ کی دوسری جلد مکمل کر جاتے جو دیباچہ انہوں نے رایل ایشیاٹک سوسائٹی کے روبرو پیش کیا تھا وہ نہایت مفید چیز ہے کیونکہ اس میں انہوں نے پیشواؤں کے دیوانی فوجداری اور مالی انتظام کی تصویر بڑی صفائی سے کھینچی ہے +

آخری وقت

مسٹر راناڈے اپنی عادات میں بڑے باقاعدہ تھے مگر باوجود احتیاط کے بیماری سے بچنا ان کے لئے بھی مشکل تھا۔ ان کی موت سے کئی سال پیشتر ڈاکٹر بھاؤ داجی مرحوم نے جو فن طبابت میں بڑا لایق تھا مسٹر راناڈے سے کہدیا تھا کہ آپ کا دل کمزور ہے اس پر زیادہ زور دینا مناسب نہیں۔ ۱۸۹۰ء کے آخر میں مسٹر راناڈے کو مرض اسہال نے سخت تکلیف دی۔ اس کے بعد ان کو دل دھڑکنے کی شکایت کبھی کبھی ہوتی رہی۔ جولائی ۱۹۰۰ء میں اسہال کے مرض نے ان کو غیر معمولی سختی سے آدبایا۔ ڈاکٹر سر بھال چندر کرشن نے دو تین دن میں انکو آرام کر دیا مگر چند دن کی بیماری سے وہ بہت کمزور ہو گئے۔ اور دل دھڑکنے کی تکلیف اتنی زیادہ ہو گئی کہ رات کے دس اور گیارہ بجے کے درمیان وہ اکثر بے چین رہتے تھے۔ دماغی محنت سے بچنے کی غرض سے اُنہوں نے شروع میں ایک مہینہ کی رخصت لی مگر اس سے کچھ

فایدہ نہ ہوا۔ تھوڑے دنوں کے لئے انہوں نے اپنا منصبی کام پھر سنبھالا
مگر ڈاکٹروں نے رائے دی کہ بمبئی سے باہر رہے بغیر آرام ہونا مشکل ہے
اس لئے انہوں نے، جنوری سنہ ۱۹۰۱ء سے چھ ماہ کی رخصت لے لی اور ان کی
جگہ ان کے دوست مسٹر چندا وارکر ہائیکورٹ کے جج مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں
کانگرس اور سوشل کانفرنس کا اجلاس لاہور میں ہوا تھا اہل پنجاب کو امید تھی
کہ مسٹر رانادے اس موقع پر لاہور آکر کانگرس اور کانفرنس کی رونق بڑھائینگے
ہر تعلیم یافتہ شخص اس بات کی خواہش کرتا تھا کہ مسٹر رانادے کی زیارت کرے اور
اُن کی تقریر سنے۔ اودھر مسٹر رانادے نے بھی لاہور آنے کی سب تیاریاں
کرلی تھیں اور ریل میں اول درجہ کا ایک کمرہ خاص اپنے لئے کرایہ لے لیا تھا
مگر روانگی کے دن ان کی طبیعت بہت ناساز ہوگئی اور ڈاکٹر نے ان کو لاہور
جانے سے روک دیا۔ جب لاہور میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ مسٹر رانادے تشریف
نہیں لائینگے تو سب کو رنج ہوا کیونکہ سنہ ۱۸۹۳ء کی کانگرس کے موقع پر مسٹر رانادے
نے لاہور میں جو تقریریں کی تھیں اُن سے تعلیم یافتہ پنجابیوں کو خاص لطف حاصل ہوا
تھا۔ لالہ دوارکا داس ایم اے جو آریہ سماج پنجاب کے رکن اعظم ہیں اُس وقت
انبالہ میں وکالت کرتے تھے۔ سنہ ۹۳ء کی کانگرس کے دنوں میں انہوں نے
دیانند اینگلو ویدک کالج میں سوامی دیانند سرسوتی کی زندگی اور مشن پر لیکچر دیا تھا
اس لیکچر میں مسٹر رانادے موجود تھے مگر ان کا لباس اور ان کی شکل ایسی سیدھی
سادھی تھی کہ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ مسٹر رانادے موجود ہیں جب لالہ لاجپت رائے
نے بیان کیا کہ بھائیو اس وقت اس جلسہ میں مسٹر رانادے موجود ہیں تو سب
لوگوں نے خوشی میں تالیاں بجائیں اور شوق سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ جب

لالہ دوارکا داس اپنی فصیح تقریر ختم کر چکے تو مسٹر رانا دے نے بھی چند کلمات اپنے عالمانہ طریقہ میں سوامی دیانند سرسوتی کی تعریف میں کہے۔ لالہ دوارکا داس نے اثناء تقریر میں شکایت کی تھی کہ سوامی دیانند پنجاب میں اس وجہ سے آئے کہ احاطہ بمبئی میں جس پر کہ ان کا خاص حق تھا ان کے خیالات کے ساتھ لوگوں نے ہمدردی نہ کی تھی۔ مسٹر رانا دے نے اس شکایت سے اپنی نااتفاقی ظاہر کی۔ مسٹر رانا دے کی سوامی جی سے ذاتی واقفیت تھی اور ہمیں نے سنا ہے کہ سوامی جی نے اور شخصوں کے ساتھ مسٹر رانا دے کو بھی اپنے پریس کا جو اجمیر میں ہے منتظم مقرر کیا تھا ✦

اس جلسہ کے بعد اینگلو ویدک کالج میں ایک اور جلسہ ہوا جس میں بابو سریندر ناتھ بنرجی نے مضمون تعلیم پر لیکچر دیا۔ بابو سریندر ناتھ کے بعد مسٹر رانا دے نے سوشل ریفارم کے متعلق ایک خوبصورت تقریر کی۔ یہ تقریر مسٹر چنتامنی کی مشہور کتاب "سوشل ریفارم" میں موجود ہے۔ مسٹر رانا دے کا طرز کلام ایسا اچھا تھا کہ سامعین اُن سے بہت ہی خوش ہوتے تھے۔ ۹۳ء کی کانگرس کا لطف یاد کر کے ۱۹۰۰ء کی کانگرس سے پیشتر سب کی خواہش تھی کہ مسٹر رانا دے لاہور آئیں مگر یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ ۷ جنوری ۱۹۰۱ء کے بعد مسٹر رانا دے رخصت لیکر فرائض منصبی سے سبکدوش ہوئے اور چند دن میں ان کی طبیعت اچھی ہو گئی۔ وہ اپنی بیوی اور بھائی کی ساتھ ہر روز دو تین میل پیدل چل لیتے تھے اور بڑی دیر تک گاڑی میں ہوا خوری کرتے تھے۔ مگر ان کے لئے بیکار بیٹھنا مشکل تھا۔ باوجود ڈاکٹروں کی ممانعت کے انہوں نے اوپ نشدوں، بلنٹ صاحب کی تاریخ مذہب عیسوی اور بجسٹن مکارتھی کی کتاب موسومہ "ہمارے

زمانہ کی تاریخ" کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ کمزور حالت میں دماغی
کام کرنا نامناسب ہے مسٹر راناڈے جواب دیتے تھے کہ اگر کوئی آدمی کام
نہیں کر سکتا تو اس کا زندہ رہنا بیفایدہ ہے۔ اور بیکار زندگی کے مقابلہ میں
موت اچھی ہے ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۰۱ء کو ان کی طبیعت بہت اچھی تھی۔ دن
میں کام کرنے کے بعد وہ شام کو اپنی بیوی اور بھائی کے ساتھ ہوا خوری کو
باہر گئے اور قریباً ایک میل پیدل چلے۔ جب گھر واپس آئے تو ان کو رائے
بہادر کانتی چندر مکرجی دیوان ریاست جے پور کی (جو اُن دنوں میں بہ حیثیت
ممبر کمیشن قحط ناگپور میں کام کر رہے تھے) ناگہانی موت کا تار ملا انہوں نے یہہ
خبر پڑھکر اول نہایت افسوس ظاہر کیا اور پھر کہا کہ کام کرتے ہوئے مرنا بڑی خوش
نصیبی کی بات ہے تعجب ہے کہ اس خواہش کے پورا ہونے میں دو گھنٹے بھی
نہ لگے۔ اس کے بعد انہوں نے ۸ خط لکھوائے۔ جسٹس میکارتھی کی تاریخ کی
ایک فصل پڑھوا کر سنی؛ اور پھر چند شخصوں سے ملاقات کی جو ان سے ایک بدھوا
بواہ کی نسبت مشورہ کرنے آئے تھے۔ بھاٹیہ ذات میں یہ پہلا بدھوا بواہ تھا۔
اس لئے مسٹر راناڈے نے رائے دی کہ اس موقع پر بڑی دھوم دھام کیجائے
اور گورنر بمبئی کی بیوی لیڈی نارتھ کوٹ صاحبہ کو بلا کر اس شادی کی رونق بڑھائی
جائے۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد انہوں نے کھانا کھایا اور چند بھجن سنے
اور پھر قریباً پونے دس بجے وہ سو گئے۔ ۲ گھنٹہ تک سو کر وہ یکایک جاگ
اُٹھے اور کہنے لگے کہ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں یہ تکلیف
ناقابل برداشت ہو گئی اور ان کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلنے لگے کہ
اس تکلیف سے موت بہتر ہے۔ ڈاکٹر سر بھال چندر کو بذریعہ ٹیلیفون اطلاع

دی گئی ان کے بھائی اور ایک اور دوست ڈاکٹر جہانگیرجی کو بلانے گئے۔ مگر جب ڈاکٹر آیا تو اس نے کہا کہ بیمار نزع کی حالت میں ہے کسی علاج سے موت نہیں رک سکتی۔ اس حالت میں بیمار نے اپنا سر اپنی بیوی کے بازو پر رکھکر کہا کہ اب میری موت آگئی ہے۔ پھر اُن کو خون کی ایک قے ہوئی اور ساڑھے دس بجے کے قریب ان کی روح جسم کی قید سے آزاد ہوگئی۔ اور ان کی بیوی۔ بہن سوتیلی ماں اور دو سوتیلے بھائیوں کو ان کی جدائی کا رنج برداشت کرنا پڑا۔ صبح کو مسٹر راناڈے کی موت کی خبر تمام بمبئی میں پھیل گئی۔ جن شخصوں نے مسٹر راناڈے کو اگلی شام سیر کرتے ہوئے دیکھا تھا ان کو اس خبر کی سچائی میں بڑا تامل تھا۔ مگر جب یہ واقع اخباروں میں شایع ہوگیا تو کسی کو شبہ نہ رہا۔ تھوڑی سی دیر میں بیشمار معزز اشخاص افسوس ظاہر کرنے کو مسٹر راناڈے کے مکان پر پہنچ گئے۔ سب سے پہلے سر لارنس جینکنس صاحب چیف جسٹس ہائی کورٹ بمبئی پھولوں کا ہار لیکر حاضر ہوئے اُن کے علاوہ مسٹر جسٹس کرو۔ مسٹر جسٹس چنداورکر جج ہائی کورٹ مشہور پارسی سوداگر مسٹر جے این ٹاٹا۔ مشہور ساہوکار سیٹھ بھون داس منگل داس نتھو بھائی۔ اور بہت سے دوسرے دوست وہاں آگئے۔ صبح کے دس بجے ان کا جنازہ شمشان کی طرف روانہ ہوا۔ مسٹر راناڈے کے جسم پر سفید دوشالہ ڈالا گیا اور پھولوں کا ہار جو سر لارنس جنکنس لائے تھے ان کے گلے میں پہنایا گیا۔ انگریز صاحبوں کو تھوڑی سی دیر کے بعد رخصت کیا گیا اور باقی کل پارٹی بمبان کے ساتھ رہی۔ راستہ میں ایلفنسٹون کالج گرانٹ میڈیکل کالج ولسن کالج اور آرین سوسایٹی کے ہائی سکول سے سینکڑوں طالب علم ساتھ ہو لئے۔

سب کے چہرہ سے رنج ظاہر ہوتا تھا اور ان میں ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ مسٹر راناڈے کا مبارک جنازہ اٹھائے۔ جنازہ کے ساتھ مختلف مذاہب و ملت کے بیشمار آدمی موجود تھے اور ان کی موجودگی سے ثابت ہوتا تھا کہ ہر ایک فرقہ مسٹر راناڈے کی عزت کرتا تھا۔ ۱۲ بجے کے قریب سب لوگ شمشان بھومی میں پہنچے۔ وہاں صندل کی چتا میں مسٹر راناڈے کے جسم کو لٹایا گیا۔ پرانے فیشن کے ہندوؤں نے اور پرارتھنا سماج کے ممبروں نے اپنے اپنے طریقے سے رسوم ادا کئے اور بعد ازاں مسٹر راناڈے کے بھائی نیل کنٹھ راو نے چتا کو آگ لگائی۔

اس موقع پر ڈاکٹر سر بھال چندر کرشن نے ایک پر درد تقریر کی جس میں انہوں نے حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "صاحبان جو رنج میں اسوقت آپکے چہروں پر دیکھتا ہوں۔ اس سے ثابت ہے کہ ہمکو مسٹر راناڈے کی موت کا بڑا افسوس ہے۔ مسٹر راناڈے کی زندگی واقعی نہایت پاکیزہ تھی۔ ان کی علمیت ان کی محنت اور ان کی ذہانت قابل تعریف تھی۔ مگر ان کی طبیعت میں ثابت قدمی اور بیکسیوں سے ہمدردی اس طرح جمع ہوئی تھی کہ ان کی مثال ہمارے ملک میں دکھائی نہیں پڑتی۔ اس میں کلام نہیں کہ ان کی بیوی۔ ماں۔ بہن اور بھائیوں کے رنج کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ ہم سب ان کے رنج میں شریک ہیں۔ مسٹر راناڈے کی موت سے صرف ایک خاص شخص۔ یا خاندان یا ذات ہی کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ ان کی موت سے اس تمام ملک اور زمانہ حال اور مستقبل کو نقصان پہنچا ہے۔ مسٹر راناڈے جیسے مہان آتما شخص ہر زمانہ میں مشکل سے پیدا ہوتے ہیں اور ان کی موت سے اتنی جگہ خالی ہو جاتی ہے کہ اس کا پُر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یعنے کوئی اور شخص اتنا کام نہیں کر سکتا جتنا کہ وہ مہان پرش

کرتے تھے ہم کو اس وقت پرمیشور سے پرارتھنا کرنی چاہیئے کہ وہ مسٹر راناڈے
کی روح کو شانتی دیں۔ ان کی بیوی جس نے کہ ان کی بیماری میں بڑی محبت
سے خدمت کی ان کی بہن جن کو وہ ماں کے برابر سمجھتے تھے اور ان کا غمگین
بھائی سب ہماری ہمدردی کے مستحق ہیں۔ پرماتما ان کو طاقت دیں کہ اس تکلیف
اور رنج کو صبر سے برداشت کر سکیں۔ صاحبان رنج کی وجہ سے میں زیادہ تقریر
نہیں کر سکتا۔ آؤ۔ خاموشی کے ساتھ بڑے ادب سے ہم یہاں سے رخصت
ہوں" جبکہ لاش اچھی طرح سے جل چکی تو آگ کو دودھ سے بجھایا گیا اور
بعد ازاں ان کی بہن کی مرضی کے مطابق ان کی ہڈیاں اور خاک الہ آباد کی تربینی
میں جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی ملتی ہیں ڈالی گئیں +

مسٹر راناڈے کی موت کی خبر سے تمام ہندوستان میں سخت رنج ہوا
اخباروں نے بڑی گریہ وزاری کی۔ پونا کے اخبار مرہٹہ نامی میں جو ماتمی
آرٹیکل شایع ہوا بالکل بے نظیر تھا۔ ان کی بیوی اور بھائی کے پاس ماتم پرسی
اور اظہار غم اور ہمدردی میں قریباً ایک ہزار تار اور خطوط آئے۔ گورنر جنرل
ہند۔ گورنر بمبئی۔ لفٹننٹ گورنر بنگال۔ مہاراجہ گائیکواڑ۔ مہاراجہ ہولکر۔ مہاراجہ
کولہاپور کے علاوہ بیشمار لایق مرد اور عورتوں نے کئی سبھاؤں نے اس موت
پر افسوس ظاہر کیا۔ جا بجا ماتمی جلسے ہوئے۔ لاہور کے بریڈلا ہال میں
بھی ایک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں بابو پرتول چندر چٹرجی جج چیفکورٹ
نے فرمایا کہ سینکڑوں برسوں کے تنزل کے بعد ہندو سوسائٹی میں مسٹر راناڈے
جیسے مہاں پرش کا پیدا ہونا ثابت کرتا ہے کہ گو ہندو قوم عرصہ سے تنزل
کے راستہ پر چل رہی ہے تاہم وہ مردہ نہیں ہوئی۔ گورنر جنرل صاحب نے

اپنا رنج ان الفاظ میں ظاہر فرمایا تھا۔ "مسٹر راناڈے کی موت سے سوسائٹی میں ایک ایسا شخص کم ہوگیا ہے جو نہ صرف اعلےٰ درجہ کا جج ہی تھا بلکہ اپنے ہموطنوں کی اخلاقی اور ذہنی ترقی کے لئے تمام عمر بڑی محنت سے کوشش کرتا رہا تھا"

لارڈ نارتھ کورٹ گورنر بمبئی نے مفصلہ ذیل خط بھیجا۔ "احاطہ بمبئی اور تمام ہندوستان میں لوگ مسٹر راناڈے کو بطور ایک اعلےٰ خیال اور بلند ہمت شخص کے یاد رکھیں گے۔ جس دلیری اور ثابت قدمی سے انہوں نے اصلاح کے کام میں مدد دی اس سے ان کو لوگوں کی نظروں میں خاص رتبہ حاصل تھا۔ ان کی موت سے تمام ملک کا نقصان ہوا ہے۔ اس وجہ سے نہ صرف ان کے رشتہ داروں کو بلکہ بمبئی احاطہ کے سب اشخاص کو بلا لحاظ مذہب و ملت کے ان کی موت پر سخت افسوس ہے"۔

ان کی موت کے متعلق جو گورنمنٹ ریزولیوشن شائع ہوا۔ اس میں درج تھا کہ "گورنر بمبئی کو آنریبل مسٹر جسٹس مہادیو گوبند راناڈے ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ کی موت کی خبر سن کر نہایت افسوس ہوا اور ان کو اس مصیبت میں مسٹر راناڈے کے رشتہ داروں سے کمال ہمدردی ہے۔ ان کی موت سے ملک کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ کیونکہ ان کی علمیت بڑی گہری تھی۔ ان کی رائے بڑی سنجیدہ تھی اور ان کی طبیعت دلیرانہ اور آزاد تھی"۔

ذاتی صفات

مسٹر راناڈے کی طبیعت اور مزاج کی عمدگی کا اندازہ اسی وقت اچھی طرح

ہو سکتا ہے جبکہ ہم دوسرے شخصوں کی شیخی اور بدمزاجی کی تصویر اپنے سامنے رکھ لیں۔ بعض شخص اپنی آمدنی کے غرور میں بعض شخص اپنی لیاقت کے نشہ میں بعض اپنی خیالی ملکی خدمات کے زعم میں اس طرح چلتے پھرتے ہیں۔ اس طرح گفتگو کرتے ہیں کہ گویا جہاں اُن کا پاک وجود نہیں ہے وہاں سورج اور چاند نہیں نکلتے۔ تمام دنیا کو چاہیئے کہ اُن کی رائے میں چون و چرا نہ کرے اور ہمیشہ ان کی تعریف کے گیت گاتی رہے *

اگر یہ صاحب کسی شہر میں وکیل ہیں اور چند وکیلوں سے اُن کی آمدنی زیادہ ہے تو لیاقت اور آمدنی میں وہ کسی کو اپنا ثانی نہیں سمجھتے۔ اور خیال کرتے ہیں کہ خدا نے اپنا تمام نور اُن کی ذات ہی پر برسایا ہے۔ اگر اُن کو سوشل ریفارم سے دلچسپی ہے۔ تو ان کی رائے میں سوائے اُن کے آجتک کوئی سوشل ریفارمر ہی نہیں ہوا۔ اگر وہ کانگرس میں چلے جاتے ہیں تو خود ملک کی خدمت کریں یا نہ کریں۔ سب لیڈروں کو خوشامدی ٹرٹو دل۔ زمانہ ساز اور خود غرض کہکر اپنی طبیعت خوش کر لیتے ہیں کیا مجال کہ کسی دوسرے شخص کی تعریف کوئی اُن کے سامنے کر سکے۔ ان کو تو صرف وہ شخص پسند آتا ہے جو ان کی ہاں میں ہاں ملائے اور اُن کے خیالات کی ذرا بھی تردید نہ کرے۔ یہ صاحب ہمیشہ آزادی آزادی کا شور مچاتے ہیں مگر پسند اُن کو ہی کرتے ہیں جو خاص اُن کے غلام ہوں۔ مذہبی معاملات میں تو ان کی سمجھ میں اختلاف رائے کی مطلق گنجائش نہیں۔ پرماتما اور آتما کے سب مسئلے اُن کی

رائے میں ایسے ہی آسان ہیں جیسے دو اور دو کا چار ہونا صاف اور
آسان ہے ۔ اگر آپ کو نجات حاصل کرنی ہے تو ان کی رائے پر چلو ۔ ورنہ
خدا حافظ ۔ گذشتہ زمانہ میں دھرم کے نام پر خون کی ندیاں اسی خیال کی بدولت
بہی ہیں ۔ اور بجائے اس کے کہ مذہب سے انسان کی روحانی اُمنگیں
سیر ہوں مذہب نے بسا اوقات سوسائٹی میں بدامنی ۔ دشمنی اور
مصیبت پھیلائی ہے ۔ برعکس ان لوگوں کے مسٹر راناڈے کی طبیعت
میں نہ شیخی تھی ۔ نہ غرور تھا اُن کی لیاقت نہایت اعلےٰ درجہ کی تھی ۔ ان
کی آمدنی بھی معقول تھی ۔ مگر کیا مجال کہ وہ اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر
کریں کہ دوسروں کو اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہیں ۔ ہر شخص خواہ چھوٹا ہو
یا بڑا ۔ اُن سے آسانی سے گفتگو کر سکتا تھا ۔ اُن کے مزاج میں سادگی
کوٹ کوٹ کر بھری تھی ۔ اُن کی پوشاک اور چال ڈھال سے ناواقف
آدمی کو کبھی یہ پتہ نہ لگتا تھا کہ وہ کوئی بڑے آدمی ہیں ۔ جب وہ سیر
کرتے جاتے تھے تو راستہ میں ناواقف غریب عورتیں کئی دفعہ اُن سے
اپنا بوجھ سر پر اٹھوا لیتی تھیں ۔ سر سبرامنیا آئر نے جو پہلے وکیل تھے اور
آجکل ہائی کورٹ مدراس کی ججی سے پنشن پر علیحدہ ہوئے ہیں
ایک دفعہ اثنائے تقریر میں فرمایا تھا کہ "ہم عرصہ سے مسٹر راناڈے کی
تعریف سنتے تھے ۔ اور ہمارے دل میں اس بات کی بڑی خواہش تھی
کہ اُس مہاتما کے درشن کریں ۔ جب ہم ۱۸۸۵ء میں کانگرس کے پہلے جلسہ
کیلئے بمبئی کو جا رہے تھے ۔ ہم نے پونا میں ٹھیر کر اپنی دلی آرزو پوری کی
معلوم دیتا تھا کہ ہر ایک شخص بلا روک ٹوک مسٹر راناڈے سے مل سکتا ہے

اُن کے بیٹھنے کا کمرہ اور ان کی پوشاک سادگی کا نمونہ تھے۔ مگر جب ہم نے ان کی کتابوں کی طرف دیکھا اور اُن خیالات پر غور کیا جو وہ وقتاً فوقتاً ہر ملکی معاملہ پر اخباروں اور رسالوں میں ظاہر کرتے تھے اور پھر اُن سبھاؤں۔ کارخانوں اور سکولوں کو یاد کیا جو اُن کے زرخیز دماغ نے پونا میں قایم کئے تھے۔ ہم کو یقین کامل ہو گیا کہ ہم ایک رشی کے پاس بیٹھے ہیں۔"

مسٹر راناڈے کا مزاج بڑا نرم تھا۔ کسی کے ساتھ لڑنے جھگڑنے کا ان کو کبھی خیال تک نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ مسٹر راناڈے سوشل ریفارم کے لئے بڑی کوشش کرتے تھے اور اگرچہ بمقابلہ اور سوشل ریفارمروں کے اُن میں یہ بات عمدہ تھی کہ وہ قدیم شاستروں کے مطابق ریفارم کی تائید کرتے تھے۔ تاہم بہت سے پُرانے خیالات کے اشخاص اُن کے سخت خلاف تھے۔ سنہ ۹۴ء تک جس مکان میں کانگرس کا اجلاس ہوتا تھا اُسی میں کانفرنس کا جلسہ کرنے کی اجازت تھی سنہ ۹۵ء میں کانگرس کا اجلاس پونا میں تھا۔ پونا میں ایک فرقہ سوشل کانفرنس کے سخت خلاف تھا۔ انھوں نے کانگرس والوں کو مجبور کیا کہ کانگرس کے منڈپ میں کانفرنس کرنے کی اجازت نہ دیں۔ اس مخالفت سے تمام ہندوستان میں شور مچ گیا۔ مسٹر راناڈے کے دوستوں نے بھی اپنی سی بہتیری کوشش کی مگر فیصلہ یہ ہوا کہ کانگرس کے مکان میں کانفرنس نہ ہو۔ مسٹر راناڈے

نے اس جدوجہد کا بڑی دلچسپی سے مطالعہ کیا۔ کوئی دوسرا لیڈر
اس مخالفت کے برخلاف ہائے دوہائی مچاتا۔ خدا اور رسول کو اپنی
بے گناہی اور بیکسی کا گواہ بناتا اور مخالفین کو ہر طرح کی گالیاں
دیتا۔ مگر مسٹر رانا ڈے نے یہ طریقہ اختیار نہ کیا۔ جو لیکچر انہوں
نے اُس سال سوشل کانفرنس میں دیا اس میں انہوں نے اس
بات کو تسلیم کیا کہ پونا کے لوگ سوشل کانفرنس کے خلاف ہیں۔ تمام
تقریر میں رنج اور غصہ کا نشان نہ تھا۔ سقراط کی طرح انہوں نے اپنے
دل لبھانیوالی طرز میں سوشل کانفرنس کے طریق عمل کا اظہار کیا اور
فرمایا کہ یہ امر قابل غور ہے کہ اور کسی جگہ سوشل کانفرنس کی وہ مخالفت
نہیں ہوئی۔ جیسی کہ پونا میں۔ پھر انہوں نے بڑی سنجیدگی سے وہ
سبب بیان کئے۔ جن کی وجہ سے پونا کے لوگ سوشل ریفارم کی
مخالفت کرتے تھے۔ ناممکن تھا کہ مسٹر رانا ڈے یہ صلح کل پالیسی اختیار
کریں اور مخالفین اُن کی بزرگی کے قائل ہوں۔

۹۸ — ۱۸۹۶ء میں رونا ختہ ڈاکٹر بھنڈارکر۔ مسٹر گوکھلے اور دیگر دوستوں
کے مدراس کی کانگرس اور کانفرنس میں شامل ہونے کے بعد بمبئی
کی طرف ریل میں واپس آرہے تھے۔ ڈاکٹر بھنڈارکر اور وہ اول
درجہ کی گاڑی میں تھے۔ باقی دوست دوئیم درجہ میں تھے۔ شولاپور
کے سٹیشن پر جبکہ وہ کمرہ ریل سے باہر گئے ہوئے تھے ایک انگریز مسافر
نے آکر ان کا اسباب نیچے اتار دیا اور آپ ان کی جگہ اپنا اسباب
رکھکر بیٹھ گیا۔ جب ان کو اس بات کی خبر ہوئی تو انہوں نے اُس

انگریز سے کچھ گفتگو نہ کی اور خود گاڑی کی دوسری طرف ڈاکٹر بھنڈارکر
کے پاس جا بیٹھے۔ یہ انگریز چھوٹے درجہ کا جوڈیشل افسر تھا۔
جب پونا کے سٹیشن پر پہنچے تو اس انگریز کو معلوم ہو گیا کہ جس
ہندوستانی کے ساتھ اس نے بداخلاقی کی تھی وہ مسٹر راناڈے
جج ہائی کورٹ بمبئی ہیں۔ وہ مسٹر راناڈے سے معافی مانگنے
کے لیئے اُن کی طرف بڑھا مگر انہوں نے اُس کی طرف پیٹھ کر لی
اور اُس کو اپنے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع نہ دیا۔ اگلے دن مسٹر گوکھلے
نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ گورنمنٹ سے اس انگریز کی شکایت
کرینگے۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ "شکایت کرنا فضول ہے۔ میں
ایک بیان دونگا۔ وہ انگریز میرے بیان کے خلاف بیان دیگا۔
علاوہ ازیں یہ ایسا سنگین معاملہ نہیں ہے کہ اس کی بابت جھگڑا
کیا جائے"۔ پھر اُنہوں نے فرمایا کہ "کیا ایسی باتوں میں خود ہمارا
چلن اچھا ہے۔ کیا ہم چھوٹی ذات کے لوگوں سے جو ہمارے
ہم وطن ہیں اب تک بدسلوکی نہیں کرتے۔ آجکل بھی جبکہ اس بات
کی اشد ضرورت ہے کہ ہم سب ملکر کام کریں اونچی ذات کے آدمی
اپنے حقوق چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اور چھوٹی ذاتوں کو نیچے رکھنا
چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں ہم کس مُنہ سے اُن انگریزوں
کی شکایت کر سکتے ہیں جو ہمارے ساتھ نفرت سے پیش آتے
ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انگریزوں کی بدسلوکی سے ہم کو
سخت تکلیف ہوتی ہے اور انگریزی گورنمنٹ کے انصاف

میں ہمارا یقین ڈھیلا ہوتا جاتا ہے لیکن اس تکلیف سے ہم کو یہ فائدہ
اٹھانا چاہیئے کہ اپنے ملک کی ترقی کے لئے محنت اور صدق
دلی سے کوشش کریں"۔

اُن کی بُردباری۔ ملنساری اور فراخ دلی۔

تمام عمر اُن کی یہی عادت رہی کہ وہ کبھی اپنی زبان سے ایسا کلمہ
نہیں نکالتے تھے جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ نہ خود کسی کی
شکایت کرتے تھے نہ اُن کے چہرے سے غصہ ظاہر ہوتا تھا
وہ ہر ایک شخص سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے چاہے اس
کی رائے اُن کے خلاف ہو یا موافق ہو خواہ اُن کو اُس سے
کسی قسم کی تکلیف ہی پہنچی ہو۔ برعکس اس کے ہم بہتیرے تعلیم یافتہ
آدمیوں کو جانتے ہیں جو اپنے مخالفین کی شکل دیکھنا نہیں چاہتے
اُن کی مخالفت اکثر اوقات ذاتی نفع نقصان پر مبنی نہیں ہوتی۔
صرف خیالات کی مخالفت ہوتی ہے۔ تاہم بھی وہ گوارا نہیں
کر سکتے کہ دوسرے کی نسبت کلمہ خیر کہیں۔ مسٹر راناڈے کا
خیال تھا کہ چونکہ بعض اوقات یہ کہنا مشکل ہے کہ کس شخص کی رائے
درست ہے اس لئے یہ مناسب ہے کہ جہاں ملکر کام کرنا ہو وہاں
دوسروں کی رائے کی بھی رعایت کیجائے بشرطیکہ اس رعایت
سے اپنے عقیدے پر حرف نہ آئے۔ اس نرمی کی بدولت وہ
بہت سے ایسے شخصوں کے ساتھ ملکر کام کرتے تھے جن

کی راے اکثر معاملات میں اُن سے بالکل متفق نہ تھی۔ اور ایسے شخصوں کی مدد سے ان کو بہت سی باتوں میں کامیابی بھی ہوئی مگر یہ طریقہ دقتوں سے خالی نہ تھا۔ بعض اوقات یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایسے آدمیوں کے ساتھ ملکر کام کرنے سے مسٹر رانادے اُن کے خیالات کی تائید کرتے ہیں۔ یہ لوگ بدہوا بواہ۔ استری سکشا اور بت پرستی کے مضمون پر مسٹر رانادے کے خلاف تھے اور اس لیئے اُن کے پرارتھنا سماجی دوستوں کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ وہ تنگ دل پرانے فیشن کے آدمیوں کے ساتھ ملتے جُلتے ہیں۔ اُن کے دوستوں کو یہ بھی اعتراض تھا کہ مسٹر راناد اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ ان تنگ دل لوگوں کے خیالات سوشل ریفارم کے متعلق تبدیل کریں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان لوگوں کے خیالات بدلنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ مسٹر رانادے نے شاستروں کے حوالے دیکر ثابت کر دیا کہ ہمارے موجودہ رسم و رواج قدیم زمانہ میں موجود نہ تھے۔ اس لیئے ضروری ہے کہ ہم قدیم زمانہ کے رسم و رواج اختیار کریں۔ جن کا ہمارے پرانے شاستروں میں ذکر ہے۔ یہ پرچار مسٹر رانادے نے ایک دفعہ دو دفعہ نہیں کیا بلکہ تمام عمر وہ اس دلچسپ اور مفید پرچار میں مشغول رہے۔ اس لیئے یہ کہنا بے جا ہے کہ مسٹر رانادے اپنی رفاقت سے اُن لوگوں کے خیالات کی تائید کرتے تھے جو بدہوا بواہ۔ اور استری سکشا کے خلاف تھے۔ بلکہ مسٹر راناد

کی شیریں زبانی کا یہ نتیجہ تھا کہ ہر ایک خیال کا آدمی ان کی تقریر خوشی
سے سنتا تھا اور غالباً ان کی تقریر کا نیک اثر سننے والوں کی
طبیعت پر ضرور ہوتا ہوگا۔ اس لئے یہ مسٹر راناڈے کی دانائی
تھی کہ وہ پرانے خیالات والے آدمیوں کے ساتھ ایسے
معاملات میں ملکر کام کرتے تھے جن میں باہمی اتفاق ممکن تھا۔
مسٹر راناڈے کی دانائی اور طبیعت کی فیاضی رنگ لائے بغیر
کیسے رہ سکتی تھی۔ جو کام پونا میں انہوں نے کیا اس کا پہلے ذکر
ہو چکا ہے۔ یہ کام صرف پرارتھنا سماجی دوستوں کی مدد سے
ہونا مشکل تھا۔ درحقیقت اُن کو کام سے پیار تھا۔ وہ ہر شخص سے
مدد لینے کو تیار رہتے تھے اور ان کو اس بات کی قطعی پرواہ نہ
تھی کہ مدد کرنے والا اُن کا مخالف ہے یا دوست۔ سنہ ۸۲ء میں
لارڈ رپن کی مہربانی سے میونسپل کمیٹیوں میں انتخاب کا قاعدہ جاری
ہوا۔ پونا میں اس بات پر بڑا اختلاف رائے تھا کہ کون کون ممبر
ہو۔ مسٹر راناڈے چاہتے تھے کہ رعایا کے لوگ کمیٹی میں زیادہ
ہوں اُن کے دوست مسٹر کُنٹے چاہتے تھے کہ سرکاری
آدمی زیادہ ہوں۔ مسٹر کُنٹے نے اپنی رائے کی تائید میں
لیکچر دینے شروع کر دیئے اور مسٹر راناڈے کی نسبت سخت
کلامی کی۔ مسٹر راناڈے کو یہ حال معلوم ہو گیا۔ ایک دن جبکہ
مسٹر کُنٹے لیکچر دینے میں مشغول تھے وہ بھی لیکچر سننے چلے گئے
ان کو دیکھکر مسٹر کُنٹے بڑے شرمندہ ہوئے اور انہوں نے

تھوڑی دیر میں اپنی تقریر ختم کردی۔ یہ دیکھکر مسٹر رانا دے نے اُن
سے کہا کہ میں آپ سے ایک ضروری معاملہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں
آپ میری گاڑی میں آجائیے۔ سیر بھی ہوجائے گی اور گفتگو
بھی۔ مسٹر گنتے نے خفا ہوکر کہا کہ میں آپکی گاڑی میں جانا نہیں
چاہتا۔ یہ جواب سُنکر مسٹر رانا دے حیران ہوگئے مگر جب
مسٹر گنتے کی گاڑی چلنے لگی تو وہ خود اُس گاڑی میں جا بیٹھے۔
مجبوراً ان کو مسٹر رانا دے سے گفتگو کرنی پڑی۔ پھر کیا تھا۔ انہوں
نے اپنی غلطی تسلیم کی اور مسٹر رانا دے کے ساتھ اتفاق کرلیا
اور باہمی رنجش اور مخالفت دُور ہوگئی۔ مسٹر رانا دے کا یہ طریق
عمل تمام عمر جاری رہا۔ وہ کسی شخص کو اپنا دشمن نہ سمجھتے تھے۔ اور
جب کبھی اختلاف رائے کی وجہ سے کوئی شخص ان کو بُرا بھلا کہتا
تھا تو وہ فرماتے تھے کہ اگر اس شخص کا خیال غلط ہے تو ضرور
ایسا وقت آئے گا کہ اس کو اپنی غلطی معلوم ہوگی۔ اُس پر خفا ہونے
سے کچھ فائدہ نہیں۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب دو شخص کسی
معاملہ پر بحث کرتے ہیں تو اُن میں سے ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی
ہے کہ دوسرے پر فتح حاصل کرے۔ مسٹر رانا دے ہمیشہ سچ
بات دریافت کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ بحث میں شکست
و فتح کا خیال ان کو نہ ہوتا تھا۔ اس لئے مخالفین بھی اُن سے رنجیدہ
نہ ہوتے تھے۔ جسوقت مسٹر رانا دے کا انتقال ہوا تو سب سے
عمدہ ماتمی آرٹیکل اخبار مرہٹہ میں شائع ہوا۔ یہ اخبار مسٹر تلک کی ملکیت

ہے اور مسٹر راناڈے کی زندگی میں سوشل ریفارم کے متعلق ان کے خیالات سے بڑا اختلاف ظاہر کرتا رہتا تھا۔ مگر مسٹر راناڈے کو اس اختلاف سے کبھی رنج نہیں ہوا۔ مسٹر تلک اور ان کے دوست بھی مسٹر راناڈے کی بزرگی و دانائی اور فراخ دلی کے قائل تھے اس لئے اخبار مرہٹہ نے مذکورہ بالا ماتمی آرٹیکل میں مسٹر راناڈے کی غیر معمولی لیاقت اور دانائی کی بڑے زور سے داد دی اور بیان کیا کہ مسٹر راناڈے جیسے عظیم الشان شخص کسی کسی صدی میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہر روز پیدا نہیں ہوتے۔

یہ بات کہ مسٹر راناڈے کو اپنے مزاج پر بڑا قابو تھا ایک ایسے واقعہ سے ثابت ہوتی ہے کہ جس سے دوسرا آدمی آگ بگولہ ہو جاتا۔ وہ ۱۸۹۹ء کے موسم گرما میں تبدیلی آب وہوا کے لئے مقام پونا والا میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ وہاں ایک مشہور مقدمہ قتل میں جس کا چپیکار نامی تین بھائیوں سے تعلق تھا۔ اُنھوں نے اپنا فیصلہ لکھا۔ پارسن صاحب جج ہائی کورٹ بمبئی کا فیصلہ بھی ان کے پاس تھا۔ انھوں نے اپنا فیصلہ اور جج پارسن کا فیصلہ لفافہ میں بند کر کے ایک لڑکے کو جو ان کی نگرانی میں رہتا تھا اس غرض سے دیا کہ ڈاک میں ڈال دے۔ اُس لڑکے نے شرارت سے یا کسی کے دھوکہ میں آکر وہ لفافہ کسی اور شخص کو دیدیا اور مسٹر راناڈے کو آکر کہدیا کہ لفافہ گم ہو گیا۔ یہ بیان اس کا جھوٹ تھا کیونکہ فیصلہ سنانے سے بیشتر پونا میں مسٹر راناڈے

اور جج پارسن کا فیصلہ سب کو معلوم ہو چکا تھا۔ اس لڑکے کی شرارت کی وجہ سے اُن کو اور جج پارسن کو اپنا فیصلہ دوبارہ لکھنا پڑا اور مسٹر راناڈے اپنے دل میں بڑے شرمندہ اور ناراض ہوئے۔ مگر چونکہ اُس لڑکے کا باپ مرتے وقت اُس کو ان کے سپرد کر گیا تھا اس سبب سے انھوں نے اُس لڑکے کو اپنے گھر سے علیحدہ نہ کیا ❊

جو شخص اپنی شیخی میں رہتا ہے اور دوسروں کے کام کی قدر نہیں کرتا وہ دوسروں کے ساتھ ملکر کام کرنے کے لائق نہیں۔ مگر مسٹر راناڈے کی طبیعت ایسی تھی کہ ہر ایک آدمی اُن کے ساتھ ملکر کام کرنے سے خوش ہوتا تھا۔ اور ان کی ہدایت پر کاربند ہونا اپنا فخر سمجھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مسٹر راناڈے کی نیچر میں انکساری اور شرم ساری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ کبھی اپنی شیخی نہیں بھگارتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ دوسرے شخصوں کو شاباش دیتے تھے۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنے ساتھیوں کو کام کرنے نہ دیں ہمیشہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ دوسرے آدمی کام کرنا سیکھیں اس لئے وہ ہمیشہ اُن کو طرح طرح کے کاموں میں مشغول رکھتے تھے۔ پونا میں جو مختلف علمی اور تجارتی تحریکیں اب جاری ہیں ان کا بیج مسٹر راناڈے نے بویا تھا مگر وہ ہمیشہ دوسرے آدمیوں کو آگے رکھتے تھے اور اُن کی تعریف کرتے تھے ❊

دوسروں سے ہمدردی

جو شخص مصیبت یا تکلیف میں ہوتا تھا اس کے ساتھ ہمدردی
کرنا مسٹر راناڈے اپنا عین فرض سمجھتے تھے۔ شاید ہی کوئی شخص
ہوگا کہ جس نے اُن سے مدد مانگی اور اُس کی انھوں نے مدد نہ
کی۔ اُن کی ملنساری لوگوں میں مشہور تھی اس لئے بے شمار
شخص اپنے دُکھ درد میں اُن سے مشورہ لیتے تھے۔ چھوٹے
چھوٹے درجہ کے آدمی خط لکھکر ان کی راے دریافت کرتے
تھے اور وہ بڑی خوشی سے ہر ایک شخص کو صلاح دیتے تھے
برعکس اُن کے اَور کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ پبلک میں ہمدردی
کا نعرہ بڑے زور سے مارتے ہیں مگر کیا مجال کہ کسی کے ساتھ
عملی ہمدردی کا ثبوت دیں۔ اگر غلطی سے کوئی شخص ان کو خط لکھ
کر کسی معاملہ میں اُن کا مشورہ چاہے تو یہ حضرت خط کا جواب دینا
کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ مسٹر راناڈے کہتے کم تھے مگر کام زیادہ
کرتے تھے اور عملی طور سے اپنی ہمدردی کا ثبوت دیتے تھے۔
وہ غریبوں کے ساتھ ہمیشہ مہربانی سے پیش آتے تھے۔ اور اُن
کو تکلیف میں دیکھکر خود بڑی تکلیف مانتے تھے۔ سنہ ۱۸۹۹ء ۱۹۰۰ء میں
ایک انجنیر جو قحط زدہ لوگوں سے مزدوری کرانے پر معمور تھا
اُن سے ملنے آیا۔ مسٹر راناڈے کی دریافت پر اُس نے کہا کہ
بیشک بہت سے قحط زدہ لوگ بچ جاتے ہیں۔ مگر باوجود احتیاط

سے بعض لوگ بھوک سے بھی مرجاتے ہیں کیونکہ قحط سخت ہے۔ یہ
یہ سُنکر مسٹر راناڈے جو اکثر اپنے مزاج پر قابو رکھتے تھے جوش
میں آکر بولے کہ تمہارے قول کے مطابق چند آدمیوں کا بھوک
سے مرجانا معمولی بات ہے۔ اگر تم مرجاؤ تو کیا ہو۔ کیا تمہارا فرض
نہیں کہ خدا کے بندوں کو موت سے بچاؤ؟

اُن کی فیاضی

مسٹر راناڈے نے اپنی وصیت میں جن کاموں کے لئے روپیہ
دینے کی اجازت دی اُن سے ظاہر ہے کہ اپنی خیرات میں بھی وہ
ویسے ہی فراخ دل تھے جیسے کہ اپنے روزانہ برتاؤ میں۔ فہرست خیرات
ذیل میں درج ہے:۔

کام جس کے لئے روپیہ دیا گیا	تعداد روپیہ
(۱) انڈین جنرل لائیبریری پونا۔	۱۰۰۰ ــــ ۰ ــــ ۰
(۲) پرارتھنا سماج پونا۔	۱۰۰۰ ــــ ۰ ــــ ۰
(۳) لڑکیوں کا ہائی سکول پونا۔	۱۰۰۰ ــــ ۰ ــــ ۰
(۴) سرب جنک سبھا پونا۔	۱۰۰۰ ــــ ۰ ــــ ۰
(۵) گائن سماج پونا۔ برائے ترقی علم موسیقی	۵۰۰ ــــ ۰ ــــ ۰
(۶) ٹاؤن ہال کمیٹی پونا	۵۰۰ ــــ ۰ ــــ ۰
(۷) داؤد ساسوں کا غریب خانہ پونا	۵۰۰ ــــ ۰ ــــ ۰
(۸) دکن کے ورنیکولر میں ترجمہ کرنیوالی سوسائٹی پونا	۱۰۰۰ ــــ ۰ ــــ ۰

(۹) رسٹی کلب پونا۔	۵۰۰ــ۰ــ۰
(۱۰) دکن مرہٹہ ایسوسی ایشن پونا۔	۱۰۰۰ــ۰ــ۰
(۱۱) دکن کی سوسائٹی برائے ترقی تعلیم۔	۱۰۰۰ــ۰ــ۰
(۱۲) پرارتھنا سماج بمبئی۔	۱۰۰۰ــ۰ــ۰
(۱۳) انڈین جنرل لائبریری بمبئی۔	۱۰۰۰ــ۰ــ۰
(۱۴) یتیم خانہ پنڈھار پور۔	۱۰۰۰ــ۰ــ۰
(۱۵) بارامتی گانو کی سوسائٹی برائے ترقی تعلیم۔	۵۰۰ــ۰ــ۰
(۱۶) سول سروس فنڈ۔	۳۰۰۰ــ۰ــ۰
(۱۷) انڈسٹریل ایسوسی ایشن احاطہ بمبئی جس کی غرض یہ تھی کہ طالب علموں کو تعلیم کے لئے جاپان روانہ کرے۔	۲۰۰۰ــ۰ــ۰
(۱۸) ہندو کلب (جم کھانہ) بمبئی	۵۰۰ــ۰ــ۰
(۱۹) یونیورسٹی بمبئی	۳۰۰۰ــ۰ــ۰
(۲۰) غریبوں کے لئے مفت دوائی بمقام پونا۔	۱۰۰ــ۰ــ۰
(۲۱) غریب آدمیوں کے جلانے کیلئے فنڈ۔	۱۰۰ــ۰ــ۰
(۲۲) ٹاٹا انسٹیٹیوٹ سکالرشپ	۳۰۰۰ــ۰ــ۰
(۲۳) کولہاپور کی الریشور نامی خیرات کے خرچ کے لئے۔	۱۰۰۰ــ۰ــ۰
(۲۴) اُسکے منڈپ کے لئے۔	۱۰۰۰ــ۰ــ۰
(۲۵) مسافروں کیلئے دھرم سالہ بمقام کرکی۔	۱۰۰۰ــ۰ــ۰

(۲۶) برہمنوں کو خیرات -	۱۰۰۰ ـــ ۰ ـــ ۰
(۲۷) رقم جو مذکورہ بالا مفید کاموں جیسے اور کام میں خرچ ہوگی -	۱۰۰۰۰ ـــ ۰ ـــ ۰
کل	۴۰۰۰۰

مذکورہ بالا روپیہ کے علاوہ انہوں نے چند اور رقوم غریب طالب علموں کی مدد کے لئے خرچ کرنے کی اجازت دی ہے ۔ مبارک تھے مسٹر رانادے جنہوں نے اپنی وصیت میں ملک کی مختلف ضروریات کو مد نظر رکھا ۔ وہ اپنی زندگی میں بھی بہت سا روپیہ غریبوں اور نیک کاموں کی مدد میں خرچ کرتے تھے مگر ان کی بول چال سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ اُن کو اپنی فیاضی کا کوئی گھمنڈ ہے ۔ حالانکہ اور بہت سے شخص سو دو سو یا ہزار روپیہ خیرات میں دے کر اس طرح چلتے پھرتے ہیں اور بات چیت کرتے ہیں کہ گویا انہوں نے اپنی لاثانی فیاضی سے دنیا کو فتح کر لیا ؂

وسیع مطالعہ

مسٹر رانادے کے زمانہ میں بمبئی یونیورسٹی کے جتنے گریجویٹ تھے اُن میں مسٹر رانادے کا مطالعہ سب سے زیادہ تھا ۔ جب وہ کالج میں دکشنا فیلو تھے انہوں نے تھوڑے عرصہ میں اس قدر کتابیں پڑھیں کہ معمولی آدمی تمام عمر میں نہیں پڑھتے ۔ وہ کچھ عرصہ کالج میں مضمون

تاریخ کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے تھے۔ اُن دنوں میں انہوں نے اُس مضمون کے متعلق جتنی کتابیں کالج کی لائبریری میں تھیں سب پڑھ ڈالیں۔ جو ڈیشل افسروں کو عدالتوں میں کام اتنا کرنا پڑتا ہے کہ قانونی کتابوں کے علاوہ اَور کتابوں کا پڑھنا ان کے لئے مشکل کیا ناممکن ہے۔ مگر یہ بات قریباً ہر شخص کی عادت پر منحصر ہے۔ مسٹر راناڈے کی عادات ایسی باقاعدہ تھیں اور مطالعہ سے وہ ہمیشہ ایسا لطف حاصل کرتے تھے کہ طالب علمی سے لیکر مرتے دم تک ان کو مطالعہ کا شوق رہا۔ لٹریچر۔ تاریخ فلسفہ۔ پالیٹکس اور پولٹیکل ایکانومی کے مضمون پر جو عمدہ کتاب شائع ہوتی تھی اس کو منگا کر خود پڑھتے تھے یا کسی سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ اپنے مطالعہ سے فایدہ حاصل کرنے کا انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جس کتاب کو پڑھتے تھے اس کا خلاصہ بنا لیتے تھے۔ اس طرح ہر ایک کتاب کا مضمون اُن کے دل پر نقش ہو جاتا تھا اور جب ان کو ضرورت ہوتی تھی تو اس خلاصہ کو پڑھ لیتے تھے۔ اُن کا حافظہ بھی بہت اچھا تھا اس لئے جو کچھ وہ پڑھتے تھے اس میں سے بہت حصہ ان کو یاد رہتا تھا۔ کاش کہ ہمارے ہزاروں تعلیم یافتہ بھائی جو گھنٹوں تاش اور شطرنج کھیلتے ہیں یا صبح سے شام تک اخبار اور ناول پڑھتے نہیں تھکتے مسٹر راناڈے کی نیک مثال سے فائدہ اٹھائیں۔ آدھ گھنٹہ یا گھنٹہ بھر تاش یا شطرنج کا کھیلنا اور اخبار یا ناول کا پڑھنا تفریح طبع کے لئے ضروری ہے مگر ہر انسان کو یہ زندگی اعلےٰ کام کے لئے

recreation

دی گئی ہے اور اُس کا فرض ہے کہ اپنی ذمہ واری کو سمجھے اپنی زندگی کے مطلب کو پورا کرنے کی کوشش کرے - اور بے فایدہ کاموں میں وقت ضائع نہ کرے *

اُن کی گفتگو

مسٹر راناڈے کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی تھی وہ طرح طرح کی واقفیت سے پُر اور مذاق سے بھری ہوتی تھی - ان کو قصے کہانی بھی یاد تھے جن کو سُنا کر وہ اپنی گفتگو کے لطف کو دوبالا کر دیتے تھے - ظاہرا وہ کم گو معلوم ہوتے تھے مگر جب چند چیدہ دوستوں میں بیٹھے ہوئے تھے تو ان کی گفتگو قابل سننے کے ہوتی تھی *

فصاحت - جب انہوں نے پبلک میں تقریر کرنے کی عادت شروع کی تو جو بات اُن کو کہنی ہوتی تھی اُس کو لکھکر یاد کر لیتے تھے اور پھر پبلک میں اس کو بیان کرتے تھے - اس طرح آہستہ آہستہ انہوں نے اپنی جھجک دُور کر لی - اور تقریر کی روانی حاصل کی - اگرچہ وہ مسٹر مہتا اور مسٹر تیلنگ جیسے فصیح نہ تھے لیکن ہر مضمون پر جس سے ان کو واقفیت تھی بلا کسی خاص تیاری کے اور تھوڑے ہی عرصہ کی اطلاع پر نہایت موثر تقریر کر سکتے تھے اور سامعین کو اپنی وسیع واقفیت - گوناگون علمیت اور تیز طبیعت کا جوہر دکھاتے تھے - اگر کوئی شخص موجودہ ہندوستان کے اعلے خیال کا اندازہ لگانا چاہے تو اس کو چاہئے کہ مسٹر راناڈے

کی تقریروں کو پڑھے کیونکہ ان کی انگریزی اور مرہٹی زبان کی تقریریں سنجیدگی بیان۔ میانہ روی اور روحانی جوش سے آراستہ ہیں اور نئے اور عمدہ خیالات اُن میں بھرے ہوئے ہیں ؎

اُن کی عقل کا خاصہ۔ بعض لوگوں کی راے میں مسٹر راناڈے کی عقل کا خاصہ یہ تھا کہ وہ اوروں کے خیالات کی بیہودگی آسانی سے ظاہر کر سکتے تھے۔ یہ لوگ مثال میں مسٹر راناڈے کی وہ سپیچ پیش کرتے ہیں جو انہوں نے ۱۸۹۶ء کی سوشل کانفرنس میں بمقام امراؤتی دی تھی۔ اور جس میں انہوں نے ریوائیول اور ریفارم کے مضمون پر بحث کر کے ریوائیول کے حامیوں کی دھجیاں اُڑائی تھیں۔ اس موقع پر مسٹر راناڈے نے چند خراب رسموں کا ذکر کر کے سوال کیا تھا کہ کیا قدیم زمانہ کے حامی ان خراب رسموں کو دوبارہ رائج کرنا چاہتے ہیں۔ یہ رسمیں واقعی ایسی خراب ہیں کہ کوئی شخص ان کی حمایت نہیں کرتا۔ اس سے بعض لوگ نتیجہ نکالتے ہیں کہ مسٹر راناڈے کی طبیعت کا میلان ایسا تھا کہ وہ اوروں کے بیہودہ خیالات کی بیہودگی آسانی سے ظاہر کر سکتے تھے۔ مگر جن شخصوں نے اُن کی تحریروں اور تقریروں پر غور کیا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ مسٹر راناڈے کا سب سے بڑا پرچار یہ تھا کہ ہر ایک انسان اور قوم کو سب پہلوؤں میں ترقی کرنی چاہئے اس لئے وہ نہ صرف دھارمک اور سوشل ترقی کے ہی مددگار تھے

encomnical

بلکہ پولیٹکل صنعتی ۔ تمدنی ترقی کے بھی خیرخواہ اور معاون تھے۔ اُن کا مقولہ تھا کہ ہم کو ظاہر اشکل کی تبدیلی کی ضرورت نہیں بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے خیالات کو جن سے بیرونی تبدیلی ظہور میں آتی ہے درست کریں تاکہ ہماری ترقی پائدار ہو۔ امراؤتی کی اسپیچ سے بھی صاف ثابت ہے کہ وہ نہ صرف سوشل برائیوں کی بیہودگی ظاہر کر سکتے تھے بلکہ جاتی سدھار کے لئے عمدہ اصول بیان کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ کہنا درست نہیں کہ وہ صرف خراب عقیدوں کے توڑنیوالے ہی تھے۔ سچ بات یہ ہے کہ وہ عمدہ خیالات قایم بھی کرتے تھے +

کامیابی میں پکا بھروسہ اور بے حد محنت

جن لوگوں نے مسٹر راناڈے کی تحریر اور تقریر پر غور کیا ہے ان کو معلوم ہے کہ مسٹر راناڈے کی طبیعت میں نا امیدی کا نام نہ تھا۔ وہ ہمیشہ کامیابی کی امید سے بھرے رہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کی نظر بمقابلہ اور لوگوں کے زیادہ وسیع تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر اپنے ملک کا آیندہ زمانہ دیکھ رہے ہیں اور اُن کو اچھی طرح سے وہ راستہ دکھائی دیتا ہے جس پر چلکر ہماری قوم منزل مقصود پر پہنچے گی۔ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم کو قومی زندگی کے سب پہلوؤں میں ترقی کرنی چاہیئے۔ اس عقیدہ کے ساتھ وہ اپنی قوم کی ترقی کے لئے

بڑے صدقِ دل اور محنت سے کوشش کرتے تھے اور اُن کو
اپنی کامیابی کا پختہ یقین تھا اس لئے وہ کبھی آرام نہ کرتے تھے
وہ سبارڈی نیٹ جج - جج عدالت خفیفہ - جج متعلق ایکٹ امداد
اقوام زراعت پیشہ اور جج ہائی کورٹ کے عہدوں پر ممتاز رہے
اور بہت سا وقت ان کا پونا میں گذرا جہاں جوڈیشل کام سخت اور
پیچیدہ تھا تاہم علاوہ اپنے مطالعہ کتب کے وہ ہمیشہ ایسے کاموں میں
جن سے پبلک کا یا کسی شخص کا فایدہ ہو مشغول رہتے تھے۔

پونا میں بیس سال سے زیادہ تک وہ مشہور سرب جنک سبھا
کے روحِ رواں رہے - اُس زمانہ میں سبھا مذکور بڑے زوروں
پر تھی - اس کے عمدہ کام کا زیادہ حصہ انہوں نے خود کیا اور
باقی کام جو اوروں نے کیا وہ بھی ان کے مشورہ سے ہوا -
سبھا کا سہ ماہی رسالہ سترہ سال تک جاری رہا اس میں دو تہائی
آرٹیکل مسٹر رانا وے کی قلم سے نکلے - سوشل ریفارم اور دھارمک
ریفارم میں وہ ہمیشہ کوشش کرتے تھے - سوشل کانفرنس
انہوں نے چند دوستوں کے مشورہ سے جاری کی - مرتے
دم تک اُس کی کامیابی کے لئے جہاں کانگرس ہوتی تھی
وہاں جاتے رہے اور سوشل ریفارم کی سالانہ ترقی کا حال
سنا کر آیندہ سال کے لئے لوگوں کا حوصلہ بڑھاتے رہے
اور اُن کو کام کرنے کا طریقہ بتاتے رہے - دھرم کے
متعلق وہ پرارتھنا سماج بمبئی اور پونا میں ہمیشہ دیاکھیان دیتے

تھے۔ انہوں نے اوروں کے ساتھ ملکر پونا میں انڈسٹریل کانفرنس قایم کی اور لارڈ رے گورنر بمبئی کے عہد میں انڈسٹریل نمائش کھولی۔ پونا میں جو بہت سے تجارتی اور انڈسٹریل تحریکیں موجود ہیں سب اُن کے مشورہ اور مدد سے قایم ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مرہٹوں کی قابل قدر تاریخ لکھی۔ جس سے انہوں نے ہندوستانیوں کی لیاقت پایہ ثبوت کو پہنچا دی۔ ملک میں جتنے لوگ پبلک کام میں مشغول تھے وہ اُن سے خط وکتابت کرتے تھے۔ قریباً ۲۰ خط روزانہ کئی سال تک وہ لکھتے رہے۔ بعض میں ملکی معاملات پر لمبی چوڑی بحث درج ہوتی تھی اور بعض میں لوگوں کو بیچ کی باتوں میں مشورہ دیا جاتا تھا۔ جب کبھی ضرورت ہوتی تھی وہ ملکی مضامین پر پبلک میں لیکچر دیتے تھے۔ اور اخباروں میں آرٹیکل لکھتے تھے یہ حال ان کی حیرت انگیز محنت کا ہے۔ چونکہ وہ خود ایسی محنت کرتے تھے نا امیدی اور یاس ان کے پاس تک نہیں پھٹکتا تھا۔ ان کو یقین کامل تھا کہ اگر ہم دل وجان سے اپنی قوم کی ترقی کے لئے کوشش کریں تو ضرور ہماری قوم خوشحال ہوگی۔ اسیوجہ سے وہ کام کرتے نہ تھکتے تھے۔

مسٹر راناڈے کی زندگی کا پیغام۔ ملک کے لئے کوشش اور قربانی

مسٹر راناڈے کی زندگی کے حالات سب بیان ہو چکے ہیں۔ اب اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ میں اس کتاب کو اُن حوصلہ

بڑھانے والے الفاظ سے ختم کروں جن سے کہ مسٹر گوکھلے نے مسٹر رانا دے کی زندگی کے متعلق بمبئی میں اپنا مشہور لکچر ختم کیا تھا ÷

مسٹر گوکھلے کی رائے میں یہ بات قابل غور ہے کہ مسٹر رانا دے بیسویں صدی کے شروع میں جبکہ بجائے ناامیدی اور پژمردگی کے ہمارے دل حوصلے اور امید سے بھرے ہونے چاہئیں تھے اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ہمارے ملک کے بڑے بڑے خیرخواہان اور محبان وطن اس وقت مایوس ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سب نے ہمت ہار دی۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی موجودہ حالت میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ہم ناامیدی اور مایوسی سے بچ نہیں سکتے۔ ملک کے مختلف حصوں میں قحط اور بے روزگاری کی بدولت ہمارے متوسط اور ادنے درجہ کے لوگوں کی حالت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔ اور جس جدوجہد میں اعلٰے درجہ کے لوگ مشغول ہیں اُس میں بھی اُنہیں کئی امور میں شکست ملتی دکھائی دیتی ہے۔ ایسے وقت میں ہم کو مسٹر رانا دے کی بڑی سخت ضرورت تھی تاکہ وہ اپنی دانائی جوش اور حوصلے سے ہماری گری ہوئی ہمت کو بلند کرتے۔ افسوس ہے کہ ایسے نازک وقت میں اُن کا سایہ ہمارے سر سے اُٹھ گیا اُن کی موت پر تمام ملک نے آنسو بہائے۔ ہندوستان پہ غم کا بادل

چھا گیا۔ اس ماتم میں ہر فرقہ کے لوگ شریک تھے۔ ایسا معلوم دیتا تھا کہ گویا تمام ملک پر رنج اور غم کے بادل چھا گئے۔ مگر صرف اظہار غم سے ہم اپنا فرض ادا نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اس مایوسی، پست ہمتی اور ناامیدی میں جس کا اوپر ذکر ہوا ہے پھنسے رہیں گے تو ہماری نالائقی سے ثابت ہوگا کہ مسٹر راناڈے کی کوشش بالکل بےفائدہ تھی۔ کاش کہ ہم سب اور خصوصاً ہمارے نوجوان اس سبق کو جو مسٹر راناڈے کی زندگی سے حاصل ہوتا ہے پاک اور مبارک سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔ مسٹر راناڈے کی ساری کوشش کا مدعا یہ تھا کہ سب انسان ایک دوسرے کے برابر سمجھے جائیں اور ہر انسان کی بہ حیثیت انسان عزت ہو۔ یہ مدعا ضرور حاصل ہوگا خواہ ہمارے ملک کے حالات کتنے ہی مخالف کیوں نہ ہوں ہماری موجودہ مایوسی بے بنیاد نہیں ہے۔ ہمارے عقیدوں اور ارادوں کو کمزور کرنے کے لئے بعض اوقات کافی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ مگر مسٹر راناڈے کی آرزو کے مطابق اپنے ملک کے لئے کوشش اور قربانی کر کے ہم سب وہ مدعا جو مسٹر راناڈے کو اتنا عزیز تھا ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ ملک کیواسطے کوشش اور قربانی۔ یہ پیغام مسٹر راناڈے کی زندگی کا اُن کے ہم وطنوں کے لئے ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ ملک ہماری کوشش اور قربانی کا مستحق نہیں۔ قدیم زمانہ میں یہاں اعلےٰ درجہ کا علم اور ہنر موجود تھا۔ وہ قدیم

زمانہ ہماری بہترین میراث ہے - اگر ہم اُس ذمہ واری کو اچھی
طرح سے سمجھیں جو اس میراث سے ہم پر لازم آتی ہے اور اگر ہم
مسٹر راناڈے کی طرح کوشش کریں اور زندگی بسر کریں
تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے ملک کا آئندہ زمانہ بھی ویسا ہی
شاندار اور پُر رونق نہ ہو جیسا کہ قدیم زمانہ تھا +